قبولِ اسلام کی انوکھی داستان

امریکی نومسلم پروفیسر جیفرے لینگ کی قبولِ اسلام کی کہانی

سرِ تسلیم خم ہے

جفرے لینگ

مترجم

[illegible] صدق حسین

نوٹ : ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ و معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکا [illegible] ین کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس خامی یا غلطی کو دور کیا جائے۔ شکریہ! (ادارہ)

Marfat.com

"Struggling to Surrender"

قبولِ اسلام کی انوکھی داستان

سرِ تسلیم خم ہے

(امریکی نومسلم پروفیسر جیفر ے لینگ کی قبولِ اسلام کی کہانی)

جیفر ے لینگ

مترجم: ڈاکٹر تصدق حسین

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

www.romailhop.com

Marfat.com

297.57421

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	قبولِ اسلام کی انوکھی داستان (سرِ تسلیم خم ہے)
مصنف	:	جیفرے لینگ
مترجم	:	ڈاکٹر تصدق حسین
کمپوزنگ	:	میٹرکس کمپوزر
تعداد کتب	:	500
موسمِ اشاعت	:	اکتوبر 2009
مطبع	:	فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

Rs: 400.00

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز
اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph:051 - 5551519
اشرف بک ایجنسی ... 051-5531610

معیاری اور خوبصورت کتاب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں: (051-5551519)

Marfat.com

انتساب

جمیلہ، سارہ اور فطین کے نام

اور

مجھے امانہ مطبوعات اور اس کے ادارتی عملے کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے نہ صرف مجھے اپنے مشوروں سے نوازا بلکہ اس کتاب کی اشاعت میں مکمل خلوص نیت سے میری مدد بھی کی۔ میں خاص طور پر برادرم جے ولوبی کا اور برادرم علی آر ابواز کک کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اصل مسودے کی تدوین بھی کی اور اسے ناقدانہ نظر سے پڑھا بھی۔

جیفرے لینگ

......

میں ''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' کو
ڈاکٹر سمیع الدین سیٹھی، ثریا جبیں اور اکبری کے نام معنون کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شیخ سمیع الدین سیٹھی اور ان کی دو بیٹیاں ثریا جبیں اور اکبری ۱۹۲۱ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اسلام لانے سے قبل ڈاکٹر صاحب کا نام ڈاکٹر سوامی داس سیٹھی، ثریا جبیں کا سوشیلا اور اکبری کا شکنتلا تھا۔ آپ کا تعلق کوہاٹ سے تھا اور ۱۹۵۸ء میں ایبٹ آباد میں پولیس کے ڈاکٹر تھے۔ اکبری تو ۱۹۳۰ء میں انتقال کر گئی تھیں جبکہ ڈاکٹر صاحب نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں وفات پائی اور ایبٹ آباد میں مدفون ہیں۔ ثریا جبیں ۱۹۹۱ء میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیٹے شیخ صلاح الدین سابق ٹینس چیمپئن اور بیٹی بیگم بریگیڈیئر محمد نواز (امتیاز نواز) ان دنوں ایبٹ آباد میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر تصدق حسین

Marfat.com

Marfat.com

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
اقبالؔ

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

کچھ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر تصدق حسین	13
دیباچہ جیفرے لینگ	24
پہلا باب......کلمہء شہادت کا ورد زبان ہونا	29
دوسرا باب......قرآن حکیم	58
ابتدائی مشاہدات	62
دلیل و حجت کیلئے ایک چیلنج	62
قرآن کی تشریحات و تفاسیر اور نمایاں خدوخال	67
عہد نامہ ہائے قدیم و جدید کے ساتھ مماثلت	69
قرآن اور سائنس	77
مرکزی نکات غور و فکر	84
قرآنی محاکات	84

Marfat.com

دوبارہ "آیات" کی جانب 86
دلیل وحجت کا کردار 89
ایمان اور استدلال 93
متشابہات اور تمثیلی قصّے 93
شیاطین وجنات 96
زمان ولامکاں 98
حیات انسانی کا مقصد 103
صراط مستقیم 114
اندرونی نکات غوروفکر 119

تیسرا باب......رسول اللہ ﷺ 133
قرآن۔رسالت مآب ﷺ تک رسائی کا ذریعہ 136
مسجد میں 114
حدیث،سنت اور سیرت 147
عہد نامہ جدید اور حدیث 151
توقعات 156
روایات اور مغربی تنقید 163

Marfat.com

حاجت کا سوال	182
سچ کا سوال	196
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟	199
چوتھا باب......اُمّہ	209
سوالات	223
خاندان	226
مختلف تناظر	237
اسلامی مرکز کا رخ	242
قرآن حکیم میں خواتین کا ذکر	245
لڑکا اور لڑکی	251
حقوق و فرائض	257
آغاز اور اختتام	263
جنت کو جانے والے راستے	271
خاوند اور بیوی کے رشتے سے ماوراء	274
عورت کی گواہی	278
لیڈرشپ	282

Marfat.com

عورت کا لباس	285
شعبۂ تعلیم اور غیر مخلوط اجتماعات	293
عورت کی شکایت	300
قانون اور ریاست	302
جہاد	303
ایمان اور قوت	312
ارتداد	319
پانچواں باب......اہل کتاب	334
وحی اور تاریخ : ایک تشریح	334
اہل کتاب	338
مسلم کرسچین مباحثہ	346
اسرائیلی فلسطینی تنازع	354
عزیز و اقارب کے بندھن	372
جدائی کے وقت خیالات	377

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اطاعت و بندگی تک کا کٹھن سفر

ڈاکٹر جیفر ے لینگ ایک امریکی نومسلم ہیں جو رومن کیتھولک تھے اور ۱۸ برس کی عمر میں الحاد سے گزر کر ۱۹۸۲ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے، وہ ان دنوں ایک امریکی یونیورسٹی میں شعبہ ریاضی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ لینگ نے سکول کے زمانے میں ایک خواب دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں ہے جس کے فرش پر ایک سرخ و سفید قالین بچھا ہوا ہے۔ دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس سے روشنی کا سیلاب اُمڈ کر آ رہا ہے لوگ قطاریں بنائے ایڑیوں کے بل بیٹھے ہیں جن میں وہ تیسری قطار میں بیٹھا ہے۔ سب کا رخ کھڑکی کی جانب ہے، ان تینوں صفوں کے آگے ایک بزرگ صورت شخص کھڑا ہے جس نے ایک چغہ پہن رکھا ہے اور اس کے سر پر سرخ ڈیزائن کا سکارف ہے۔ اس نے یہ خواب لکھ لیا تھا۔ پھر یہی خواب اسے وقفوں وقفوں سے دس سال تک دکھائی دیتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اس عجیب و غریب خواب کی تعبیر کے بارے میں تو کم سوچتا البتہ خوش بہت ہوتا تھا کہ ہر بار اس خواب کے بعد بیدار ہونے پر اسے ایک خاص طمانیت اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ اس خواب سے کچھ پہلے یا ذرا سا بعد میں ایک روز لینگ کو مذہبیات کی کلاس سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے ''میرے استاد محترم ایک پکے اور سچے پادری تھے وہ ایک روز ہمیں بتا رہے تھے کہ ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس

Marfat.com

بات پر یقین کرلیں کہ خدا کا وجود ہے۔ انہوں نے اسباب کو بنیاد بنا کر دلائل دیئے، میں نے پادری صاحب کے پیش کردہ نتائج اور دلائل کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ مذاہب ابھی تک اپنے مجادلوں سے دلائل کے ذریعہ برسر پیکار ہیں جب کہ سائنس مکمل حل کی جانب بڑی ثابت قدمی سے بڑھ رہی ہے۔ خدا پر یقین کی سرحدیں جہالت و لاعلمی اور خوف سے ملی ہوئی بھی تو ہوسکتی ہیں۔ میرے ہمنوا طلبہ کی تعداد بڑھتی دیکھ کر پادری صاحب نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو کمرہ جماعت سے نکال دیا تھا۔''

اطاعت و بندگی اور تسلیم و رضا تک کے اس کٹھن سفر کے دوران جیفرے لینگ چونکہ خود الحاد سے گزر چکا تھا اس لئے اسلام قبول کرنے کے بعد وہی ان خیالات کا اظہار کرسکتا تھا:

> ''ایک ملحد اس مایوس محقق کو خوب جانتا ہے جس کی زندگی اس خوشی کے حصول کیلئے ایک بے ثمر کوشش ہے جو ایک فریب نظر سے گزر کر دوسرے فریب نظر تک پہنچتا ہے اور ہر بار کی شکست اور محرومی اس کی پیاس میں اضافہ کرتی جاتی ہے وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا عارضی و دنیاوی زندگی میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ مکمل یقین کے ساتھ اپنے معاملے کے بارے میں دلیل و حجت پیش کرتا اور اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سارے عمل میں اللہ کو چیلنج کرتا ہے، وہ ملحدانہ زبان میں اس کا اعلان کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے اور اس کے پیش نظر جو مقاصد ہیں وہ اعلیٰ و ارفع ہیں۔ وہ دوسروں کو دکھ دینا اور دوسروں سے دکھ اٹھانا جاری رکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی ہی تباہی و بربادی میں بری طرح گھر جاتا ہے۔''

جن دنوں جیفرے لینگ یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا اس کی ملاقات ایک عرب طالب علم محمود قندیل سے ہوئی جس نے اسے بے حد متاثر کیا، استاد شاگرد کا رشتہ بڑھا تو لینگ پورے خاندان سے متعارف ہوا۔ محمود کے ساتھ اس کا بھائی عمر اور بہن رابعہ رہتے تھے، ماں سعودی

Marfat.com

عرب میں تھیں۔اس خاندان نے اسے قرآن پاک کا ایک نسخہ اور اسلام پر چند کتابیں تحفے کے طور پر پیش کیں۔اس کی اس خاندان کے افراد کے ساتھ اس سے قبل اسلام کے بارے میں کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔قرآن پاک کے بارے میں لینگ لکھتا ہے:

''اگر آپ پہلے ہی ہتھیار نہیں ڈال چکے تو آپ اس کے خلاف لڑیں گے یہ براہ راست اور بڑی سختی سے آپ کی ذات پر حملہ آور ہوتا ہے آپ سے مکالمہ کر کے بحث وتمحیص کرتا ہے۔تنقید کرتا ہے اور آپ کی عزت نفس پر ضرب کاری لگاتا ہے اور پھر آپ کو چیلنج کر دیتا ہے۔ شروع ہی سے یہ جنگ کی جو لائن کھینچ دیتا ہے میں اس لائن سے دوسری طرف تھا۔''

وہ سچ ہی تو کہتا ہے اس لئے کہ اس دور کے مسلمان کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ اسے قرآن کی قربت حاصل نہیں۔اس نے اسے اب تک تو ریشمی غلافوں میں لپیٹ رکھا تھا اب اسے ڈرائینگ روم میں رکھی ہوئی اس کی کتابوں میں بطور نمائش جگہ مل گئی ہے۔

قرآن تو بقول حضرت مفتی محمد شفیع مدظلہ خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ''مجھے جشنوں، جوبلیوں سے بچاؤ کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے...... میں تو وہ سینے ڈھونڈتا ہوں جو میری یاد سے منور تھے، وہ زبانیں تلاش کرتا ہوں جو میری تلاوت سے حلاوت پاتی تھیں وہ آنکھیں چاہتا ہوں جو میری تلاوت سے پرنم ہو جایا کرتی تھیں۔''

اور قرآن نے اپنے نزول کی غرض وغایت یوں بیان کی ہے:

''اے رسول ﷺ آپ کی طرف یہ بابرکت کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور ارباب عقل و فراست صحیح نتائج اخذ کر کے عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔''

(۲۹:۳۸)

Marfat.com

مفکر قرآن حضرت اقبال نے فرمایا:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

علامہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے جا رہے تھے، ہندوستان ٹائمز کے نمائندے نے سوال کیا کہ وہ اس کانفرنس میں کیا خاص شے لے کر شریک ہو رہے ہیں۔ اقبال نے جواب دیا: ''میرے پاس اور کچھ نہیں لیکن قرآن ہے میں اس کو پیش کروں گا۔''

جس روز ہم نے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھال لیا، جس روز مسلمان کا یہ ٹوٹا ہوا رشتہ اس کلام ربانی سے دوبارہ جڑ گیا اس روز اس پوری امہ میں ایک انقلاب آ جائے گا، جس انقلاب کے سامنے پھر کوئی عالمی نظام نہیں ٹھہر سکتا کہ یہ انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

لینگ نے قرآن حکیم کی سورت ۹۳ پہلی بار پڑھنے پر ان جذبات کا اظہار کیا:

''قرآن پاک کے صفحات میں میری ملاقات اپنے آپ سے ہوئی اور جو کچھ مجھے اپنے آپ میں نظر آیا میں اس سے خوفزدہ تھا، میری رہنمائی کرتے کرتے مجھے ایک ایسے کونے میں لا کھڑا کر دیا گیا تھا جہاں منتخب کرنے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہو۔''

جیفرے لینگ مشرف بہ اسلام کیسے ہوا اس کا ذکر بہت مختصر طور پر یوں ہے کہ وہ ایک گرجا گھر کے تہ خانے میں واقع ایک کمرہ کی چھوٹی سی ایسی مسجد دیکھنے گیا جس کا انتظام مسلم طلبہ کے ہاتھوں میں تھا اور اس ایک کمرے کا وہ کرایہ دیتے تھے یہاں اس کی ملاقات جن مسلم حضرات سے ہوئی ان میں سے ایک غسان تھے۔ لینگ لکھتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ غسان کو انوکھا عطیہ الٰہی حاصل تھا انہیں ایک الہامی اور وجدانی وصف سے نوازا گیا تھا جو کسی روحانی رہنما کیلئے بہت ضروری ہوتا ہے مجھے آگے چل کر علم ہوا کہ امریکہ میں اور امریکہ سے باہر ان کے پیروکار اور

Marfat.com

معتقدین کا ایک وسیع حلقہ ہے......غسان آپ کے درد کو بڑھا کر آپ کے سامنے رکھ دیتے تھے اور پھر آپ کو اس بات پر مجبور کر دیتے کہ لوتم خود بھی دیکھو۔ یہ ایک غیر معمولی قوت ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اور ہر بڑے مذہبی رہنما کے پاس یہ قوت ضرور ہونی چاہیے۔''

لینگ کے ذہن میں اسلام کے بارے میں جتنے سوال تھے وہ ایک ایک کر کے غسان سے پوچھتا رہا مگر اس کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ البتہ وہ مسجد میں بیٹھے بیٹھے ایک ایسی کیفیت سے گزر رہا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ اس کا اندازہ آپ ہم لینگ کی اس آرزو سے لگا سکتے ہیں جس کا اظہار وہ ''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' میں یوں کرتا ہے۔

''مجھے کس قدرت شدت سے یہ آرزو ہوئی کہ ہم دونوں جگہیں بدل لیں میں ان کی (غسان) کی جگہ لے لوں وہ میری خواہ ایسا چند لمحوں کیلئے ہی کیوں نہ ہوتا کہ میں اس خواہش، اس جذبے، اس کرب، اس اضطراب و بے چینی، اس تڑپ سے روشناس ہوسکوں جو اپنے مالک وخالق، اپنے اللہ کی تمنا کیلئے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ میں اس طمانیت اور کرب، اعتماد و یقین اور ڈر سے واقف ہونا چاہتا تھا جو اس بے وقعتی اور حقیر وفقیر ہونے میں پوشیدہ تھی جہاں انسان کی ایک ہی آرزو رہ جائے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اطاعت خداوندی قبول کر لے۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں اس روحانی موت سے حیات نو پا سکوں، دوبارہ جی اُٹھوں۔''

لینگ اب واپس جانے کیلئے تیار تھا کیونکہ جو سوال اس نے غسان سے کئے تھے ان کے جوابات سے اس کی تسلی و تشفی نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران ایک اور صاحب مسجد میں داخل ہوئے جن کا نام مصطفیٰ تھا اور جن سے مل کر لینگ نے محسوس کیا کہ وہ اب خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹے گا۔ شخصیت اس قدر مسحور کن کہ اس کے سحر سے نکلنا مشکل بلکہ ناممکن اور اس کے ہر سوال کا جواب ایسا کہ دل میں اترتا جائے۔ لینگ کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو چکا تھا نماز کیلئے

Marfat.com

حاضرین صف آراء ہوئے تو سامنے دیوار میں ایک کھڑکی نظر آئی یہ وہی کھڑکی تھی جسے وہ خواب میں دیکھا کرتا تھا، وہ تیسری صف میں بیٹھا تھا اور اس کی حیرت میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب سامنے آ کر کھڑے ہونے والے امام صاحب اسی حلیے اور لباس میں تھے جو وہ مسلسل دس سال تک خواب میں دیکھتا رہا تھا۔ لینگ لکھتا ہے کہ ایک مسلم طالب علم لیڈر نے اسے بڑے غور و خوض کے بعد بتایا تھا کہ اس کیلئے مسلمان ہونے کے کیا معنی تھے اور لینگ کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ بھی یہی کچھ بتا سکے۔ ''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' میں جدید سائنسی دریافتوں کا قرآنی حوالوں سے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، مسلم مصنفین اور مستشرقین کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ مسلم مذہبی سکالر اس موضوع کے بارے میں زیادہ محتاط رویہ رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کا سائنسی علم بہت کم ہوتا ہے۔ قرآن تو ہمیں غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ یہ خدا کے احسان اور حکمت و دانائی کی جانب اشارے کرتے ہیں۔ قرآن میں موجود شہد کی مکھیوں کا ذکر پڑھئے اور پھر موجودہ سائنسی بیان سے اس کا تقابلی جائزہ کیجئے۔ یوں لگے گا کہ جیسے قرآن اور سائنس میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔ چند آیات قرآنی نہایت جدید دریافتوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ کہکشاں کی طیف بینی کا مطالعہ کرتے ہوئے سائنسدان حال ہی میں اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے۔

> ''اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے، بلکہ اس میں مسلسل توسیع کر رہے ہیں۔'' (۵۱:۴۷)

سائنس دانوں کے علم کے مطابق یہ کائنات ابتداء میں ایک واحد مادے کا ڈھیر تھی، جس کی لامتناہی کثافت بعد میں ایک شدید دھماکے (بگ بینگ) سے ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی اور قرآن چودہ سو سال پہلے اس موضوع کو یوں بیان کرتا ہے۔

> ''کیا ان کافروں کو معلوم نہیں ہوا کہ آسمان و زمین بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے۔'' (۲۱:۳۰)

ہواؤں کی بار آوری کے بارے میں قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

وارسلنا الریح لواقح فانزلنا من السماء ماًّ فاسقینکموہ
وماانتم لہ بخزنین (۱۵:۲۲)

ترجمہ: ''ہم نے بار آور کرنے والی ہوائیں بھیجیں۔''

علم نباتات کے ماہرین جانتے ہیں کہ کس طرح ہواؤں کے ذریعے درختوں کے زردانے (Pollens) مادہ درختوں تک پہنچتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں اللہ کے اس احسان کی جانب اشارہ ہے کہ ہوائیں کس طرح پھلوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہیں۔ قرآن پاک کا بیان کردہ قانون زوجیت (ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا)۔ اب جا کر سائنس نے ثابت کیا۔ قرآن و حدیث کے علم کے ساتھ ساتھ سائنس کے مختلف علوم کا جاننا اس دور میں مذہبی سکالرز کے لئے بالخصوص بہت ضروری ہو گیا ہے اور یوں ہمارے دینی مدرسوں کے نصاب میں ان جدید سائنسی علوم کو شامل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے، صرف درس نظامی کے مروجہ نصاب یا اس کے ساتھ ساتھ بی اے، ایم اے کرا دینے سے ان مدارس کا فارغ التحصیل طالب علم اس علم سے آراستہ نہیں ہو سکتا جس کی مدد سے اسے اشاعت دین کے سلسلے میں اپنے وطن اور وطن سے باہر ان لوگوں سے واسطہ ہے جنہیں اب سائنس کے حوالے سے اسلام کی دعوت آسانی سے دی جا سکتی ہے۔

آج چودہ سو سال بعد جوں جوں سائنس قرآنی حقائق کی تصدیق کرتی چلی جائے گی اسلام کو اسی قدر تقویت ملے گی اور اس بات سے ہمارا یقین اور پختہ ہوتا جاتا ہے کہ اکیسویں صدی بالخصوص یورپ اور امریکہ کیلئے اسلام کے فروغ کی اشاعت کی صدی ہوگی۔

''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' کے دوسرے باب ''زمان و لامکاں'' میں شامل ساری گفتگو بے حد فلسفیانہ، عالمانہ اور ادیبانہ رنگ لئے ہوئے ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ لینگ کو اللہ نے ذہن رسا عطا کیا ہے یہاں وہ ایک ریاضی دان بلکہ اس منفرد ریاضی دان کے طور پر سامنے آیا ہے جو اپنے مضمون کے حوالے سے زمان و لامکاں کی نازک گتھیوں کو سلجھا رہا ہو۔ وہ ایک

ایک نقطے کی وضاحت جس وثوق سے کرتا ہے اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے ذہن میں اس موضوع کے حوالے سے ہر بات صاف اور واضح ہے، وہ کسی ابہام اور شک وشبے کا شکار نہیں۔ ان ہی سطور میں آگے چل کر وہ مسئلہ تقدیر پر نہایت مدلل اور دلنشین انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ اپنی بات میں مزید استدلال پیدا کرنے کیلئے وہ قرآن وحدیث، مسلم سکالرز اور مستشرقین کے جا بجا حوالے پیش کرتا ہے جس سے اس کے وسیع مطالعہ کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ یہ سوال بھی اٹھاتا ہے کہ قرآن اس دنیا میں جس نظام کے برپا ہونے کی خبر دیتا ہے جس جنتی زندگی کا آغاز ہونا چاہئے وہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس فکر مندی میں پوری امت مسلمہ کو لینگ کے ساتھ شامل ہونے کی ضرورت ہے۔

''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' بظاہر تو جیفرے لینگ کے مشرف بہ اسلام ہونے کی کہانی ہے لیکن مصنف نے اسلامی طرز حیات سے متعلق بہت سی اہم باتوں پر قرآن وحدیث کے حوالے سے بے حد مفید بحث کی ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ فرمایئے: پردہ، خواتین کا لباس، جہاد، مخلوط اجتماعات، ارتداد، قرآن اور سائنس، زمان و لامکاں، مقصد حیات، عزیز واقارب کے بندھن، صراط مستقیم، قرآن اور عہد نامہ جدید وقدیم کا تقابلی جائزہ، احادیث اور مغربی تنقید، عورت کی گواہی کا مسئلہ۔ اسلام میں عورت کی حکمرانی کا تصور، اہل کتاب، مسلم کرسچین مباحثہ، اسرائیلی فلسطین مسئلہ۔ لینگ نے اس کتاب میں دو مباحثوں کی تفصیل دی ہے جن کے موضوعات تھے: ''عیسیٰؑ: خدا یا انسان؟'' اور ''اللہ کا کلام بائبل ہے یا قرآن؟'' وہ اسرائیلی ریاست کے قیام کا تمام پس منظر اور یہودیوں کی سب چالوں کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے، امریکہ نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا اس نے بلاخوف وخطر اسے بھی شامل بحث کیا ہے۔

لینگ نے ۱۹۸۲ء میں اسلام قبول کیا اور ''قبولِ اسلام کی انوکھی داستان'' (سٹرگلنگ ٹو سرینڈر)، ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی، یوں بارہ برس کے عرصے میں اپنے وسیع مطالعہ اور اسلام کی اس روح تک پہنچنے کیلئے جو قرآن وحدیث کے ذریعے حاصل ہوتی ہے لینگ اپنے طویل اور کٹھن سفر کے دوسرے حصے (اسلام لانے کے بعد) کی اس منزل تک بڑی کامیابی کے ساتھ پہنچتا ہے جہاں تک ایک عام مسلمان جس کے آباؤ اجداد مسلمان ہوں اتنی جلدی بمشکل پہنچ پاتا ہے۔ وہ بہت سی باتوں

Marfat.com

میں عملی نمونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کی رہنمائی بھی کرسکتا ہے اس کا اندازہ ہمیں اس واقعہ سے ہوجاتا ہے۔

سان فرانسسکو میں ایک طالب علم نے جب نماز کے دوران ساتھ ساتھ کھڑا ہونے کے بارے میں اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس طرح یکسوئی حاصل نہیں ہوتی تو لینگ اس سے یوں مخاطب ہوا۔

''دراصل اسلام کے بنیادی اور اساسی دستور اور فرمان الٰہی پر سے پردہ اس طرح اٹھتا ہے کہ اس وقت جب تم عبادت خداوندی میں منہمک ہو تم نے اپنے دائیں بائیں کے بھائی کو فراموش نہیں کرنا گویا دوسرے لفظوں میں تمہاری ذاتی اور روحانی فلاح و بہبود اور نجات اس عمل سے یوں باہم پیوست ہے کہ اسے تم نہ اس لمحے نہ کسی اور وقت جدا کرسکو اور وہ عمل یہ ہے کہ تم دوسرے انسانوں کی بھلائی کیلئے کیا کرتے ہو۔ جیفرے لینگ کی اس کتاب میں شامل یہ وہ باتیں ہیں جو ایک نومسلم کی بصیرت افروز کہانی سن کر قاری کو اسلام کی اصل روح تک پہنچنے پر اُکساتی ہیں۔''

''سر تسلیم خم ہے'' کا اختتام لینگ کے ایک عزیز دوست گرانٹ کے ذکر پر مشتمل ہے جس نے کئی مذاہب بدلے، جسے اسلام سے تو کوئی شکایت نہ تھی مگر مسلمانوں کے بارے میں وہ ایک مشہور مسلم ادیب کی یہ رائے دہرایا کرتا تھا۔

''اسلام بہترین مذہب ہے مگر اس کے ماننے والے بدترین لوگ ہیں۔''

گرانٹ کیلئے مذہبی برادری کم از کم اتنی ہی اہم تھی جتنی کہ کسی مذہب کی آئیڈیالوجی۔ وہ اس قدر شدت جذبات اور احساسات کے ساتھ اس دین کے بارے میں جس میں وہ شامل ہوچکا تھا اس لئے جذباتی انداز میں اظہار کیا کرتا تھا کیونکہ اسے ایک خاص عشق کے ساتھ اللہ

کی تلاش و جستجو تھی۔ گرانٹ کی یہی بات لینگ کو بے حد پسند تھی جس کی وجہ سے دونوں دوستوں کو ایک دوسرے سے بے حد محبت تھی۔ قارئین جانتے ہیں کہ اس سے پہلے بوکائی کی ''دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس'' بے حد مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ جس کا ترجمہ فرانسیسی سے انگریزی میں، پھر اردو اور دیگر کئی زبانوں میں ہوا۔ ان دنوں سنا ہے فرانس نے اس کتاب پر پابندی عائد کر دی ہے۔ میں ''سٹرگلنگ ٹو سرینڈر'' کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب امریکی نومسلموں کیلئے وہاں کے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کیلئے یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے ان لوگوں کیلئے جو اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، بے حد مفید ثابت ہوگی اور اردو میں ترجمہ کے بعد ''سر تسلیم خم ہے'' پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور دنیا کے کونے کونے میں جہاں بھی اردو خواں طبقہ موجود ہے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی طلب و جستجو رہے گی۔

اس کتاب کے بارے میں ایک بات کا اور ذکر بہت ضروری ہے۔ وہ ہے اس کا اسلوب۔ اس میں کئی خوبصورت اسلوب باہم مل گئے ہیں جنہیں دیکھ کر جیفرے لینگ کو خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ استاد ریاضی کا ہے مگر ایک کہنہ مشق ادیب کی سی مہارت کے ساتھ اس نے ہر عنوان میں شامل مواد کے عین مطابق ایک مختلف اسلوب اپنایا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اردو ترجمے میں بفضلِ تعالیٰ اسلوب کی اس بوقلمونی کو قائم رکھا ہے۔

مجھ پر کچھ احباب کے شکریے کا قرض بھی ہے، جس کی ادائیگی بہت ضروری ہے۔ ان میں سرفہرست برادرم نوید ظفر ہیں، جنہوں نے مجھے ''سٹرگلنگ ٹو سرینڈر'' مطالعہ کیلئے پیش کی اور پھر اس کے اردو ترجمے کی اہمیت و افادیت سے مجھے آگاہ کیا۔ دوران ترجمہ برادران محترم و مکرم ڈاکٹر محمود الرحمٰن، بشیر محمود، ڈاکٹر اظہر حمید، پروفیسر عبدالرحمٰن عبد، اسلام نشتر، اعجاز احمد فاروقی، محمد عطاء اللہ خان، شکیل عثمانی اور مقتدرہ قومی زبان کتب خانے کے محمد سعید اور شعبہ مطبوعات کے حاجی غلام مہدی نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں مجی برادرم اسلم کمال اور عزیز محترم شامی کو کیسے فراموش کرسکتا ہوں جنہوں نے بالترتیب ''سر تسلیم ختم ہے'' کا سرورق اور جیفرے لینگ کا

۸۹۶۹۹

پنسل سکیچ بناتے وقت انتہائی خلوص و محبت کا اظہار فرمایا۔ میں ان سب حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ میری اہلیہ اور بچوں میں ڈاکٹر قرۃ العین اکرم، فوزیہ عالم اور محمد زبیر راجا نے اس تخلیقی کام سے کہیں مشکل ترجمے کے کام کے دوران میرے آرام کا پورا خیال رکھا جس کیلئے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ کینیڈا سے میرے بیٹے ذوالفقار حیدر راجا، بہو اور پوتا دانیال حیدر راجا اور پوتی امل حیدر بھی اس کام کو جلد مکمل کرنے کی فرمائش کرتے رہے۔ اللہ ان سب پر اپنا کرم فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر تصدق حسین

اسلام آباد (پاکستان)

۳۔ فروری ۱۹۹۶ء بمطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۱۶ ہجری۔

رابطہ فون نمبر ۵۵۲۱۹۳۵۔۰۳۳۳

Marfat.com

دیباچہ

ان کی خوبصورتی کا ہر نقش شمالی یورپ کے لوگوں میں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ وہی خوبصورت گول چہرے، سفید رنگت، لمبے گھنے سنہری اور بھورے بال، لیکن ان کی آنکھیں بھوری نہیں ہوتیں۔ روشن اور چمکدار گہری بھوری، سیاہی مائل آنکھیں۔ ایسی آنکھیں آپ کو بازار یا عرب کے کسی گاؤں کی گلی میں نظر آئیں گی۔ اس قسم کی آنکھیں آپ کے آر پار ہو جاتی ہیں اور پھر ایک طویل عرصے تک آپ کی یادوں میں محفوظ رہتی ہیں۔ مجھ سے سوال کرنے والے دو افراد میں سے ایک نے پوچھا:

''آپ مسلمان کیوں ہوئے؟'' ان کی معصومیت کیسا جواب سننے کی منتظر ہوسکتی تھی؟ ہر طرح کے جذبات سے ہٹ کر ان دونوں نے مجھ پر اپنی نظریں گاڑھ رکھی تھیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ جواب سننے کے لئے طویل انتظار بھی کر سکتے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ سوال اس نیت سے نہ کیا ہو کہ وہ واقعی یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں مسلمان کیوں ہوا بلکہ محض خود احتسابی کی ابتداء کی خاطر ایسا کیا ہو۔ نہیں میرے خیال میں ان کا سوال اس سے بھی زیادہ ذاتی نوعیت کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھی اپنے ابا سے جب یہ سوال کیا تھا کہ وہ کیتھولک کیوں ہوئے تھے تو اس میں محض تجسس شامل نہیں تھا بلکہ اس کی تشریح وتصریح کیلئے یہ میری اپنی جستجو کا نتیجہ تھا۔ جب میں مسلمان ہوا تو میں نے یہ نہ سوچا تھا کہ میں کس کس شے کا انتخاب کر رہا تھا، صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی تین بیٹیوں کیلئے، ان کے بچوں کیلئے اور ان سب کی آنے والی نسل کیلئے۔ بیشک

Marfat.com

انہیں یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا، اس لئے کہ یہ فیصلہ ان کیلئے بھی تھا اور انہیں زندگی کے بقیہ دنوں میں اس فیصلے کے مطابق زندگی گزارنی تھی۔

پیغمبر اسلام، حضرت محمد ﷺ نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کے بارے میں فرمایا تھا: ''فاطمہؓ میری ذات کا ایک حصہ ہے اور میں اس کی ذات کا۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کا دکھ میرا دکھ ہے۔'' ایک باپ کا اپنی بیٹیوں سے جو رشتہ ہوتا ہے اس میں وہ ایک خاص قسم کی تکمیل محسوس کرتا ہے۔ ان کی نسوانی فطرت کے ذریعے وہ اپنی صنف کی تمام حدود سے آگے پہنچ جاتا ہے اور اپنی عام زندگی سے کہیں زیادہ جذبات پدری کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے یہ بیٹیاں اس کی کسی کمی کو پورا کرتیں اور اسے اعتدال میں رکھتی ہیں، صنف نازک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس شخص کی اولاد کی حیثیت سے، اس لئے کہ ان کی شخصیت میں یہ شخص اپنی تکمیل دیکھتا ہے یہ میری تکمیلی آواز ہے جس کی سچائی اب بھی بے داغ ہے اور یہی آواز مجھ پر جرح کر رہی ہے۔ میں جس قدر مختصر اور احسن طریقے سے انہیں بتا سکتا تھا میں نے بتایا۔ تاہم میں نے کوئی حتمی جواب دینے سے اس لئے گریز کیا کہ میں اس معاملے کو مزید سوال و جواب کیلئے کھلا رکھنا چاہتا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کی تحریک مجھے ان کے سوال سے ملی جو اس سوال پر ہر شب مجھے غور و فکر کرنے پر اکساتی رہی۔

اگر آپ اپنی بیٹیوں کے ساتھ دیانتدارانہ اور مخلصانہ رویہ نہیں رکھتے تو آپ اپنے ساتھ مخلص نہیں۔ اس وجہ سے میں نے پوری کوشش کی کہ میں پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اس کا ذکر کروں۔ وہ جو ہم کہتے ہیں کہ ''جو کچھ جیسا ہے ویسا بتایا جائے'' بس ایسی ہی بات تھی۔

اس کے معنی یہ تھے کہ اس میں نمایاں اور غیر نمایاں باتیں شامل ہوں، حاصل تلاش و جستجو کا ذکر بھی ہو اور شک و شبہات کا بھی، سوالات بھی ہوں اور ان کے جوابات بھی۔ یوں میری یہ کتاب کسی طور پر بھی امریکہ میں اسلام پر شائع ہونے والی کوئی مستند تصنیف نہیں ٹھہرتی۔ میری بچیاں جانتی ہیں کہ ان کا باپ کوئی مسلم سکالر نہیں اور مسلم سکالر بھی ایسا ہی تصور کریں گے، یہ بات میں نے دین سے متعلق کم علم رکھنے والوں کو خبردار کرنے کیلئے کہی ہے۔ وہ لوگ جو امریکہ میں ان دنوں اسلام کے بڑے دھارے کے بارے میں سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں ان کیلئے میرا مشورہ ہے کہ وہ جمال بدوی کی بہترین اور مفید ''اسلامک ٹیچنگ سیریز'' کا مطالعہ کریں۔ میں

Marfat.com

نے اس کتاب میں اسلام کے حوالے سے اپنے تجربے یا ردعمل کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک قسم کی ڈائری یا ذاتی روزنامچہ ہے جو ایک خاص قسم کے سامعین وقارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ میں چونکہ ہر ذاتی سوال یا خیال شامل نہ کرسکا اس لئے میں نے اپنے آپ کو ان موضوعات تک محدود کردیا ہے جو نومسلموں کی دلچسپی کا باعث بن سکتے تھے اور جن پر امریکی مسلم اخبارات ورسائل میں اظہار خیال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے نومسلموں کے ساتھ اپنی ذاتی گفت وشنید کو بھی اہمیت دی ہے۔ ان میں سے چند ایک کے ساتھ وابستہ یادیں آپ کو پوری کتاب میں نظر آئیں گی۔ چند ایک موضوعات ایسے تھے (مثلاً قرآنی اور سائنسی علامات) جو میل جول کے ذریعے میری دلچسپی کا باعث بنے جبکہ دوسرے (مثلاً رحمت خداوندی اور عدل و انصاف) روحانیت کی تلاش وجستجو کیلئے میرے اندر پیدائشی طور پر موجود تھے۔

اس کتاب کے پہلے دو ابواب قبول اسلام کی تفصیل پر مبنی ہیں جبکہ آخری تین ابواب جو اس کتاب کے زیادہ حصے پر مشتمل ہیں دراصل اسی موضوع کا تتمہ ہیں۔

ان میں ان مشکلات کا ذکر ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے پیش آئیں اور اس جدوجہد کا ذکر بھی ہے جو مسلم برادری میں رہ کر زندگی گزارنے کیلئے مجھے کرنی پڑی۔ پہلا باب میرے اسلام لانے کے فیصلے کو نمایاں کرتا ہے اور دوسرے باب میں قرآن حکیم نے جو کردار ادا کیا اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ میں نے ان کی تشریح وتصریح کی پوری پوری کوشش کی ہے مگر پھر بھی ان کا زیادہ حصہ میرے لئے آج بھی پردہ راز میں ہے اور ایک معرفت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک امریکی نومسلم اکثر اسلام لانے سے قبل یا تو عیسائی ہوتا ہے یا یہودی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس مرد یا عورت نے ایک پیغمبرانہ روایت کو رد کردیا ہے اور یوں ایک تاریخی روایت کو رد کرتے ہوئے اس سے قریب تر روایت کو قبول کرلیا ہے۔ اس میں چونکہ سابقہ مذہبی روایت کے خلاف بغاوت پائی جاتی ہے اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہونی چاہئے کہ نومسلم اکثر اسلامی روایت کے بارے میں متشکک ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی احادیث کی طرف آتے ہیں۔ روایت، مسلم علم وفضل، مقبول عام احساسات، تاریخ اور مغربی تنقید آپس میں ٹکرا کر ایک ایسی الجھن کو جنم دیتے ہیں جس کے ساتھ

Marfat.com

مفاہمت ممکن نہ رہے۔ یہی تیسرے باب کا موضوع ہے۔ امریکہ میں مسلمانوں کے اجتماعات میں مختلف تہذیب وتمدن، اور رسم ورواج کے حامل لوگ شامل ہوتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر کی بنیاد مذہبی ہوتی ہے۔ اکثریت کا تعلق روایتی اور زیادہ قدامت پسند معاشروں سے ہوتا ہے۔ یہاں آمد کے بعد انہیں ایک دھچکا سا لگتا ہے کہ ان کے سامنے تمام تارکین وطن موجود ہیں اور یہ انہیں حیران و پریشان اور خوفزدہ کر دیتا ہے۔ ایک نومسلم کو یہ تکلیف بھی پہنچتی ہے کہ وہ مرد یا عورت مسلم مذہبی برادری میں ایک اجنبی اور غیر مانوس حیثیت میں ایک اقلیتی فرد کے طور پر کھڑا ہے۔ اسلام قبول کرنے کا یہ پہلو چوتھے باب میں زیر بحث آیا ہے، جہاں مرد اور عورت کے تبدیل ہونے والے رول پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ آخری باب میں ان چند مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک غیر مسلم خاندان یا معاشرے میں کسی مسلمان کو پیش آتی ہیں۔

میں کچھ وقت تک اس کشمکش میں مبتلا رہا کہ کیا مجھے یہ کتاب شائع کرانی چاہئے۔ یہ جھجک کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے نہ تھی کہ اس کی اشاعت سے کوئی اختلافی یا نزاعی صورت پیدا ہوسکتی تھی بلکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ یہ ایک خالصتاً ذاتی نوعیت کا معاملہ تھا۔ بلا شبہ یہ اسلام کی ایک بہت ہی امریکی تشریح ہے اور اس کے برعکس ہو بھی کیوں کرسکتی تھی۔ میں اپنی زندگی کے پہلے اٹھائیس برسوں سے اپنے آپ کو جدا کیسے کرسکتا ہوں اور اس کی مجھ سے توقع بھی نہیں کی جانی چاہئے۔ میں ایک ایسی حکمت عملی کی پیروی جاری رکھے ہوئے ہوں جو اس زمانے کی ہے جب میں منکر خدا اور ملحد تھا۔ میں وہ سارا کچھ پڑھتا ہوں جو ایک مذہب کے بارے میں مذہب کے اندر اور باہر کے سکالر لکھتے ہیں۔ مذہب کے اندر رہنے والے اکثر نازک اور حساس سوالات کو یا تو نظر انداز کر جاتے ہیں یا پس پشت ڈال دیتے ہیں جبکہ باہر والے اپنے اپنے تعصبات کے اسیر ہوتے ہیں۔ محتاط تقابل کے ذریعے میں امید کرتا ہوں کہ ان دو رویوں کی تلافی کرسکوں گا۔ میں اسلام کو سمجھنے میں غیر مسلم سکالروں سے متاثر ہوا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اپنے مسلمان بھائیوں کی حوصلہ افزائی ملی جس نے بالآخر مجھے یہ کتاب شائع کرانے کا فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ مجھے اپنی ہی ایک رائے یاد آ گئی کہ امریکی مسلمانوں کو ان دنوں جو بہت سے سوالات اور مسائل درپیش ہیں ان کی تحقیق اور چھان بین بڑے صبر و تحمل سے کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ پوری امت مسلمہ کا اتحاد خطرے میں ہے۔ امریکہ میں اشاعت و تبلیغ

Marfat.com

اسلام کیلئے اس کتاب کی اشاعت میری جانب سے ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ قدیم مسلمان ادیبوں کی طرح میں بھی اس کتاب میں شامل ہر اچھی بات کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم کے طفیل ضبط تحریر میں آنا تصور کرتا ہوں اور اس کے برعکس جو کچھ میرے قلم نے لکھا ہو اس کے لئے میں پروردگار سے معافی کا خواستگار ہوں۔

قابل توجہ:

(i) مسلمانوں میں یہ روایت زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کا ذکر کرتے وقت آپؐ کے اسم گرامی کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ضرور لکھتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا جب تحریروں میں اس روایت کو برقرار رکھا گیا۔ تاہم پہلی دو صدیوں میں مسلمان ادیبوں نے اس کی سختی سے پابندی نہیں کی تھی۔ خیالات کے بہاؤ اور روانی میں فرق آ جانے کے عمل کو روکنے کیلئے، خصوصاً غیر مسلم قارئین کیلئے میں نے اس روایت کی تقلید نہیں کی۔ میں اس موقع پر مسلم قارئین کو اس روایت کے بارے میں صرف ایک یاد دہانی کرانا چاہوں گا۔

(ii) عربی الفاظ کی نقل حرفی ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مستعمل حل تو یہ ہے کہ لائبریری آف کانگریس نے بلیٹن نمبر ۹۱ میں جو سسٹم اپنایا ہے اس کو ہم بھی پیش نظر رکھیں۔ سادگی برقرار رکھنے کیلئے (اپنی سہولت کی خاطر) میں نے اس سسٹم کے مطابق الفاظ کے ہجے تو استعمال کئے ہیں لیکن اوپر اور نیچے لکھی ہوئی نقطوں اور لکیروں والی علامتیں چھوڑ دی ہیں۔ ماہرین کو پھر بھی متبادل عربی الفاظ تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوگی اور ہونی بھی نہیں چاہئے، مجھے امید ہے کہ یہ بات ماہرین کے علاوہ عام قارئین کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔

جیفرے لینگ

Marfat.com

پہلا باب

کلمۂ شہادت کا ورد زبان ہونا

لیکن شیطان نے اس کو پھسلایا۔ کہنے لگا: ''آدم، بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟'' (۲۰۔۱۲۱) (۱)

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا اور اس کی بھوری سفید دیواریں بھی خالی تھیں اسے آراستہ کرنے کیلئے صرف ایک نمایاں سرخ وسفید نمونے کا قالین بچھا ہوا تھا جس نے اس کمرے کے فرش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، بالکل ویسی ہی جیسی کسی تہ خانے میں ہوتی ہے۔ یہ کھڑکی ہمارے سامنے والی دیوار میں ہمارے سروں سے کچھ بلندی پر نظر آرہی تھی۔ ہم سب قطار اندر قطار تھے۔ میں تیسری صف میں تھا۔ ان صفوں میں صرف مرد تھے عورت کوئی بھی نہ تھی۔ ہم سب اپنے پاؤں کی ایڑیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارا رخ کھڑکی کی سمت تھا۔ یہ ماحول، یہ ساری فضاء میرے لئے اجنبی تھی، میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی دوسرے ملک میں ہوں۔ ہم سب مل کر نیچے کی جانب جھکے اور اب ہمارے منہ فرش کی طرف تھے۔ مکمل سکون اور خاموشی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آواز بند کردی گئی ہو۔ پھر اچانک ہم سب ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سامنے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ سامنے مجھ سے کچھ بائیں طرف، درمیان میں کھڑکی کے بالکل نیچے کوئی شخص موجود ہے جو اپنی جگہ پر تنہا تھا اور صفوں سے بالکل آگے تھا۔ مجھے اس کی صرف کمر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بزرگ ایک لمبا چغہ پہنے ہوئے تھے اور سر پر سرخ ڈیزائن کا

Marfat.com

سکارف تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

آئندہ کم و بیش دس سال تک میں نے یہی خواب بار ہا دیکھا، یہ خواب ہمیشہ ایک جیسا اور اتنا ہی مختصر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہے لیکن بعد میں مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق کسی مذہبی معاملے سے ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے اس کا ذکر ان لوگوں سے بھی کیا جو میرے نزدیک تھے لیکن پھر میں نے اس پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ جب میں خواب سے جاگتا تو مجھے ایک عجیب طرح کا سکون اور طمانیت حاصل ہوتی تھی۔

یہ تقریباً پہلے خواب سے کچھ پہلے یا ذرا سا بعد کا واقعہ ہے کہ مجھے مذہبیات کی کلاس سے نکال دیا گیا تھا۔ اس سیمسٹر سے پہلے مجھے اپنے عقیدے کے بارے میں کوئی بدگمانی، وسوسہ یا شک و شبہ نہیں تھا۔ میرا بپتسمہ ہوا تھا، اور رسمی تعلیم کے بعد میرے کیتھولک ہونے کی تصدیق کر دی گئی تھی۔

کم از کم جنوبی کینلکٹیکٹ میں یہی ایک ''واحد سچا مذہب تھا'' میرے دوستوں، ہمسایوں، رشتے داروں، شناساؤں اور واقف کاروں میں سوائے چند یہودیوں کے سبھی کیتھولک تھے۔ لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ایک بات کا سرا دوسری بات سے جڑتا گیا۔ یوں ایک واقعہ کسی دوسرے نئے واقعہ کو جنم دے رہا تھا نوٹرڈم ہائی سکول میں میرے سینئر سال کا آغاز تھا کہ ہمارے مذہبیات کے استاد نے جو خود ایک سچے اور پکے پادری تھے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں یہ بتائے کہ ہمیں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ہم اس بات پر یقین کر لیں کہ خدا کا وجود ہے۔ اسے ثابت کرنے کیلئے استاد محترم نے اسباب کو بنیاد بنا کر دلائل دینے شروع کئے۔ میں ریاضی کا اچھا طالب علم تھا اور اسی لئے ریاضی کی دلیل سے مجھے گرویدہ بنانا آسان تھا۔ میں نے پادری صاحب کے پیش کردہ نتائج اور دلائل کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرا موقف یہ تھا کہ صرف کسی شے کی وضاحت کوئی ثبوت تو نہیں ہوتی۔ کسی عظیم و برتر ہستی کو اگر ہم صحیح مقام دیں تو ہم اپنے وجود، اپنے جرم، صحیح و غلط وغیرہ کی وضاحت کر سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ کچھ متبادل وضاحتیں بھی ہیں مثلاً وہ جو مسلمہ طور پر ناقص ہیں جنہیں ہم بذریعہ سائنس سیکھتے ہیں۔ جب کہ مذاہب ابھی تک اپنے

Marfat.com

مجادلوں سے دلائل کے ذریعے برسرپیکار ہیں اور سائنس ایسا لگتا ہے جیسے مکمل حل کی جانب بڑی ثابت قدمی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ مابعد الطبیعاتی استدلال بمشکل ایک ثبوت تصور کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ کوئی شخص یہ دلیل بھی تو دے سکتا ہے کہ خدا پر یقین کی وسیع سرحدیں جہالت و لاعلمی اور خوف سے ملی ہوئی بھی ہوسکتی ہیں۔ غالباً ہم اپنے علم میں جس قدر زیادہ محفوظ ہوں گے اسی قدر ہم مذہب سے کم لگاؤ رکھتے ہوں گے۔ یہی معاملہ ماڈرن انسان کو درپیش ہے خصوصاً ان انسانوں کو جو تعلیمی روایات کے حامل ہیں۔ آئندہ چند ہفتوں کے دوران ہم ٹولیوں کی شکل میں اس موضوع پر بحث کرتے رہے جس کے نتیجے میں بہت سے ہم جماعتوں کو میں نے اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ جب ہم ایک نازک ہیجان سے دوچار ہوئے تو پادری صاحب نے مجھے اور میرے ہم خیال طلبہ کو ہدایت کی کہ ہم کلاس سے نکل جائیں اور اس وقت تک کمرہ جماعت میں داخل نہ ہوں جب تک ہمیں چیزیں اور طرح نظر نہ آئیں اور ہمارا نقطہ تبدیل نہ ہوگیا ہو۔ بصورت دیگر ہمیں اس کورس میں ''ایف'' ملنے والا تھا۔ یعنی ہمیں فیل کردیا جانے والا تھا۔

کئی راتیں گزر گئیں تو رات کے کھانے پر ایک روز مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے والدین کو بتادوں کہ مجھے مذہبیات کے کورس میں کیوں فیل کیا جانے والا ہے۔ میری ماں کو اس بات سے بہت صدمہ پہنچا اور میرے والد مجھ سے بہت ناراض ہوئے۔ میرے والد نے چلا کر کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم خدا پر یقین نہ کرو؟'' پھر میرے والد نے ایک پیشگوئی کی جوان کے خیال میں ہمیشہ سچ نکلتی رہی ہے۔ پیش گوئی یہ تھی۔

''خدا تمہیں گھٹنوں پر جھکا دے گا جیفرے! وہ تمہیں اس قدر نیچے لے جائے گا کہ تمہیں یہ خیال گزرے گا، کاش تم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے'' میں نے سوچا ایسا کیوں ہوگا؟ صرف اس لئے کہ میں اپنے سوالات کا جواب نہ دے سکتا تھا؟

اب میں اپنے خاندان والوں، دوستوں اور ہم مکتب ساتھیوں کی نظر میں ایک ملحد تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ اس مرحلے میں بھی خدا پر یقین میں نے ترک نہیں کیا تھا بلکہ محض استدلال برائے استدلال کی خاطر اس راہ پر چل نکلا تھا۔ میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا تھا کہ میں منکر خدا ہوں۔ میں نے تو کہا تھا کہ جو ثبوت ہماری مذہبیات کی کلاس میں پیش کئے گئے تھے وہ ناکافی ہیں، اس کے باوجود میں نے اس نئی صراحت کو رد نہیں کیا تھا کیونکہ اس الجھاؤ میں بڑا گہرا اثر

تھا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا کہ میں کس پر یقین رکھتا تھا یا کیوں رکھتا تھا۔

آئندہ کئی ماہ تک میں اپنے ذہن میں خدا کے وجود کو مسلسل چیلنج کرتا رہا۔ یہ رجحان اس دور میں غالب تھا کہ ہم اپنے اداروں کو خواہ وہ مذہبی ہی کیوں نہ ہوں شک و شبے کی نظر سے دیکھیں۔ ہماری نسل شک و بداعتمادی پر پروان چڑھی تھی۔ سکول کے زمانے میں ہم ہوائی حملوں کی مشقیں کرتے رہتے ہیں جن میں ہم ایٹمی حملے کی صورت میں حفاظتی تدابیر کے تحت پہلے ہی تہ خانے میں چلے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالت میں ہم زمین دوز کمروں میں کھانے پینے کا سامان جمع کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہیرو کینیڈی برادران اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو قتل کیا جارہا تھا اور ان کی جگہ وہ لیڈر لینے والے تھے جنہیں بالآخر سیاسی جلاوطنی اور بے عزتی قبول کرنے پر مجبور کیا جانا تھا۔ نسلی فسادات کے دوران لوٹ مار اور آتشزدگی کے واقعات صنعتی شہروں میں خصوصاً میرے شہر میں عام طور پر پیش آرہے تھے۔ ہر شب ٹی وی پر طاقت اور زور کا مظاہرہ دکھایا جارہا تھا۔ ہر شخص خوفزدہ تھا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی عذر سامنے رکھ کر کسی کو بھی نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ ایسے عذر کیلئے بھی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ یہ تصور کہ خدا نے ہمیں یا اسے بنایا ہی اس طرح ہے اور اس سب سے بالاتر یہ خیال کہ خدا ہم سب کو سزا دینے والا تھا اور ہم میں سے چند ایک کو آخر میں سزا ملے گی زیادہ خوفناک تھا اور سر پر مسلسل منڈلاتا رہتا تھا اور یہ خدا کو سرے سے ماننے ہی سے انکار کر دینے کی نسبت زیادہ پریشان کن تھا۔ میری عمر اٹھارہ برس کی تھی کہ میں ملحد ہو گیا تھا۔

شروع میں تو میں نے اپنے آپ کو بڑا آزاد محسوس کیا کیونکہ میری نئی طرز فکر نے مجھے اس خوف سے نجات دلا دی تھی کہ کوئی میرے خیالات اور واہموں پر دستک دے کر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں اب اپنی خاطر اور صرف اپنی خاطر آزاد زندگی گزار سکتا تھا۔ اب کسی مافوق الفطرت قوت کے تصور سے ڈرنے اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کسی حد تک مجھے اس بات پر فخر تھا کہ مجھے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی جرأت تھی کہ میں کون تھا اور میں اپنی زندگی کا کنٹرول خود سنبھال سکتا تھا۔ میں خود کو محفوظ تصور کرتا تھا کیونکہ میرے جذبات و احساسات اور خواہشات مکمل طور پر میری تھیں اور اس میں کوئی اعلیٰ طاقت یا کوئی اور شریک اور

Marfat.com

حصے دار نہ تھا۔ میں ہی اپنی کائنات کا مرکز تھا، اس کا خالق پرورش کرنے والا اور کفیل اور اسے مختلف پابندیوں کا اسیر بنانے والا بھی میں خود تھا۔ میں نے اپنے لئے خود یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اچھا برا کیا ہے اور صحیح و غلط کیا ہے۔ میں ہی اب اپنا خدائے مجازی تھا اور اپنا نجات دہندہ بھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں خود غرض اور حریص ہوگیا تھا کیونکہ اب تو میں پہلے سے کہیں زیادہ دوسروں کے ساتھ بانٹ لینے اور ان کا خیال کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ مگر ایسا کرنے میں میرے پیش نظر یہ تصور نہیں تھا کہ مستقبل میں اس کے عوض مجھے کوئی انعام ملے گا۔ میرے دل میں تو انسانوں کیلئے سچا اور حقیقی پیار پیدا ہوگیا تھا۔ ہم انسانوں سے محبت و پیار کے جذبے کو بہت اونچا مقام دیتے ہیں۔ یہ کسی ارتقائی عمل کی وجہ سے ہو، محض اتفاقاً ایسا ہو، یا اس کی کوئی ماحولیاتی یا حیاتیاتی وجہ ہو یہ میرے لئے زیادہ اہم نہیں کیونکہ یہ اتنا ہی حقیقی ہے جتنی کوئی اور شے اور یہ ہمیں خوشی و مسرت بخشتا ہے۔ جب آپ محبت اور پیار کے جذبے سے سرشار ہوکر مجھے کچھ دیتے ہیں تو آپ کو اس کا بدلہ یا اجر یقیناً یہیں اس دنیا میں اور بلا کسی تاخیر کے مل جاتا ہے!

کالج جانا ویسا ہی نہیں جیسے آپ گھر چھوڑتے ہیں۔ آپ گھر چھوڑنے کی صورت میں اب اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہ رہے ہوتے۔ یہ انحصاری اور خود انحصاری کا عبوری دور ہوتا ہے۔ آپ ایک ایسے مقام اور وقت پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں آپ اپنے نظریات کو ٹیسٹ کرتے ہوئے اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔ مجھے بہت جلد یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ایک ملحد سے زیادہ تنہائی اور اکیلے پن سے کوئی بھی اور واقف نہیں۔ جب کوئی عام انسانوں کے درمیان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے تو وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے اسے پکار سکتا ہے جو اسے جانتا ہے اور جو جواب ملے اسے سمجھ سکتا ہے۔ ایک ملحد اس عیش اور تکلف کی اپنے آپ کو اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ اس نے تو اس خواہش کو کچل کر اپنے آپ کو یہ یاد کرانا ہوتا ہے کہ یہ تو بڑی لغو اور بے معنی سی بات ہے وہ اپنی کائنات کا خدائے مجازی اور دیوتا خود ہی ہوسکتا ہے لیکن یہ دنیا بہت چھوٹی سی دنیا ہوگی کیونکہ اس کی حدود کا تعین تو اس کے اپنے ادراک نے کرنا ہوتا ہے اور یہ مسلسل سکڑتی رہتی ہے۔ ایک مذہبی آدمی کا ان چیزوں میں یقین ہوتا ہے جو اس کے وہم و گمان اور شعور و ادراک سے بالاتر ہوں جبکہ ایک ملحد تو سرے سے ان چیزوں پر اعتبار ہی نہیں کرتا اس کیلئے تو تقریباً کچھ بھی واقعی، حقیقی اور سچا نہیں ہوتا یہاں تک کہ سچ بھی۔ محبت و پیار، رحمدلی و

ہمدردی اور عدل و انصاف ہمیشہ اس کی رغبت اور التفات کے ساتھ ساتھ بدلتے اور منتقل ہوتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود اور وہ لوگ جو اس کے قریب ہوتے ہیں دونوں عدم استحکام کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسے اپنے آپ میں مگن رہنا ہوتا ہے تا کہ اس کیفیت کو برقرار رکھ سکے، اس میں توازن قائم کر سکے اور اسے سمجھ سکے۔ اس دوران اسے بیرونی قوتوں سے بھی لڑنا ہوتا ہے جو اس کی حریف ہوتی ہیں، اپنے کنٹرول سے باہر ان انسانی رشتوں سے بھی برسر پیکار ہونا پڑتا ہے جو اس کی دنیا میں بے جا مداخلت کرتے ہوں۔ اسے سادگی، خلوت اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اسے اپنی ذات سے باہر تک نکلنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم سب لافانی ہو جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مذہبی آدمی کسی حل کی فکر میں رہتا ہے جب کہ ایک ملحد کو ابھی اور اسی وقت حل نکالنا ہوتا ہے بلکہ حل تراشنا ہوتا ہے۔ دوسروں کے ذہنوں میں زندہ رہنے کیلئے غالباً خاندان، کتاب، کوئی ایجاد، شجاعت و بہادری کا کوئی کارنامہ یا کوئی بڑا عشق ہی ایسا حل دے سکتا ہے۔ اس کی آخری منزل جنت کا حصول نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ اسے یاد رکھا جائے، وہ دوسروں کی یادوں میں بقائے دوام کی خواہش رکھتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

بنی نوع انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے کی خواہش ہوتی ہے ہمارے اندر کی لگن اور سچی آرزو ہی تو ہمیں کام پر اکساتی ہے۔ کیا مجھے ایک روز ایک بڑا ریاضی دان، بڑا تیز دوڑنے والا، تجربہ کار باورچی، مخلوق خدا سے محبت کرنے والا، یا بچوں کا باپ بننا ہے؟ اس کی ضرورت کی تسلی کسی شے سے نہیں ہوتی کیونکہ ایک ملحد کا مذہب یا دھرم تو یہ ہوتا ہے کہ کامل واکمل نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ اس سے بعد کی بہترین شے تو استحکام یا ثبات ہے۔ میں نے آزمائے ہوئے معاشرتی نمونوں کی تقلید کی، مگر اس لئے نہیں کہ میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ وہ مفید اور قابل عمل تھے۔

کینکٹیکٹ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے شادی کر لی تھی۔ ہم مغربی لیفیٹ، انڈیانا منتقل ہو گئے تھے تا کہ ہم پرڈیو یونیورسٹی سے گریجویٹ سکول میں داخلہ لے سکیں۔ حالانکہ ہماری شادی نئی نئی ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہم اس بات پر میاں بیوی دونوں متفق تھے کہ ہماری شادی کوئی مستقل بندھن نہیں تھی اور بہتر مواقع حاصل ہونے پر ہم دونوں خوش اسلوبی

Marfat.com

سے اس بندھن سے آزاد ہوسکیں گے۔ وقتی طور پر اس کے عملاً کچھ فوائد بھی تھے۔ ہم بلاشبہ دوست تھے اور ہمارے درمیان عشق و محبت والی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر توقع کے عین مطابق ہم تین سال بعد بڑی خوش اسلوبی سے طلاق کے ذریعے جدا ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ مجھے اس بات پر دکھ کیوں نہیں ہوا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی محبوب مجھ سے جدا ہوا تھا جس کے بغیر میں زندہ نہ رہ سکوں مجھے ڈر یہ تھا کہ میں دوبارہ اکیلا نہ رہ سکوں گا مگر اس پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں تو ہمیشہ سے اکیلا تھا، خواہ میری شادی ہو چکی تھی یا میں کنوارا تھا۔ شادی کے بعد تین سال تک میں ہمیشہ اس لمحے کی امید کرتا رہا کہ ایک روز ایسا ہو کر رہے گا۔ میری بیوی ایک قابل تعریف عورت تھی۔ میری زندگی میں تو کسی کیلئے کبھی کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ جس روز وہ علیحدہ ہوئی، طلاق کا مطالبہ اسی نے کیا تھا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ میرا جہان میرے لئے ایک قید خانہ بن گیا ہے، ایک پناہ گاہ، ایک چھپنے کی جگہ۔ مگر مجھے اب تک یہ معلوم ہی نہ تھا کہ میں کس شے سے بھاگ رہا ہوں۔ مجازی خدا یا دیوتا ہونا کوئی آسان کام تو نہ تھا میں بری طرح ٹوٹ پھوٹ جانا چاہتا تھا! میں تمام لوگوں کیلئے سب کچھ بن جانا چاہتا تھا اور اس بات کی ایک اہمیت تھی کہ لوگ مجھے کس طرح دیکھتے تھے حالانکہ میں اپنے آپ کو یہ کہنے پر مصر تھا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس کی ضرورت ہمیں یوں پڑتی ہے کہ ہم اپنے وجود کا جواز چاہتے ہیں اور اگر کوئی اور میری زندگی کو قیمتی نہیں سمجھتا تھا تو پھر اس کی قدر و قیمت کیا تھی؟ اگر یہ اتنی ہی بے معنی اور بے قدر و قیمت شے تھی تو پھر زندہ رہنے کا کیا جواز بنتا تھا؟ کم سے کم مجھے تو ریاضی کی تعلیم حاصل کرنی تھی اور اس لئے میں نے تو ساری توجہ اس طرف دے دی۔ اگلے دو برس میں مختصر سی مدت کیلئے چند رومان بھی جاری رہے، محض محبت کا تجربہ کرنے کیلئے کوئی تعلق یا رشتہ جوڑنے کیلئے نہیں! پھر ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔

میں اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کیلئے انٹرویو سے ابھی ابھی فارغ ہوا تھا اور کمرے کے باہر انتظار کر رہا تھا جب کہ کمیٹی کسی فیصلے پر پہنچنے والی تھی۔ میں نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے پانچ برس اس مقالے پر کام کیا تھا اور میں اس روز جذباتی طور پر تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا اور یہ خوش خبری سننے کو ملی:

Marfat.com

"ڈاکٹر لینگ، مبارک ہو!"

میں جونہی اپنے رہائشی کمرے کی طرف مڑا میری ساری خوشی رخصت ہونی شروع ہوگئی تھی میں نے جوں جوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اداسی وافسردگی مایوسی اور تلخی نے مجھے اتنا ہی گھیر لیا تھا۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ ہم کس طرح کرسمس کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں، جب اپنے بچپن کے جوش وجذبے کو سنبھالے رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اس میں ناکام ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ہم اپنے بچپن کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے اور اب بچے نہیں رہے تھے۔ ہوسکتا ہے زندگی ٹی وی سکرین کے اشتہاروں کا ایک سلسلہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ ہم نہایت حقیر، نکمی اور غیر سنجیدہ چیزوں کیلئے اس قدر مایوس، افسردہ اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہم دراصل اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں جو یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہماری منزل مقصود کی کوئی حقیقی قدر و قیمت ہے جبکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم تو اس جانور کی مانند ہیں جو زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کیا یہی کچھ ہے وہ جس کے لئے زندگی عطا ہوئی ہے؟

ایک مصنوعی فتح کے بعد دوسری؟۔ میں نے اس سب کو از سر نو سوچنا شروع کر دیا تھا، غور وفکر کا ایک نیا زاویہ سامنے آیا۔ یہ دسمبر ۱۹۸۱ء کی بات ہے کہ میں گریجویشن کر چکا تھا اور میں ایک سیمسٹر کے لئے بطور انسٹرکٹر یہیں ٹھہرا رہا تا کہ ملازمت کی تلاش کرسکوں۔

مغربی لیفیٹ کو تو قدرت نے بنایا ہی اس لئے تھا کہ یہاں کے بسنے والے غور وفکر، تدبر اور مراقبے میں رہیں۔ یہاں کرنے کیلئے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ ایک ایسا شہر تھا جو طلبہ کے چھٹیوں کے دنوں میں خالی ہو کر شہر آشوب بن جاتا تھا۔ یہاں بہت سے فاسٹ فوڈ ریسٹوران تھے، دو سینما گھر، چند گرجا گھر، تین لانڈریاں اور چند خورد ونوش کا سامان بیچنے والے بڑے سٹور تھے۔ آپ کو زیادہ نہیں چلنا پڑتا تھا کہ آپ دیہاتی کھیتوں کے علاقے میں پہنچ جائیں۔ میں سڑک کے کنارے کنارے ہر روز کئی میل کی مسافت طے کرتا تھا، اس دوران مجھے پاؤں تلے سفید برف کی دبیز تہوں کی چرمراہٹ سنائی دیتی تھی۔ میری دانست میں امسال سب سے زیادہ سردی پڑی تھی۔ برف کا سفید سمندر پرکشش اور بہت پرسکون تھا مگر میں اپنے خیالات کی چھلنی میں سے گزر رہا تھا۔

میں اس نوجوان خاتون کو نہ بھلا سکا تھا جو میرے دفتر میں مدد کیلئے آئی تھی۔ میں نے

دروازہ کھولا تو مجھے ایک پراسرار، میرے اندازے کے مطابق مشرق وسطیٰ کی ایک خاتون نظر آئی، جس کا رُخ میری طرف تھا۔ وہ سرتاپا ایک خاص قسم کے لباس میں ڈھکی ہوئی تھی۔ کچھ کچھ کسی راہبہ کے لباس کی مانند۔ سر سے پاؤں تک کالے لباس میں اس کے صرف ہاتھ اور چہرہ نظر آرہے تھے۔

اس خاتون کو فیلڈ تھیوری میں مدد درکار تھی اور اس کے پروفیسر نے میرا نام دیا تھا۔ میں نے اپنی رضامندی تو دے دی مگر بہت جلد عرب خواتین کے بارے میں پہلے سے قائم میری رائے ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ یہ شعبہ ریاضی میں گریجویٹ سٹوڈنٹ تھی اور چونکہ میری طرح وہ بھی دوسرے ٹیچنگ معاونین کے ساتھ ایک مشترکہ دفتر کی سہولت رکھتی تھیں اس لئے وہ خود بھی ضرور ٹیچنگ معاون ہوگی۔ میں یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ اس لباس میں انڈیانا کے ان رہنے والوں کی کلاس کے سامنے کھڑی ہوگی جن کا تعلق افریقی نسل سے تھا! ۔ وہ اس قدر پُروقار نظر آرہی تھی کہ اس کے سامنے مجھے اپنے آپ سے کچھ شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے قدرتی خوبصورت چہرے سے اس کا حسن جھلک رہا تھا مگر نہ جانے کیوں میں نے کوشش کی کہ اس کے چہرے کی جانب نہ دیکھوں۔ میں نہ سمجھ سکا کہ ایسا کسی حماقت و دیوانگی کے باعث تھا یا کسی تجسس یا اشتیاق کی وجہ سے۔ غالباً اس کی دونوں وجوہ تھیں۔ اس خاتون کے اندر کوئی نرم و نازک قوت اور حسن و خوبصورتی ایسی تھی جسے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے بارہا اس کے دفتر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے کی خواہش کی مگر ایسا نہ کرسکا۔

مجھے دوسرے مذاہب سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی تھی۔ اب میرے قریبی حلقہ احباب میں مصری، بھارتی، پاکستانی، جاپانی اور چینی دوست شامل ہوگئے تھے۔ میں نے ہمیشہ مختلف مذہبی نظاموں کو متحد دیکھ کر اسے توحید کے خلاف ایک ثبوت کے طور پر لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بنیادی اور اساسی عقائد تو ایک جیسے تھے اور صرف رمز و اشارات، عبادات اور معبود مختلف تھے۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی عالمگیر اور آفاقی طاقت یا روح ہو جو ایک بہت بڑی قوت کے طور پر ہم پر چھائی ہوئی ہو۔ اس آگاہی کو بیان کرنے کیلئے قدرتی طور پر اشارات و علامات بھی اسی کلچر سے لی جانی چاہئے تھیں جس سے یہ ابھری تھی۔ اس میں خیالات و تصورات کا تنوع موجود تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے تہذیب و تمدن کی پیداوار تھے۔ وہ کلچر جسے ہم بناتے ہیں اور جو ہمیں ایک شکل

دیتا ہے، میں نے سوچا مجھے اپنے مذہب کی بنیادی اساس کی جانب لوٹ جانا چاہئے۔ میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران چھ ہفتوں کیلئے کینکٹیکٹ میں واقع اپنے گھر چلا گیا۔

میری ماں زیادہ حیران تو نہ تھی لیکن مجھے دیکھ کر خوش بہت ہوئی خاص طور پر اس وقت جب میں نے یہ پوچھا کہ کیا میں سنڈے چرچ سروس میں ان کے ساتھ شامل ہوسکتا تھا۔ میرے خطوط اور ٹیلی فون کالوں میں کافی اشارات موجود تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں ''تلاش و جستجو'' کی منزل میں ہوں۔ گرجے میں ہمیشہ اپنے والد کی طرح میں پیچھے کھڑا ہو جاتا اور توجہ سے پادری کا وعظ سنتا رہتا تھا۔ تاہم الفاظ مجھ تک نہیں پہنچتے تھے کیونکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پادری تو کسی اور سے باتیں کر رہا ہے، شاید ان سے جو پہلے ہی سے اس مذہب کے اعتقادات پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ لوگ بھی تو یوں لگتا تھا نہیں سن رہے جیسا کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ پہلے بھی نہیں سنا کرتے تھے۔ تاہم ہوسکتا ہے انہیں رسم عشائے ربانی سے ضرور کچھ حاصل ہو رہا ہوگا ورنہ وہ اس میں کیوں شریک ہوتے؟۔ مگر میرے ساتھ تو یہ معاملہ نہ تھا۔ چرچ کے جب ہم باہر پتلے چپٹے کیک کے لئے جاتے تو میرے والدین مجھے اپنے ذاتی تجربات، شک وشبہات اور عدم اطمینان کے بارے میں بتاتے، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ میری مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کیلئے میں اپنے دل میں ان کیلئے محبت واحترام محسوس کر رہا تھا۔ میں متواتر تین اتوار چرچ جاتا رہا چوتھے اتوار میرے لئے یہ مشکل کام تھا کہ اپنی والدہ سے یہ کہہ سکوں کہ میں اس روز ان کے ساتھ چرچ نہیں جا رہا تھا۔ میں نے تو اس کے سامنے بھی جانے سے ہچکچا رہا تھا جب ماں مجھے جگانے آئیں تو میں نے ان کی طرف اپنی پیٹھ کر لی۔ ''ماں یہ سب کچھ میرے لئے نہیں ہے'' کچھ دیر کا وقفہ رہا۔ وہ خاموش تھیں غالباً وہ میری حوصلہ افزائی کی کوئی صورت نکالنا چاہتی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھ سے یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اسے زیادہ وقت دوں اور یہ کہ محض تین اتوار رسم عشائے ربانی میں شرکت کو کافی سمجھنا محض میری سادہ لوحی تھی۔ ''ٹھیک ہے میرے بیٹے'' ماں کے ان الفاظ میں مایوسی، شکست، مادری درد والفت سبھی کچھ مضمر تھا جو خاص طور پر اس وقت نکلتے ہیں جب کسی ماں کا بیٹا کسی مشکل میں گرفتار ہو اور وہ اس کی مدد بھی نہ کرسکتی ہو۔ میں بستر سے نکل کر اسے اپنی باہوں میں لے کر یہ کہنا چاہتا تھا کہ ماں میں معذرت خواہ ہوں مگر میں تو کروٹ ہی نہ لے سکا۔ وہ ایک لمحے کے لئے پلنگ کے

Marfat.com

قریب خاموش کھڑی رہیں اور پھر مجھے اس کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے کمرے سے جا رہی تھی۔

سان فرانسسکو میں نئی زندگی کے آغاز کے بڑے مواقع تھے۔ نئی جگہیں نئے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ آپ کو چونکہ کوئی جانتا نہیں اس لئے بے نامی میں آپ غیر متوقع اور کوئی مختلف کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ میرے پروفیسروں نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں کہیں اور کام کروں لیکن میں نے اپنے لئے یونیورسٹی آف سان فرانسسکو کا انتخاب کرلیا تھا۔ ایسا کیوں تھا مجھے یقینی طور پر اس کا علم نہ تھا۔ یہ کوئی تحقیقی سکول نہیں تھا اور میں نے بڑے شہروں کو بھی پسند نہیں کیا تھا۔ سمیسٹر کے آغاز میں میری زندگی ہیجان اور بدنظمی و انتشار کا شکار تھی۔ میں نے وقتی طور پر اپنے حال سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہوکر زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ایک گریجویٹ طالب علم کو ملنے والے وظیفے سے ہٹ کر اب مجھے خود کما کر زندگی گزارنے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ میں اپنے پہلے لیکچر کی ابتداء کرنے والا تھا کہ ایک نہایت خوبصورت، وجیہہ اور شاہانہ طمطراق کا مالک عرب نوجوان عقبی دروازے سے کمرۂ جماعت میں اندر داخل ہوا یا یوں کہیے کہ اندر داخل ہوکر اس نے مجھ پر ایک بے خودی سی طاری کردی۔

وہ دراز قد، سمارٹ بھی تھا اور ایسے لباس میں ملبوس تھا جس سے اس کی خوش ذوقی ٹپک رہی تھی۔ پوری کلاس کی نظریں اس کی طرف مڑ گئی تھیں۔ میں نے سوچا پوری کلاس اس کیلئے کھڑی بھی ہوسکتی تھی۔ سب نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ مسکراہٹوں اور اشاروں سے ان کی نظروں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ کی جانب بڑھا تو سب ہنس پڑے۔ کمرۂ جماعت کا ماحول ہی بدل چکا تھا۔ میرے لیکچر کا تعلق کسی حد تک میڈیکل ریسرچ سے تھا اور میں نے اس حوالے سے اپنی کلاس سے پوچھا کہ کیا کوئی مجھ سے اپنے ادراک و وجدان کے بارے میں باہمی تبادلہ خیالات کرنا چاہتا ہے؟ کمرے کے پچھلے حصے سے سوائے اس نوجوان کے اور کون اثبات میں ہاتھ کھڑا کرسکتا تھا جسے میں نے کوئی شہزادہ سمجھا تھا۔ نہایت خوبصورت انگریزی میں، ذرا سے برطانوی لہجے میں مگر مکمل اعتماد کے ساتھ اس نے اس موضوع کی تشریح کرتے ہوئے اسے پوری کلاس کیلئے قابل فہم بنا دیا تھا۔

''آپ کا نام؟'' میں نے پوچھا۔

''محمود قندیل'' اس نے جواب دیا۔

''آپ تو لگتا ہے میڈیسن کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ کیا یہی آپ کا مضمون ہے؟''

''نہیں'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک روز پہلے مجھے اس موضوع پر کسی رسالے میں ایک مضمون پڑھنے کو مل گیا تھا۔''

''بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے خیالات میں ہم سب کو شریک کرلیا لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ کو میڈیسن ہی کو اپنا کیریئر بنانے کے بارے میں ضرور سوچنا چاہئے۔ آج کے بعد میں تو آپ کو ڈاکٹر قندیل کے نام سے مخاطب کیا کروں گا۔''

وہ شفقت و محبت بھرے انداز میں مسکرا دیا!

محمود مجھ سے پانچ برس چھوٹا تھا مگر نوری سالوں کے حساب سے وہ مجھ سے دنیاوی معاملات میں کہیں بڑا تھا۔ اس نے تو مجھے سان فرانسسکو میں متعارف کرانے کا جیسے ذمہ ہی لے لیا تھا۔ ہر شخص اس سے واقف تھا (بلکہ اس سے عقیدت و احترام سے ملتا تھا) میئر، پولیس کا افسر اعلیٰ، راک موسیقی کے ستارے، دوا ساز، عام لوگ سبھی اسے جانتے تھے، وہ بہت فیاض اور سخی تھا اور اس کی مروّت کا یہ عالم تھا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے انسان کو بھی اہمیت دیتا تھا۔ اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا اور وہ ہمیشہ کسرنفسی سے کام لیتا تھا۔ محمود سے کوئی چیز چھپانے کی ضرورت اس لئے نہ تھی کہ وہ آپ کو اسی طرح قبول کر لیتا تھا جیسے آپ فی الواقع ہوں۔ وہ لوگوں کو گرویدہ بنانے کا فن جانتا تھا۔ وہ آپ کے چھپے ہوئے زخموں کو بھی جان جاتا تھا اور خواہ عارضی طور پر ہی سہی مگر وہ آپ کے دکھ درد کو فراموش ضرور کروا دیتا تھا۔ وہ دلنواز اور ہنس مکھ اس قدر تھا کہ اس کی برابری اور ہمسری ممکن ہی نہ تھی۔ ہم جہاں بھی جاتے خواتین اس کے گالوں پر بوسے دیتیں اور ہم ہر جگہ گھومتے پھرتے تھے! یہ ایسی دنیا تھی جو اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی، ایسی دنیا جس میں عالی شان کاریں، عمدہ بیش قیمت لباس، لذیذ کھانے، ریسٹوران، انگوٹھیاں، گھڑیاں، بادبانی کشتیاں، بڑی بڑی شخصیات، سفارتکار، کال گرلز، شہر سے دور کھلے میدان اور امریکی غیر رسمی شبینہ کلب تھے، جہاں درمیانی عمر کی عورتیں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ شب بھر کے لئے ان کے مہمان بن جایئے اور صبح کا ناشتہ ان کے ساتھ

کیجیے۔ اس دنیا میں دلکشی اور دلفریبی تھی، ہر سمت برف کی سی چمک دمک تھی! گفتگو اور بات چیت میں برف جیسی ٹھنڈک تھی، زندگی سے عاری بے جان سی تھی ساری ہمکلامی اور یہ کہیں نہیں لے جاتی تھی۔ ہماری حیثیت ان چھوٹے موٹے اداکاروں کی تھی جنہیں ایسے رول ملے ہوں جن کیلئے وہ موزوں ہی نہ ہوں۔ ہر شخص کی یہ ناکام اور مایوسی سے پر کوشش تھی کہ وقت اچھا کٹ جائے، وہ اس کام میں مصروف تھا کہ اس ساری ہماہمی میں داخل ہوکر، اس کے ساتھ رہ کر اور اس سے باہر صرف اپنی ذات تک محدود رہ کر لطف اندوز ہو سکے۔ قہقہے ضرور تھے مگر خوشی و مسرت کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی بھی کسی وقت بھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر اتنا مجروح محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نہ تو اس ماحول کے قابل تھا نہ ایسا چاہتا تھا۔

اس ماحول میں رہتے رہتے حالانکہ وہ اب ایک تجربہ کار کھلاڑی بن چکا تھا مگر پھر بھی محمود اس دنیا کا باسی نہیں تھا۔ فطرتاً وہ ایک سادہ، دھیمے مزاج کا، فیاض اور دل کا غنی انسان تھا۔ اس کی ساری دلکشی و دلنوازی اس کی معصومیت، دیانتداری اور لڑکپنے کی مرہون منت تھی۔ سان فرانسسکو میں معجزانہ طور پر وہ اسے برقرار تو رکھ سکا مگر وہ ذراسی دھندلا گئی تھی، ماند پڑ گئی تھی۔ میں ہی تنہا نہیں تھا جو کسی شے کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ محمود کا اپنا کرب تھا، وہ ایک اور اذیت میں مبتلا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاید دوسروں کے دکھ درد کا مداوا نہ کر سکتا۔ مجھے پوری امید تھی کہ جو کچھ اس سے گم گیا تھا وہ اسے ضرور مل جائے گا۔

اس نے مجھے اپنے خاندان سے متعارف کرایا، فوری طور پر میرے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ہم میں سے کس نے کس کی خاطر اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے مگر اس میں میری نسبت اس خاندان کے افراد کا حصہ زیادہ تھا۔ محمود سب سے بڑا بیٹا تھا اور ایک سعودی خاندان میں بڑے بیٹے کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا بھائی عمر، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے کے شعبہ فزکس کا ایک ذہین طالب علم تھا۔ وہ دراز قد، گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا اور تائیوانڈو میں دوسرے درجے کی بلیک بیلٹ حاصل کر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شدت جذبات کا اظہار اس قدر ہوتا تھا کہ جب وہ مسکراتا تو بڑی طمانیت بخش مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ اکثر مسکراتا ہی رہتا تھا۔ اس کی ایک بہن بھی تھی رابعہ جو سان فرانسسکو یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ بہت اچھی اور نیک فطرت۔ اس کی بڑی اور بھوری آنکھیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیتی تھیں۔ ان

Marfat.com

میں سے دوسروں کی فکر کا جذبہ، گرمی خلوص، بصیرت افروزی اور رحم و ہمدردی چھلکتی رہتی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی خوبصورت دوشیزہ تھی جسے خدا نے ملکوتی حسن سے نوازا تھا، ایسا حسن جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ ہو اور جسے بھول جانا بس میں نہ ہو۔ جوان اور خوبصورت ہوازن، محمود کی ہونے والی بیوی تھی۔ وہ ذہین، ظریف الطبع، معاملات کی تہ تک آسانی سے پہنچ جانے والی ذہن کی مالکہ تھی جسے ہنسنا اچھا لگتا تھا۔ یہ سب ابھی بچے ہی تھے جب محمود کے والد انتقال کر گئے تھے وہ جس طرح اپنے والد کو یاد کرتے تھے اس سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ انہیں اپنے باپ سے کس قدر محبت تھی اور باپ کی موت پر لگنے والے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ان کی والدہ سعودی عرب میں یوں تو اکیلی رہتی تھی البتہ نوکر بہت سے خدمت گزاری کیلئے موجود تھے۔

جو وقت ہم سب نے خلیج کے علاقے میں پکنک منا کر اور سیر و تفریح میں گزارا، ان کے گھر میں لذیذ کھانا کھایا، یہ ایک بہت طویل عرصے میں سے میری زندگی کا بہترین وقت تھا ہم مذہب کو زیادہ زیر بحث نہیں لاتے تھے اور جب کبھی ایسا ہوا بھی تو یہ میرے سوالات کے جوابات کی حد تک محدود ہوتا تھا۔ میں اسے درمیان میں اس لئے بھی نہیں لانا چاہتا تھا کہ مجھے یہ پسند نہ تھا کہ یہ ہماری دوستی میں فرق ڈالے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی یہی سوچتے تھے۔ اس لئے مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب مجھے قرآن پاک اور اسلام پر چند کتابیں پیش کی گئیں۔ میں جانتا تھا کہ اپنے مذہب سے انہیں ایک لگاؤ ضرور ہے مگر ان کی زندگی کوئی زیادہ مذہبی بھی نہیں تھی۔ میں نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ وہ اس حوالے سے کسی اور کی زندگی میں کوئی دلچسپی لے رہے ہوں۔ میں حیران تھا کہ اس کا خیال کس کو آیا۔ عمر روحانیت کی طرف مائل تھا، رابعہ میں ہمدردی اور دردمندی کا جذبہ غالب تھا اور رہا محمود وہ تو مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے سوچا کیا میں واقعی ناخوش تھا؟ بہرکیف میں نے اسے ایک تحفے کے طور پر قبول کیا، کوئی ایسا تحفہ جو کسی اپنے نے دیا ہو اور جو اس کی خوشی میں شریک ہونا چاہتا ہو۔ اس کے بدلے میں نے فیصلہ کیا کہ میں قرآن پاک اور ان کتابوں کا مطالعہ کروں گا اور انہیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

آپ اسے سنجیدگی سے لیں تب بھی آپ فوراً قرآن پاک کا مخلصانہ طور پر مطالعہ تو شروع نہیں کریں گے۔ اگر آپ پہلے ہی ہتھیار نہیں ڈال چکے تو آپ اس کے خلاف لڑیں گے۔ یہ براہ راست اور بڑی سختی سے آپ کی ذات پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ آپ سے مکالمہ کر کے بحث و

تمحیص کرتا ہے، تنقید کرتا ہے، آپ کی عزت نفس پر ضرب لگاتا ہے اور آپ کو چیلنج کرتا ہے۔
شروع ہی میں یہ جنگ کی لائن کھینچ دیتا ہے اور میں اس لائن سے دوسری طرف تھا۔ میں بری طرح نقصان میں تھا کیونکہ مجھ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ مصنف (خدا) کو میں کم جانتا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ واقف تھا۔ مصور کسی تصویر کی آنکھیں اس طرح بنا سکتے ہیں کہ یوں لگے جیسے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک آپ کا تعاقب کر رہی ہیں مگر کیا ایک مصنف کوئی ایسا صحیفہ لکھ سکتا ہے جس میں آپ کی آنے والی زندگی کے نشیب و فراز دکھا دیئے جائیں؟ یہ سوال مجھے پریشان کئے ہوئے تھا۔ قرآن میری سوچ سے ہمیشہ آگے تھا۔ یہ تو میری ان رکاوٹوں کو، ان ذہنی بندشوں کو گرا رہا تھا جو برسوں پہلے میں نے تعمیر کی تھیں اور میرے سوالات و استفسارات سے مخاطب تھا۔ ہر رات میں سوالات اور اعتراضات اکٹھے کرتا رہتا تھا اور دوسرے ہی روز ایک خاص ترتیب سے ان کے جوابات مجھے قرآن پاک میں مل جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مصنف میرے تصورات و خیالات پڑھ رہا تھا۔ قرآن پاک کے صفحات میں میری ملاقات اپنے آپ سے ہوئی اور جو کچھ مجھے اپنے آپ میں نظر آیا میں اس سے خوفزدہ تھا۔ میری رہنمائی کرتے کرتے مجھے ایک ایسے کونے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا جہاں منتخب کرنے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہو۔ مجھے کسی سے اس موضوع پر بات کرنی تھی مگر محمود قندیل کے خاندان میں سے کسی کے ساتھ نہیں۔ کسی ایسے فرد سے جو مجھے جانتا نہ ہوتا کہ کسی قسم کی توقعات وابستہ نہ ہوں۔ اس ہفتے کے روز جب میں گولڈن گیٹ پارک میں تھا اور اپنی روزانہ سیر مکمل کر کے ڈائمنڈ ہائیٹس کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے پیر کے روز اس مسجد میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا انتظام و انصرام مقامی طلبہ کے ہاتھ میں تھا۔

سینٹ اگنیشس چرچ، جو گولڈن گیٹ بولیورڈ کی چوٹی پر واقع ہے سان فرانسسکو یونیورسٹی کے لئے بڑا باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے رجسٹر میں اس کی مختلف زاویوں سے کھینچی گئیں تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ میں نے اس سے بھی زیادہ پرشکوہ اور عظیم الشان چرچ دیکھے ہیں مگر جب کہر اس پر اترتی ہے تو یوں نظر آتا ہے جیسے اس کے کلس عرش کو چھونے لگے ہیں۔
اس مخصوص بدھ کے روز میں بعد دوپہر بارنے سائنس سینٹر کے باہر کھڑا تھا۔ جہاں قریب ہی میرا دفتر تھا۔ آسمان صاف تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی رہی تھی۔ میں نے چرچ کی جانب اوپر

Marfat.com

چڑھنا شروع کیا۔ نیچے چرچ کے پیچھے وہ مسجد تھی جو عیسائیوں نے مسلم طلبہ کو کرایے پر دے رکھی تھی۔ اپنے پہلے سے طے کردہ پروگرام کے برعکس میں ابھی تک مسجد میں نہیں جاسکا تھا۔ میں نے تو بلکہ یہ سوچنا شروع کردیا تھا کہ میں نے کہیں جلد بازی میں تو یہ فیصلہ نہیں کرلیا تھا۔ بالآخر میں نے اپنے پروگرام کے مطابق مسجد میں جانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے آپ کو یہ تسلی دی کہ میں صرف اپنے چند سوالات کے جوابات حاصل کرنے جا رہا تھا۔ چرچ پارکنگ سے گزرتے ہوئے میں نے تو ریہرسل بھی کرلی تھی کہ میں اپنا تعارف کیسے کراؤں گا۔ نیچے مسجد کی طرف جانے والی سیڑھیاں سامنے تھیں اور سینٹ اینیشیس کے مجسمے بائیں طرف واقع تھیں۔ مجھ سے کئی ہفتے قبل ایک امریکی طالبعلم نے ازراہ مذاق کہا تھا:

''کہتے ہیں وہ لوگ (مسلمان) نیچے مسجد میں لاشیں رکھتے ہیں۔'' میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا نیچے جانے والے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت یقیناً عربی زبان میں تھی۔ میں اندر جانے میں جھجک محسوس کررہا تھا میرے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور میرے اندیشے بڑھتے جارہے تھے۔ میں نے سوچا چرچ کے کسی آدمی سے پوچھ لوں کہ کیا میں صحیح جگہ پہنچا تھا۔ میں بغلی دروازے کی جانب بڑھا مگر اس کے اندر مکمل اندھیرا تھا اور رنگدار شیشے رنگین شعاعیں منعکس کررہے تھے۔ چرچ کی قربان گاہ کی بائیں سمت مجھے پہرہ دار نظر آیا، اس تک پہنچنے کے بعد میں گھٹنے ٹیکے بغیر صلیب کے سامنے سے گزرا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام سبق میرے اندر کیسے راسخ ہوگئے تھے'' کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں مسجد کہاں ہے؟'' میں نے پہرہ دار سے پوچھا۔ میں جس قدر عدم توازن محسوس کررہا تھا اسی قدر میں گھبرایا ہوا بھی نظر آرہا ہوں گا۔ کیونکہ پہرہ دار کے چہرے پر حیرت اور حقارت وغصہ جھلک رہا تھا۔ میں نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔

باہر نکل کر میں نے دو لمبے لمبے سانس لئے۔ دوبارہ باہر سورج کی روشنی میں آکر مجھے بہت سکون ملا تھا۔ مجھے چند لمحوں کے ستانے کی ضرورت تھی۔ میں نے چرچ کے گرد چکر کاٹا تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ مسجد کے اندر جانے کے اور کون کون سے راستے تھے۔ ایک راستہ اور تھا مگر اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں پھر مجسمے کے قریب زینے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ زینہ اترتے وقت میں نصف راستے طے کرنے کے بعد ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت میں مبتلا

Marfat.com

تھا۔ میں فوراً مڑا اور واپس زینہ چڑھنے لگا۔ ''ایک منٹ کے لئے ٹھہرو!'' میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر خود کو ڈانٹتے ہوئے کہا ''تم ہر روز اس یونیورسٹی کے دروازوں سے داخل ہوتے اور باہر آتے ہو۔ اندر مسجد میں بھی تو طلبہ ہی ہوں گے۔ خدا کیلئے کچھ تو سوچو!'' میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر زینہ اترنے لگا۔ اس بار نصف زینہ اترنے کے بعد میری حالت پہلے سے بدتر ہوگئی تھی۔

جب نیچے تہہ تک پہنچا تو میں سکڑا ہوا اور بیمار لگ رہا تھا۔ میری وہی ٹانگیں جن پر میں بلا ناغہ سات میل چلتا تھا کمزور پڑ گئی تھیں۔ میں نے دروازے کے دستے تک ہاتھ بڑھایا۔ یہ کیا؟ میرا ہاتھ کانپ کیوں رہا تھا۔ میں کیوں کانپنے لگا تھا! مجھے پسینے آ رہے تھے، میں زینے کے سب سے اوپر والے حصے کی طرف دوڑا۔ میری پیٹھ مسجد کی طرف تھی اور میں جیسے ایک جگہ یخ بستہ کھڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں بوکھلا گیا تھا اور اپنی شکست پر نادم تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ بھاگ کر اپنے دفتر چلا جاؤں۔ کئی سیکنڈ گزر گئے، میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو پراسرار، اپنی وسعتوں میں بے پایاں اور طمانیت بخش نظر آ رہا تھا۔ میں پورے دس برس تک اپنی دعا کی خواہش سے لڑتا رہا تھا! مگر اب میں مزید نہیں لڑ سکتا تھا۔ میں نے جذبات کو بلا روک ٹوک ابھرنے دیا۔ ''اے خدا! اگر تو چاہتا ہے کہ میں ان سیڑھیوں سے نیچے اتر جاؤں تو اپنے کرم سے مجھے قوت بخش!''

میں منتظر رہا...... کچھ نہ ہوا! مجھے کچھ محسوس نہ ہوا! میں تو امید رکھتا تھا کہ زمین ہل جائے گی، روشنی کا کوئی کوندا مجھے گھیر لے گا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا......تو میں نے ۱۸۰ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے زینہ اترنا شروع کر دیا تھا...... میں نے دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھا اور دروازہ دھکیل کر کھول لیا۔

''کیا آپ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟'' کسی نے پوچھا، میں ان کی گفتگو میں مخل ہو گیا تھا وہ بائیں دیوار کے قریب میرے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور وہ قد و قامت میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک روایتی مشرقی لباس زیب تن کئے ہوئے تھا، سر پر سفید ٹوپی تھی۔ دوسرے کا لباس مغربی طرز کا تھا۔ میں ساری ریہرسل بھول گیا تھا۔ ''کیا عمر اور محمود یہاں ہیں؟'' میں پھر گھبرا رہا تھا۔ ''ان کے ناموں کا آخری حصہ کیا

Marfat.com

ہے؟'' ان دو میں سے ایک نے جس کے سر پر ٹوپی نہ تھی شک و شبے کی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''قندیل'' میں نے جواب دیا۔ یہ کافی نہ تھا۔

''سوائے ہمارے یہاں کوئی اور نہیں۔'' جواب ملا۔ یہ طریقہ تو کامیاب ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔ میں ضرور غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔'' میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

میں مڑنے لگا تو ٹوپی والے صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''آپ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟''

''ہاں ہاں! میں ضرور جاننا چاہوں گا۔'' اور یہ کہہ کر میں ان کی طرف بڑھا۔ ''آپ مہربانی فرما کر جوتے اتار دیجیے، ہم یہاں عبادت کرتے ہیں۔'' اس شخص نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ روایتی لباس میں ملبوس شخص تو باتیں کر رہا تھا جبکہ دوسرا معمول سے ہٹ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

ہم بائیں ہاتھ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میں اس طرح بیٹھا کہ میرا منہ دروازے کی طرف ہو اور کمر دیوار کی جانب۔ میری دائیں جانب ایک غسل خانہ تھا اور چھوٹا کمرہ خواتین کیلئے میری بائیں طرف تھا۔ سفید ٹوپی والا نوجوان طالب علم عبدالحنان تھا جس کا تعلق ملائیشیا سے تھا۔ دوسرا طالب علم محمد یوسف تھا جس کا وطن فلسطین تھا۔ میں نے انہیں جب اسلام کے متعلق اپنی معلومات کے بارے میں بتایا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ بیشک یہ خوشگوار حیرت تھی۔ ہم تقریباً پندرہ منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے چند سطحی سے سوالات بھی پوچھے مگر جو میں توقع رکھتا تھا معاملہ اس طرح نہیں تھا۔ عبدالحنان نے ان فرشتوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا جو کفار کی روحوں کو مارتے پیٹتے ہیں اور اس اذیت کا ذکر کیا جو انہیں قبروں میں دی جاتی ہے۔ میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں اس کی باتیں سن رہا ہوں۔ میں نے بہانہ بنایا کہ مجھے ایک گھنٹے کے لئے دفتر جانا ہے۔ ایسا نہیں تھا مگر اس طرح کا عذر قبول کر لیا جاتا ہے میں نے رخصت سے پہلے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے وقت دیا تھا۔

میں نکلنے ہی والا تھا کہ دروازے کی کنڈی میں حرکت ہوئی۔ سہ پہر ڈھلنے والی تھی اور سورج دروازے کے پیچھے سے نظر آرہا تھا۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی اس لئے دروازہ کھلتے ہی اندر آنے کے راستے سے روشنی کا ہلکا سا سیلاب امڈ آیا تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص کا ہیولا دکھائی دیا جس کی بڑی سی داڑھی تھی، ٹخنوں سے اوپر تک چغہ تھا، پاؤں میں سینڈل تھے، سر پر پگڑی اور ہاتھ میں عصا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ تھا جو کوہ سنائی سے واپس لوٹ رہے ہوں۔ شخصیت مسحور کن تھی اور کسی بائبلی کردار سے ملتی جلتی صورت تھی۔ مجھے رکنا پڑا۔ وہ مرد بزرگ خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور ایسا لگا جیسے انہوں نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے آنکھیں تقریباً بند کئے، سر ذرا سا اوپر اٹھائے وہ کوئی دعا مانگتے اندر داخل ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ اس کے سینے کے قریب تھے، ہتھیلیاں یوں اوپر کی جانب پھیلی ہوئی تھیں جیسے کسی شے میں سے اپنا حصہ وصول کرنے کا انتظار ہو۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس شخص نے محمد سے کوئی بات عربی میں پوچھی اور پھر بے تکلفانہ غسل خانے میں چلا گیا۔

''یہ بھائی غسان ہیں۔'' وہ پرامید تھے اور انہوں نے بات کو از سر نو شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے امام جو نماز پڑھاتے ہیں۔'' مجھے اپنے مطالعہ کی بنیاد پر یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کے ہاں سرکاری طور پر مقرر کردہ کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہوتا۔ محمد نے کہا:

''کوئی بھی امامت کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے، خواہ عبدالحنان ہو، میں خود یا کوئی اور۔'' تھوڑی دیر بعد غسان کمرہ میں آ گئے۔ وہ ہمارے قریب آئے تو انہوں نے اپنا سر بڑی انکساری کے ساتھ جھکایا ہوا تھا۔ رنگت صاف تھی، آنکھوں سے اور چہرے سے اطمینان ٹپک رہا تھا، سنجیدگی کا عنصر نمایاں تھا کچھ اداسی اور ویرانی سی بھی نظر آتی تھی جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے ذاتی حادثے سے گزرے ہیں۔ دونوں طلبہ نے ان کیلئے جگہ بنائی اور وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئے۔ میرے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا:

''آپ کا اسم گرامی؟'' وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس موقع پر مجھ سے میرا نام دریافت کیا تھا اور عبدالحنان و محمد کے برعکس وہ گفتگو کا آغاز روزمرہ کی عام باتوں سے کرنا چاہتے تھے تاکہ ماحول میں جو ایک تناؤ سا پیدا ہو چکا تھا وہ کم ہو سکے۔ میں نے ان کے اس رویے کو دل ہی دل میں بہت سراہا کہ انہوں نے مجھے پرسکون محسوس کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ گفتگو

Marfat.com

آہستہ آہستہ کر رہے تھے لیکن آواز میں ایک خاص قوت اور گونج شامل تھی جس نے ان کی باتوں میں ایک پراسرار تاثر اور مقناطیسیت پیدا کر دی تھی۔ لب و لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عرب ہیں۔ وہ کچھ کم آمیز سے لگتے تھے اور گفتگو کے دوران سیدھا میری آنکھوں میں دیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے تھے۔

''جیف لینگ۔''

''کیا آپ یو ایس ایف میں زیر تعلیم ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں اپنی عمر سے بہت چھوٹا لگتا تھا (شاید اسی لئے پہلے سمیسٹر میں مجھے طالب علم سمجھ کر مجھے اساتذہ کے اجلاس سے چلے جانے کیلئے کہا گیا تھا۔)

''نہیں، میں شعبہ ریاضی میں پروفیسر ہوں۔'' یہ سن کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کچھ دیر ہم گفتگو کرتے رہے پھر غسان نے بڑی نرمی سے مجھے کہا کہ انہیں عصر کی نماز ادا کرنی تھی اور یوں گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مسلمانوں کو باجماعت نماز ادا کرتے دیکھا۔ اس وقفے کے دوران میں نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر ستانے کی کوشش کی کیونکہ زیادہ دیر فرش پر بیٹھنے سے میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔

وہ نماز ادا کر چکے تو ہم پھر اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ غسان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بتائیے آپ میں اسلام کے بارے میں جاننے کی دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟'' میں حیران تھا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا غسان، قندیل کے خاندان سے واقف تھے۔

''میں اسلام کے بارے میں کچھ مطالعہ کرتا رہتا ہوں'' میں نے جواب دیا۔ بظاہر تو یہ جواب کافی تھا۔ ہم زیادہ تر ٹیکنیکل معاملات پر بحث کر رہے تھے لیکن ایک دوسرے کا نقطہ نظر صحیح صحیح سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے سوالات کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا اور غسان کے پاس تشریح اور توضیح کے لئے مواد کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں کو مایوسی ہوئی اور میں نے سوچا کہ اب مجھے شعبہ ریاضی میں واپس چلے جانا چاہئے۔

''کوئی اور سوال؟''

Marfat.com

''نہیں، اس وقت کوئی اور سوال ذہن میں نہیں آ رہا۔''

پھر دفعتاً میرے ذہن میں کوئی شے تڑاک سے ابھری۔

''میرے پاس پوچھنے کو ایک سوال ابھی باقی ہے۔'' میں نے کہا۔

پھر تھوڑی دیر میں سوچتا رہا کہ سوال کس طرح پیش کروں۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مسلمان ہونا کیسا لگتا ہے، یعنی آپ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان رشتہ وتعلق کیسا محسوس کرتے ہیں؟''

میں یہ دیکھ چکا تھا کہ غسان کو ایک انوکھا عطیہ الٰہی حاصل تھا، انہیں ایک الہامی اور وجدانی وصف سے نوازا گیا تھا جو کسی روحانی رہنما کیلئے بہت ضروری ہوتا ہے۔ مجھے آگے چل کر اس بات کا علم ہوا کہ امریکہ اور امریکہ سے باہر ان کے پیروکاروں اور معتقدین کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ محمود کی طرح یہ بھی فوراً آپ کے اندر چھپے ہوئے درد تک پہنچ جاتے تھے مگر فرق صرف اتنا تھا کہ محمود کے برعکس وہ آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آپ اس درد کو نظرانداز کر دیں۔ یہ تو آپ کے سامنے اسے کئی گنا بڑا کر کے رکھ دیتے اور پھر آپ کو اس بات پر مجبور کر دیتے تھے کہ لو اسے تم خود بھی دیکھ لو۔ یہ ایک غیر معمولی قوت ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ہر بڑے مذہبی رہنما کے پاس یہ قوت ضرور ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بہت بڑی ذمہ داریوں اور خطرات سے بھی تہی دست نہیں ہونا چاہئے۔ غسان کی نظریں میری نظروں سے ملیں اور انہوں نے فوراً میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے وہ سوال کے منبع و ماخذ اور اس کے مقصد ومنشا پر غور فرما رہے ہوں۔ انہوں نے یوں سر جھکا لیا جیسے کوئی دعا کر رہے ہوں یا اپنی روحانی قوت مجتمع کرنے کی کوشش میں ہوں۔ انہوں نے اپنے سر کو ادھر ادھر یوں جنبش دی جس طرح لوگ نفی اور انکار میں جواب دیتے ہوئے کرتے ہیں، پھر بولنا شروع کیا۔

پہلا لفظ جوان کی زبان سے نکلا وہ دعا بھی تھی اور پکار بھی ور وہ لفظ تھا ''اللہ'' ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور ''جو بہت بڑا ہے، جلیل ہے، بزرگ و برتر ہے!!! ہم اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، ہماری حیثیت تو ایک ریت کے ذرے سے بھی

Marfat.com

زیادہ نہیں'' جب ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تو ان کا انگوٹھا اور شہادت کی انگلی اکٹھے ہوئے اور انگوٹھے سے انگلی کو پورے زور سے دباتے ہوئے دہرایا، ایک ذرہ ریت جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ پھر انگوٹھے اور انگلی کو فرش کی جانب ڈھیلا چھوڑ کر جو اشارہ کرنا چاہتے تھے اسے مزید موثر بنا دیا۔

''اور پھر بھی وہ ذات بے ہمتا و لا ثانی ہم سے اتنی محبت کرتی ہے جتنی ایک ماں بھی اپنے بچے سے نہیں کرتی!''

سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں تقریباً بند تھیں اور وہ اپنے جذبات کو اپنی حالت میں لانے کیلئے ان سے لڑ رہے تھے۔ اس کے بعد جب تک انہوں نے اپنی بات مکمل نہیں کر لی مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ کسی روح کے تصرف میں ہوں جو خوف، امید اور خواہش و آرزو سے جل رہی ہو۔ اس کے بعد کا ہر جملہ جذبہ و جوش کی ایک لہر تھی جو اترنے کے بجائے چڑھتی ہی جا رہی تھی، تند و تیز اور تیز تر۔

''اور اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا! ہم سانس بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں لے سکتے'' انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ ''ہم سانس باہر نکالتے ہیں تو یہ بھی اس کی مرضی سے، ہمارا کوئی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھ سکتا۔ اس کا حکم نہ ہو تو ہمارا اُٹھا ہوا پاؤں زمین پر واپس نہیں پڑ سکتا۔ اور جب ہم عبادت کرتے ہیں اور اپنی ناک بندگی میں زمین پر رکھ دیتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے، اطمینان و سکون ملتا ہے ایک ایسی قوت و توانائی میسر آتی ہے جو صرف اس دنیا سے باہر ہی مل سکتی ہے اور اسے الفاظ یا زبان و بیان میں لانا کبھی ممکن ہی نہیں ہو۔ اسے جاننے، سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے تو آپ کو خود اس تجربے سے گزرنا ہوتا ہے۔''

پھر غسان کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے تا کہ الفاظ میرے اندر سرایت کر سکیں۔ مجھے کس قدر شدت سے یہ آرزو ہوئی کہ ہم دونوں جگہیں بدل لیں میں ان کی جگہ لے لوں اور وہ میری خواہ ایسا چند لمحوں کیلئے ہی کیوں نہ ہو تا کہ میں اس خواہش، اس جذبے، اس کرب، اس اضطراب و بے چینی، اس تڑپ سے روشناس ہو سکوں جو اپنے مالک و خالق، اپنے اللہ کی تمنا کیلئے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ میں اس طمانیت اور کرب، اعتماد و یقین اور ڈر سے واقف ہونا چاہتا تھا جو اس بے وقعتی اور حقیر و فقیر ہونے میں پوشیدہ تھی جہاں انسان کی ایک ہی آرزو رہ

جائے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اطاعت خداوندی قبول کر لے۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں اس روحانی موت سے حیات نو پا سکوں، دوبارہ جی اٹھوں!

"تو کیا خیال ہے آپ مسلمان ہونا پسند کریں گے؟" ان الفاظ سے ہوا میں ایک شدید دھما کہ ہوا جو میرے شعور و آگہی میں پورے زور سے پھٹا۔ میں نے سوچا، غسان نے ایسا کیوں کہا۔ میں اس مقصد کیلئے تو یہاں نہیں آیا تھا!۔ میں یہ بات اپنے خاندان، رفقاء اور دوستوں کو کیسے بتاؤں گا۔ میں ایک مسیحی یونیورسٹی میں کام کر رہا تھا۔ میری ملازمت کا کیا ہوگا؟ لوگوں کے چہرے اور آوازیں میرے ذہن میں ہجوم کر آئے۔ میری سابقہ بیوی، واقف کار، ان میں سے ایک دو تو مر بھی چکے تھے۔ میں اس کشاکش میں تھا کہ کون کون سا بہانہ کر سکوں گا۔ میں ایک بار پھر خوفزدہ تھا۔ میری کمر کا نچلا حصہ اور پیچھے سے میری گردن گرم ہوگئی تھی، میری ہتھیلیوں میں پسینہ آ گیا تھا۔ مگر اس شخص نے مجھ سے ایسا کیوں کہا۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ ہم اس بات کو یہیں ختم کر کے دونوں باہر کیوں نہ نکل جائیں؟ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس کا تو کچھ نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اپنا ہیجان اور بے چینی، کھٹکا، اپنے اندر کی وہ ساری ہلچل جس سے میرا سانس تک بند ہونے لگا تھا چھپا لوں۔ میں نے بڑی خاموشی اور سکون سے کہا:

"نہیں آج تو بالکل نہیں، دراصل مجھے کچھ سوالات ابھی اور پوچھنے ہیں" مجھے کس قدر امید تھی کہ معاملہ آج یہیں ختم ہو جائے گا۔ مجھے اپنے دفتر پہنچنا تھا اور میں یہاں کیا کر رہا تھا؟ میرا جسم شدید کھچاؤ اور اضطراب میں مبتلا تھا اور اگلے حملے کیلئے جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس بار مجھے زیادہ مضبوطی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ مگر میرا ایک حصہ بہت زور لگا رہا تھا کہ وہ دوبارہ اس کی زبان سے وہی الفاظ سنے۔ یوں لگا جیسے میں ٹٹول کر کسی شے کو تلاش کر رہا ہوں، اس تک پہنچنا چاہتا ہوں، استدلال کر رہا ہوں، کسی شے کی التجا کر رہا ہوں، دست سوال دراز کئے ہوئے ہوں اور کہہ رہا ہوں، "اب جب یہاں تک پہنچ چکا ہوں تو مجھے چھوڑ مت دیں۔" غسان اس طرح کے تجربے سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے، وہ آسانی سے ہار تھوڑی ماننے والے تھے۔ انہوں نے نہایت نرم لہجے میں ایک کوشش اور کی۔

"مگر میرے خیال میں آپ تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں، جو بات میں بتا چکا ہوں۔

Marfat.com

ایک کوشش آپ کر کیوں نہیں لیتے ؟'' وہ مجھ سے مخاطب تھے۔ آوازیں اور چہرے سب غائب ہو چکے تھے۔ مجھے اس قدر پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں کسی کا رہین منت نہیں تھا۔ نہ غسان کا، نہ اپنے دوستوں کا غرض کسی کا بھی نہیں۔ حتمی فیصلہ میں نے ہی کرنا تھا پھر مجھے اپنے والدین یاد آئے اور وہ تمام سبق یاد آئے جوانہوں نے مجھے اور میرے چار بھائیوں کو ''جرمن'' ہونے کے بارے میں سکھائے تھے۔ ہر کلچر کے اپنے ایسے ہی سبق ہوتے ہیں جن کے بارے میں اس کلچر کے لوگوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ ان کے ہیں۔ اور مجھے خاص طور پر ایک یاد تھا کہ اگر آپ کسی بات کو صحیح سمجھتے ہیں تو اسے اپنا لیجئے، یہ مت سوچئے کہ لوگ کیا کہیں گے ''اپنے جذبات کی پیروی کیا کرو''۔ میری ماں کہا کرتی تھیں۔ اس فلسفے پر میں نے پہلی بار اس وقت عمل کیا تھا جب میں نے انڈر گریجویٹ کورس کے اہم مضامین تبدیل کر لئے تھے۔ اس گزرے ہوئے زمانے میں نسبتاً یہ آسان بات تھی۔ میں نے غسان اور وہاں موجود تمام دوسرے افراد کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں، میرا خیال ہے کہ میں مسلمان ہونا پسند کروں گا'' خوشی و مسرت اور اطمینان سے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے چاند پر کامیابی سے اترنے کے بعد ناسا انجینئرز کے بارے میں یاد لایا۔ میں حیران تھا کہ یہ سب ہنگامہ خیزی یہ ہلچل کس لئے تھی۔ آپ سوچیں گے وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ کچھ بھی ہو میں سرکاری طور پر مسلمان نہیں ہوا تھا۔ مجھے ابھی ایمان لے آنے کا اعتراف اور اعلان کرنا تھا۔ کسی نے دروازے کا دستہ پھر گھمایا۔ دروازہ کھلا تو روشنی کے ایک ہالے میں لپٹی ایک اور شخصیت اندر داخل ہوئی ملکوتی صورت، جسم پر چغہ، سر پر پگڑی اور چہرہ خوبصورت ریش مبارک۔

یہ صاحب غسان کے مقابلے میں کچھ بڑے اور زیادہ بھاری بھرکم جسم کے مالک تھے۔

غسان نے آواز دی:

''مصطفیٰ! یہ بھائی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔''

مصطفیٰ کا بڑا اور باوقار چہرہ جو پدرانہ شفقت لئے ہوئے تھا (وہ برل اویس کی طرح نظر آیا) خوشی و مسرت سے روشن ہو گیا تھا۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آئے تا کہ مجھ سے بغلگیر ہو سکیں۔

''مصطفیٰ!'' غسان نے مخل ہوتے ہوئے کہا ''انہیں ابھی کلمہ شہادت پڑھنا باقی ہے۔''

Marfat.com

وہ یہ سن کر بہت احتیاط سے اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے گویا انہیں کوئی بہت نازک اور قیمتی شے نظر آ گئی تھی۔ لیکن غسان انہیں اس شرکت اور خوشی و مسرت میں ان کے حصے سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''بھائی نے جو کہنا ہے، وہ انہیں پڑھا دیں، مصطفیٰ'' غسان نے کہا۔ مصطفیٰ نے کلمۂ شہادت کی ریہرسل انگریزی میں کرائی تا کہ مجھے معلوم ہو کہ میں نے کیا کہنا تھا۔ ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی جیسے نوزائیدہ بچے سے مخاطب ہوں۔ پھرانہوں نے کلمہ شہادت عربی زبان میں ادا کیا، ایک ایک دو دو لفظ ایک وقت میں، جو میں ان کے پیچھے پیچھے دہراتا رہا۔

''اشہد'' مصطفیٰ نے کہا۔

''اشہد'' (میں تصدیق کرتا ہوں) میں نے دہرایا۔ میں بمشکل صحیح تلفظ ادا کر رہا تھا۔ ایک طرح سے نئے سرے سے باتیں کرنا سیکھ رہا تھا۔

''الا اللہ'' مصطفیٰ نے کہا۔

''الا اللہ'' (کوئی معبود نہیں) میں نے دہرایا۔

اس روز تک میری سن بلوغ کے بعد کی ساری زندگی اس حقیقت کے سیکھنے اور اس کی تصدیق میں گزری تھی۔ ''کوئی معبود نہیں'' پہلی بار یہ تعجب انگیز سچائی اس کے منطقی نتائج اور خلاء میرے علم میں آئے جو اللہ کو ماننے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔

''الا'' مصطفیٰ نے کہا۔

''الا'' (ماسوا) میں نے کہا۔

الا دراصل کسی ایسی چیز سے جوڑنے والا، مربوط کرنے والا لفظ ہے جو نظر انداز ہو گئی ہو۔

بظاہر یہ ایک بہت چھوٹا سا لفظ تھا جو میرے اور اس خلاء کو پر کرنے کے درمیان حائل رہا تھا۔ اتنا بڑا خلاء، جو میری زندگی تھا، جس نے مجھے اس سچائی سے دور رکھا تھا جسے میں ہمیشہ تلاش کرتا رہا۔

''اللہ'' مصطفیٰ نے کہا۔

''اللہ'' (معبود) میں نے دہرایا۔

یہ الفاظ صاف و شفاف پانی کی مانند تھے جو پیاس سے جاں بلب کسی شخص کے خشک حلق

Marfat.com

میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

ہر قطرہ سے مجھے نئی قوت وتوانائی حاصل ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ زندگی ہو رہا تھا۔

''واشہدان'' مصطفیٰ نے کہا۔

''واشہدان'' (اور میں تصدیق کرتا ہوں) میں نے دہرایا۔

چودہ سو سال پہلے دعوت دین دینے والے کی اتباع میں اپنا ہاتھ دے کر میں پیغمبروں اور ہر رنگ ونسل پر مشتمل پوری تاریخ کے پیغمبروں، کے ماننے والوں میں شامل ہو رہا تھا۔

''محمد ﷺ'' (محمد ﷺ) میں نے دہرایا۔ یہ محض کسی اعتراف تک محدود بات نہ تھی۔ یہ تو ایک ایسے دین میں شمولیت تھی، جو عالمی تھا اور جسے شرف زماں حاصل تھا، جس کی تبلیغ بنی نوع انسان کیلئے اولین پیغام لانے والوں کی زباں سے ہوئی تھی اور جو محمد ﷺ پر نزول کے ذریعے قرآن حکیم کی شکل میں محفوظ ہو گیا تھا۔

''رسول ﷺ'' مصطفیٰ نے کہا۔

''رسول ﷺ (پیغمبر ہیں) میں نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں کسی پناہ میں آ کر محفوظ اور آزاد ہو گیا ہوں۔ میں دوبارہ محبت و پیار کرسکتا تھا اور مجھے اس کی محبت حاصل تھی جو بے حد وحساب دینے والا ہے۔ میں باری تعالیٰ کی رحمتوں کے بحر بیکراں میں درماندہ و مضمحل گر چکا تھا۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا تھا!۔

''اللہ'' مصطفیٰ۔

''اللہ'' (معبود) میں نے دہرایا۔

دو روز بعد میں نماز جمعہ کیلئے گیا۔ مطلع صاف تھا اور سورج پوری آب وتاب کے ساتھ موسم گرما کے اس روز اپنی روشنی وتمازت پھیلا رہا تھا۔ سان فرانسسکو میں موسم گرما ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نماز جمعہ کے دوران دوسری رکعت میں تھا۔ غسان اپنی بے مثال، منفرد اور مخصوص قرأت کے ساتھ قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ قرآن حکیم کی تلاوت اکثر آہستہ آہستہ خوش الحانی کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر کی جاتی ہے مگر غسان حالت احتیاج کی گہرائیوں سے آواز نکال رہے تھے۔ وہ اس بچے کی مانند تھے جسے والدین چھوڑ گئے ہوں اور وہ انہیں پکار رہا ہو۔ وہ اپنی استدعا کو بڑی بے چینی اور اضطراب میں خوش الحانی کے ساتھ پیش کر رہے تھے۔ ہم ان کے

Marfat.com

پیچھے شانے سے شانہ ملائے، پاؤں سے پاؤں جوڑے صف آرا تھے۔ ''اللہ اکبر''! (اللہ سب سے بڑا ہے)۔ یہ آواز سنتے ہی ہم ہاتھوں کے بل اپنے گھٹنوں پر جھک گئے اور ہماری پیٹھ ہماری ٹانگوں سے عمودی تھی۔ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف یوں کی:

''سبحان ربی العظیم'' (پاک ہے میرا پروردگار عظمت والا)

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے یہاں لائے۔''

''سمیع اللہ لمن حمدہ'' (اللہ سنتا ہے جو اس کی خوبی بیان کرے)

ہم سب سیدھے کھڑے ہو گئے اور جواب دیا۔

''ربنا لک الحمد'' (اے ہمارے پروردگار تمام تعریف تیرے لئے ہے)۔

ہم صفوں میں یوں کھڑے تھے جیسے ہمارے درمیان ذرا سی بھی جگہ خالی نہ ہو اور ایک جسم واحد کی مانند حرکت کر رہے تھے۔ میں نے جمعرات کے روز چار نمازیں مسجد میں ادا کی تھیں لیکن ان نمازوں میں بہت زیادہ لوگ شریک نہ تھے۔ چھوٹے سے کمرے میں اسّی کے قریب نمازی تھے۔ دنیا بھر کے کم وبیش بیس ممالک کے نوجوان اخوت و بھائی چارے کا عملی نمونہ پیش کر رہے تھے۔

''اللہ اکبر'' (اللہ بہت بڑا ہے)۔

ہم پورے وقار اور خوش اسلوبی کے ساتھ فرش کی جانب جھکے، پہلے گھٹنوں پر، پھر دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر اپنے چہرے قالین پر رکھ دیئے۔ میں نے خاموشی کے ساتھ ''سبحان ربی الاعلیٰ'' (پاک ہے میرا پروردگار بڑی شان والا)۔ کئی بار دہرایا۔

''مجھے اپنے در سے کبھی دور نہ کرنا۔''

''اللہ اکبر'' (اللہ سب سے بڑا ہے)۔

پھر ہم اپنی ایڑیوں کے بل بیٹھ گئے۔ ہم نے غسان کے پیچھے صفیں بنا رکھی تھیں اور میں تیسری صف میں تھا۔ ''اللہ اکبر!'' ہم سجدے میں گر گئے تھے اور ہمارے منہ سرخ وسفید قالین کی جانب تھے۔ ہم پھر ایڑیوں پر بیٹھ گئے، مکمل سکوت تھا جیسے آواز کا بٹن کسی نے بند کر دیا ہو۔ میں نے سامنے دیکھا تو مجھے غسان اس کھڑکی کے نیچے درمیان میں مجھ سے کچھ دور بائیں طرف کھڑے نظر آئے، جس میں سے روشنی کا سیلاب امڈ کر کمرے میں آ رہا تھا۔ اپنی صف میں وہ

Marfat.com

اکیلے تھے۔ (کیونکہ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے) وہ لمبا سفید چغہ پہنے ہوئے تھے، سر پر سفید سکارف تھا جس میں سرخ ڈیزائن بنا ہوا تھا۔

''یہ تو وہی خواب ہے۔'' میرے اندر ایک چیخ بلند ہوئی۔ بالکل وہی خواب! میں تو اس خواب کو مکمل طور پر بھلا چکا تھا لیکن اس وقت میں حواس باختہ اور خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ کیا میں خواب سے بیدار ہوں گا؟ جو کچھ دکھائی دے رہا تھا میں نے اس پر نظر مرکوز کر لیں تا کہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ کیا میں سو رہا تھا۔ سردی کی ایک لہر میرے تن بدن سے گزر گئی اور میں کانپنے لگا تھا۔ میرے خدا! یہ تو حقیقت تھی، خواب نہیں تھا! پھر سردی میں کمی ہوتی گئی اور میرے اندر سے ایک نرم و گرم حرارت شعاعوں کی مانند پھوٹنے لگی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) نماز ادا ہو چکی تھی۔ میں قالین پر بیٹھا بھورے سفید رنگ کی دیوار کو بغور دیکھ رہا تھا، میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ خواب بہت عجیب ہوتے ہیں اور ابھی تک خوابوں کے بارے میں ہم بہت کچھ نہیں جانتے۔ تاہم ان کے پس پردہ جو بھی میکانکی عمل کارفرما ہے اس کے ذریعے مجھے اپنی زندگی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی دکھائی دی۔ جو کام میں نے کئے تھے وہ نظر آئے، وہ لوگ جن سے کبھی ملتا رہا تھا، سامنے تھے، زندگی میں حاصل ہونے والے مختلف مواقع، وہ انتخاب جو میں نے وقتاً فوقتاً کئے جو اس وقت بے معنی تھے سب سامنے آن کھڑے ہوئے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ یہی مجھے آج کی اس نماز تک لے آئے تھے اور وہ سجدہ جو بظاہر توہین و تذلیل کی علامت دکھائی دیتا تھا۔ عروج بخش رہا تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ خدا ہمیشہ نزدیک تھا، میری زندگی کو رہنمائی عطا کر رہا تھا، ایسے حالات اور مواقع فراہم کر رہا تھا جن میں سے انتخاب کا حق بھی مجھے حاصل تھا۔ گویا قطعی اور فیصلہ کن انتخاب ہمیشہ مجھے ہی کرنا تھا۔ اس سے جو محبت اور قربت ٹپکتی تھی وہ مجھے خوفزدہ کر رہی تھی، اس لئے نہیں کہ ہم محبت و دوستی کے حقدار ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ تو ہمیشہ موجود ہوتی ہے ہمیں تو صرف اس ذات کی طرف رجوع کر کے اس سے جھولیاں بھرنی ہوتی ہیں۔ میں

پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کشف کے کیا معنی ہیں لیکن مجھے تو اس میں دوستی اور مہربانی کی علامات نظر آ رہی تھیں، اور مجھے ایک نیا موقعہ مل رہا تھا۔

حاشیہ

۱۔ میں نے زیادہ تر عبداللہ یوسف علی کے ''دی ہولی قرآن'' سے متن، ترجمہ اور تفسیر کے لئے استفادہ کیا ہے۔ اسے از سرِ نو ۱۹۹۲ء میں نئے عنوان ''دی میننگ آف دی ہولی قرآن'' سے شائع کیا گیا تھا۔ اس نئے ایڈیشن میں ترجمے اور تفسیر و تشریح پر نظرِ ثانی کی گئی تھی۔

Marfat.com

دوسرا باب

قرآن حکیم

یہ ایک بہت بے باکانہ دعویٰ تھا کہ قرآن حکیم کا مطالعہ جس قدر پہلے کیا جاتا تھا اب اس سے کم نہیں کیا جاتا اور اس کے کبھی نہ بھولنے والے آہنگ نے انسانی دماغوں کو متاثر کرنے کی قوت بھی نہیں کھوئی۔ (۱)

۱۹۵۰ء میں یہ اندازہ ایک مستشرق گب نے لگایا تھا اور یہ آج بھی پہلے سے زیادہ صحیح ہے۔ قرآن بہت سے مسلمانوں کے ذہنوں میں مغرب کے چیلنج کو قبول کرتا اور اس سے بلند ہوتا دکھائی دیتا ہے اور ایک عالمگیر مسلم بیداری کے پس پردہ ایک قوت محرکہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ تقریباً ایک ارب ایمان لانے والوں کیلئے اس کی حیثیت آج بھی یہ ہے کہ "یہ انسان کے لئے اللہ کی حتمی مہربانی اور لطف و کرم کی شہادت ہے، حتمی دانائی اور اسلوب بیان کی حتمی شکل ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔" (۲) لیکن ایک مغربی نو مسلم کے بارے میں سوچئے جو ان ثقافتوں، روایات، زبانوں سے بہت دور ہے جنہیں اس صحیفے نے تشکیل پانے اور محفوظ رہنے میں مدد دی۔ کوئی مرد یا عورت یہ بات کہاں تک جانتے ہوں گے کہ قرآن کے لئے ناگزیر کشش کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی فوقیت کیا ہے؟ یہ کوئی ایسا ضروری اور واضح سوال نہیں۔ اس لئے کہ کسی بھی مذہب میں داخل ہونے والے اس صحیفے یا صحیفوں سے واقف نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر بدھ مت، ہندومت یا عیسائیت قبول کرنے والوں سے غالباً یہ سوال فوراً نہیں پوچھا جائیگا۔

مگر عملاً ہر مغربی نو مسلم مرد یا عورت، اپنی زندگی میں قرآن کی فوقیت کے بارے میں ضرور بات کرتے ہیں۔ درحقیقت ایک عام ایمان لانے والے کا قرآن پر اعتماد اور بھروسہ اسے مذہب سے پیوستہ رکھتا ہے کیونکہ دن بھر کی پانچ نمازوں میں قرآن کی عربی زبان میں تلاوت ضروری ہوتی ہے۔ اس وجہ سے تمام نو مسلم قرآن پاک کی بہت سی آیات اور اس کی تشریح اور ترجمہ بہت جلد یاد کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک سے ہر روز کا یہ رابطہ اس کے مطالعے کی مزید راہیں کھولتا ہے۔ اور بہت سے نو وارد بتاتے ہیں کہ وہ ہر روز عبادت اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد بھی قرآن کا کچھ حصہ ترجمے کے ساتھ ضرور پڑھتے ہیں۔ بہت سے تو عربی میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو امریکیوں کیلئے ہی خلاف معمول بات ہے۔ ان میں سے کچھ نے قرآن کی نئی تشریح و تصریح اور ترجمہ بھی کر لیا ہے۔ (۳) قرآن کیونکہ ایک مسلمان کی نجی اور مذہبی تجربے کا ایک لازمی جزو ہے اس لئے ہمیں اپنے ابتدائی سوال کے بہت سے جوابات ملیں گے تاہم ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ہمیں کچھ مروجہ جوابات بھی ملیں گے۔

حالانکہ اسلام مغربی دنیا میں بہت تیزی سے پھیل رہا ہے پھر بھی اس کی موجودگی ایک نئی شے تصور کی جاتی ہے۔ مغربی مسلم مصنفین کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے چند نامور اور مشہور یہ ہیں: محمد اسد۔ مارڈیوک پکھتال۔ مارٹن لنگز۔ مریم جملہ اور حامد الجار۔ (۴) آج بہت سے یورپی اور امریکی مسلمان اپنا دین دوسروں تک پھیلانے میں مصروف ہیں اور ہم نے بہت سے مغربی ادیب دیکھے ہیں جن کا رویہ اسلام کے بارے میں بڑا تائیدی ہے۔ (۵) وہ جب اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں تو ان میں بار بار دہرائے جانے والے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔

میں اس باب میں ان میں سے چند ایک کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے تجربے کی روشنی میں بیان کرنا چاہوں گا میں اس بحث و تمحیص کو بھی شامل کروں گا جو دوسروں سے بات چیت کے نتیجے میں سامنے آئی اور یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سب ٹکڑے یکجا ہو کر کس طرح قرآن پاک کا پیغام قبول کرنے کی سمت رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، میری کوشش یہ ہوگی کہ میں اسلام قبول کرنے کا مثالی نمونہ پیش کروں۔

وحی کی صورت میں نازل ہونے والی اس کتاب کو ساتویں صدی کے عربوں کے سامنے

Marfat.com

پیش کیا گیا تھا۔ جب ایک خطیبانہ تاثر لئے ہوئے ایک تحریر کو انہوں نے اپنی زبان میں سنا، تو انہیں اس کا اسلوب بے حد پر جلال اور پر شکوہ لگا، اس کی زبان اس قدر طاقتور تھی کہ قرآن کے الفاظ میں ایمان لانے والے بھی اس کے اثر کے بارے میں پکار اٹھے کہ یہ ''صریح جادوگری ہے۔''

اس عہد کے کسی عرب کو محاکات کا ترجمہ کرنے میں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی کیونکہ ان خیالی پیکروں کا تعلق خیالات کی ان اقسام سے تھا جنہیں وہ بیان کر سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو پہلے ہی ان سے شناسا تھا اور ان سے براہ راست واسطہ رکھتا تھا۔ (٦) جب قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اللہ سے کہیں کہ ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' (٦:١) ۔ یہ راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر اس نے انعام فرمایا ہے۔ تو مغربی قاری اسے سمجھ سکتا ہے کیونکہ یہ اللہ کی صحیح معنوں میں اطاعت کرنے والے اور اس کے برعکس کسی دوسرے انسان کے درمیان نازک اور لطیف فرق کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

یا وہ شاید یہ کہہ رہا ہو کہ مادیت اور روحانیت کے درمیان اس نازک توازن تک اس کی رہنمائی کی جائے۔ ساتویں صدی کے صحرائی مسافر میں بھی ہو سکتا ہے اس بارے میں اسی قدر سوجھ بوجھ ہو، وہ بھی اسی قدر فہم رکھتا ہو۔ لیکن اس کے سفر کے دوران اس بات نے اس کے اندر نفسیاتی اضطرار کی سی کیفیت ضرور پیدا کی ہوگی کیونکہ اس کے سفر میں اس ''سیدھے راستے'' کا علم تو جو کبھی کبھی فریب دے جاتا ہے اس کیلئے زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ لق و دق ریگستان میں سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا مسافر منزل سے دور اور موت کے قریب پہنچتا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مکہ عرب میں تجارت کا مرکز تھا اور قرآن پاک کے اس قسم کے حوالوں کا اس تجارتی زندگی سے بہت گہرا اور واضح تعلق تھا: میزان، تصفیہ، حسابات، قرضے، حشر کے روز انعام واکرام، اللہ کو قرض دینا جو کئی گنا بڑھا کر واپس دیا جائے گا اور اللہ نے مومنوں سے جو سودا کیا ہے، یہ سب اور قرآن پاک میں دوسری آسمانی کتابوں کے جو حوالے ملتے ہیں یہ حضور ﷺ کے عہد کی زندگی کے لئے اجنبی یا ناموزوں بالکل نہیں تھے۔ جب قرآن کفر کی حالت میں ریگستان میں پیاس سے مر جانے سے تقابل کرتا ہے یا یہ قیامت کے روز حیات بعد از ممات اور بارش کے بعد مردہ زمین میں نئی جان ڈال دینے کے درمیان

مماثلت پیش کرتا ہے، یا جنت کی پُرعیش زندگی کی تفصیل بیان کرتا ہے تو ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے لئے یہ محاکات کس قدر زندہ حقیقتیں دکھائی دیتی ہوں گی۔ جنہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب ملحد یا خدا اور کائنات کی اتباع کے علم سے انکار کرنے والے نہیں تھے۔ مگر وہ مذہب کے ساتھ بھی گہرا لگاؤ نہیں رکھتے تھے مذہب کے بارے میں ان کا رویہ کچھ ایسا ہی تھا جیسا آج کل بہت سے لوگوں کا ہے۔ مذہبی ایمان و یقین ایک بڑی روایت کا حصہ تھا، ایک کلچرل وابستگی تھی جو محدود وقت اور جگہ کیلئے تھی اور بوقت ضرورت اسے اختیار کیا جا سکتا تھا۔ تکنیکی اصطلاح میں انہیں بت پرست کہا جاتا تھا کیونکہ وہ کئی مافوق الفطرت معبودوں کو مانتے تھے، جن میں کسی فرد کی زندگی کو متاثر کرنے کی محدود سی اہلیت و صلاحیت ہوتی تھی۔ عربوں سے قرآن کا معاملہ یہ نہیں تھا کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ خدا کے بارے میں ان کے جھوٹے اعتقادات نے ان میں معصیت اور سیاہ کاری پیدا کر کے انہیں بدچلن بنا دیا تھا۔ قرآن ان کی اصلاح چاہتا تھا، انہیں تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر نقطہ آغاز سے شروع کر کے انہیں مکمل تحفظ فراہم کرنا چاہتا تھا، جو ان کے لئے مفید تھا اور جس پر ان کی زندگی کی بنیاد رکھنی مقصود تھی۔ مقصد یہ تھا کہ عرب مذہب کے بارے میں ایک نئے طریقے سے غور و فکر کریں، ایک نیا تصور اپنے اندر پیدا کریں، تاکہ اس دنیا کے ایک تصور سے دوسرے میں منتقل ہو جائیں۔ وہ تصور جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ عظیم اور بالاتر تھا۔ منتقلی کا یہ عمل روایت پرستی سے انانیت میں لے گیا، بے چینی، اضطراریت اور ہیجان سے نظم و اطاعت میں لے آیا، وہ نظریہ مافوق الفطرت سے سائنس و حکمت کی جانب آ گئے۔ وجدان والہام سے آگہی و شعور میں آ کر اس کی مدد سے منطق و دلیل کی بات کرتے تھے اور بالآخر ان سے مثالی ہم آہنگی پیدا کر لی گئی تھی۔

معاصر مغربی معاشرے میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ قدرتی ارتقاء کے نظریات ہوں یا اتفاقیہ ارتقائی عمل کی بات مذہب کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔ یہ عقیدہ زیادہ عام ہو گیا ہے کہ جدید نفسیات یہ بات ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ اقدار، روحانی رجحانات، نیکی اور اخلاقیات معاشرتی اور ارتقائی محرکات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے یہ ''حقیقی'' یا ''مکمل'' نہیں ہیں بلکہ صرف ''اضافی'' ہیں اور دراصل یہ ہمارے تخیل کی پیداوار ہیں۔ کسی سوال کے جواب کے طور پر خدا اب ضروری نہیں رہا کیونکہ سائنس اور منطق اب یہ مقصد پورا کر سکتی

Marfat.com

ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مغربی نو مسلم مرد یا عورت اپنے آپ کو اس راستے پر رواں دیکھتے ہیں جو کئی لحاظ سے اس راستے سے مخالف سمت میں جا رہا ہے جس پر آج سے چودہ سو سال قبل اولین مسلمان چلے تھے۔

مذہب کے بارے میں بہت سے رویے ایک جیسے ہیں مگر ان کی بنیاد یا اصل مختلف ہے۔ آج اسلام میں داخل ہونے کا مطلب اکثر انانیت سے روایت پرستی کی طرف، علمیت سے روشن خیالی کی جانب، شعور و آگہی اور باخبری سے ان دیکھی بے خبری کی سمت، عقل و استدلال سے وجدان و الہام کی طرف ہے اور آخر کار ان میں مثالی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

ابتدائی مشاہدات

دلیل و حجت کیلئے ایک چیلنج

زویمر انسٹی ٹیوٹ کے ڈڈلے وڈبری ایک تجربہ کار اور خداداد صلاحیت کے حامل ایسے مبلغ ہیں جو مسیحی تناظر میں بین المذہبی بحث و تمحیص کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کرسچین مشنریوں کو لیکچر دیتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا کہ مسلمانوں کے بارے میں پہلا تاثر یہ ملتا ہے کہ وہ مناظرے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ اس موضوع پر مناظرے کیلئے تیار ہو جائیں گے کہ خدا کا کلام قرآن ہے یا بائبل۔ عیسیٰؑ خدا ہیں یا انسان۔ یا بائبل میں آنحضرت ﷺ کی آمد کا ذکر ہے یا نہیں اور اسی طرح کے بہت سے موضوعات کو وہ بحث کیلئے چن لیتے ہیں۔ لیکن ڈڈلے نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر آپ مسلمانوں سے یہ کہیں کہ وہ ایمان کے بارے میں اپنے تجربے پر بحث و مناظرہ کریں تو وہ اکثر حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک مشہور مسلمان لیکچرار نے اسے لوگوں کے ایک اجتماع کے سامنے مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔ ڈڈلے نے جواب دیا کہ مناظرہ و مباحثہ تو اسے پسند نہیں تاہم اسے خوشی ہوگی اگر کسی عوامی مجمع کے سامنے وہ دونوں اپنے اپنے عقیدے اور ایمان کے تجربات ایک دوسرے کو بتائیں۔ اس قسم کے مقابلے سے چیلنج کرنے والے صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

Marfat.com

امریکیوں کیلئے عقیدے اور ایمان کا تجربہ مذہب کا ایک بنیادی نقطہ، توثیق اور مقصد ہوتا ہے۔ میرے لئے خدا کی تلاش وجستجو میں نہایت فیصلہ کن لمحہ وہ تھا جب ایک مسلم طالب علم لیڈر نے بڑے غور وخوض کے بعد مجھے بتایا کہ اس کیلئے مسلمان ہونے کے کیا معنی تھے۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں بھی یہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نقطہ نظر کے معنی یہ نہیں لینے چاہئیں کہ اللہ پر بے دلیل، بلاغور وفکر ایمان لے آنا چاہئے بلکہ زور تو جذبات اور روحانیت پر ہے۔ ''آپ کا عقیدہ و ایمان آپ کے ساتھ یا آپ کیلئے کیا کرتا ہے؟'' یہ ایک جائز اور مناسب سوال سہی مگر واحد سوال نہیں کیونکہ ایمان کی حیثیت کسی مشق سے زیادہ نہیں، جو مشق منطق اور معقول غور وفکر یا روحانی معرکے یا مجادلے کیلئے ہو۔ ان عناصر میں سے کسی ایک پر توجہ مرکوز کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی انسانیت کے ایک حصے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

بین المذاہبی مناظرے اور بحث ومباحثے کی جانب مسلمانوں کا میلان اور اسے ترجیح دینے کا عمل دو باتوں پر غور کرنے کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان مرد یا عورت کو اپنی زندگی کو ''مقدس'' اور ''سیکولر'' کے دو خانوں میں تقسیم کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس کی ساری زندگی ہی ایک مقدس تجربہ ہوتی ہے۔ جو اس حقیقت سے آشکارا ہے کہ نہایت دنیاوی کام بھی اسمائے ربانی کا بار بار ذکر کرنے اور اپنے معبود کو پکارنے سے متبرک اور مقدس بن جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کو یہ بات بہت رسمی سی دکھائی دیتی ہے لیکن مسلمان اسے موزوں اور قدرتی سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر خدا کا اثر ورسوخ ہماری زندگیوں پر مسلسل اثر پذیر رہتا ہے تو معاملہ اس کے برعکس کیوں کر ہوسکتا ہے۔ پس جب کبھی بھی کسی مسلمان مرد یا عورت سے یہ کہا جائے کہ وہ ایمان کے بارے میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ایسا مطالبہ کیا جارہا ہے جس سے وہ مرد یا عورت روشناس نہیں ہیں۔ اور ایسا سوچنا اور ایمان کا تجزیہ کرنا ایک طرح سے غیر اسلامی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مذہب کا کوئی مطلب اور مفہوم ہونا چاہئے اور اس کے تمام اجزائے ترکیبی میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی برہان ودلیل اور دانائی ہونی چاہئے۔ انسانی فکر کی سرحد ادراک کو محدود تصور کرتے ہوئے بھی وہ استدلال ومنطق کے کردار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس تقاضے کا منبع بلا شبہ قرآن ہے جو ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں ان عام

Marfat.com

تاثرات میں سے ایک پر بحث کرنے کیلئے لے جاتا ہے جو مسلمانوں کی اس آسمانی کتاب کے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔

ایک مرکزی قرآنی تصور یہ ہے کہ یہ استدلال و منطق یا دلیل و حجت کو بہت اہمیت دیتا ہے اور ایمان لانے سے پہلے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس بات کو دور جدید کے ہر مغربی مستشرق نے نوٹ کیا ہے۔ مثلاً راڈنسن لکھتا ہے۔(۷)

قرآن میں لفظ ''عقلہ'' پچاس بار آیا ہے جس کے معنی ہیں:

''خیالات کو یکجا کرو، استدلال سے کام لو، ذہانت اور عقل سے دی گئی دلیل کو سمجھو'' دلیل سے ذرا سا کام لے کر پھر ہم تیرہ مرتبہ ایسا کرنے سے باز رہتے ہیں:

افلاتعقلون

''تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے اور تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔''

(۲:۴۱۔۴۴ وغیرہ)

وہ کافر اور بے دین جو محمد ﷺ کی تبلیغ کو نہیں سمجھتے ان پر کلنک کا ٹیکہ لگاتے ہوئے انہیں ''ایسے لوگ قرار دیا گیا جو عقل سے عاری ہیں۔'' یہ وہ لوگ ہیں جو روزمرہ کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکتے کہ یہ وہ عقل و شعور نہیں رکھتے جس کی بنیاد پر وہ اپنی سوچ کا رخ بدل سکیں۔ اس معاملے میں یہ لوگ جانوروں سے کم نہیں۔ ایچ لیمنز نے لکھا کہ قرآن ''کفر کو انسانی ذہن کی بیماری تصور کرتا ہے۔''(۸)

قرآنی اصطلاح ''کافر'' جس کا ترجمہ اکثر ''ایمان نہ لانے والا'' کیا جاتا ہے اس کا ماخذ کافرا ہے جس کے معنی ہیں ''ڈھانپنا یا چھپانا'' قرآن میں اس کا استعمال یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا عام مطلب یہ ہے کہ وہ کسی خدائی انعام خدائی مہربانی یا سچائی کو چھپاتا ہے یا رد کرتا ہے خواہ وہ ایسا جان بوجھ کر کرے یا نادانستہ طور پر۔ ان لوگوں کا ذکر کرتے وقت قرآن تقریباً شک وشبے کے ساتھ پوچھتا ہے:

''کیا یہ لوگ زمین پر سفر نہیں کرتے تا کہ ان کے دل عقل و دانائی سیکھ سکیں؟'' (۲۲:۴۶) ''کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں جس میں

دیکھتے بھالتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا انجام کیا ہوا؟ (۹:۳۰)

''کیا وہ لوگ اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھتے۔''

''تو کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے؟'' (۱۷:۸۸)

''اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو؟'' (۶۳:۵۶)

ان سب کے پیچھے ایک ہی مقصد کارفرما ہے کہ اس پیغام کی سچائی کا ثبوت دوسری جگہوں کے علاوہ، تاریخ، کلچر، زمین، سیارے اور فطرت کے مطالعہ میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو دانا ہیں، اصحاب خبر و نظر اور اہل علم و بصیرت ہیں۔ جنہیں بصیرت اور سوچنے کی قوت عطا کی گئی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی ہی وحی جو ۹۶ ویں سورۃ کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل ہے اس بات پر زور دیتی ہے کہ علم حاصل کیا جائے اور پھر اسے ترقی کیلئے انسانی جستجو و تلاش کی خاطر دوسروں تک پہنچایا جائے۔

''آپ اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کریں جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ آپ قرآن پڑھا کریں اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا۔'' (۹۶:۱۔۵)

پس پیغمبر علیہ السلام کے ذریعے بنی نوع انسان کو باری تعالیٰ کا جو ارشاد ہوا اس کے بالکل لفظی معنی تھے۔ ''پڑھ۔'' اور ایسا کرنے کیلئے جس اہلیت و صلاحیت کا اعلان کیا گیا اور جو بہت بڑے عطیات خداوندی میں سے ایک تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسد فرماتے ہیں:

''قلم کو یہاں ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو لکھنے کے کام

آتا ہے یا مزید صحیح کہنا یہ ہوگا کہ جسے تمام علم کو تحریر کے ذریعے ریکارڈ کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ اس علامتی حکم کی تشریح کرتا ہے:

''پڑھ'' جو آیت ایک اور تین کے شروع میں آیا ہے۔ انسان میں ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور پہنچانا کس طرح ہے، تحریری ریکارڈ کے ذریعے خیالات کی وساطت سے، تجربات اور بصیرت کے توسط سے، ایک فرد سے دوسرے فرد تک، نسل در نسل اور ایک تہذیبی ماحول سے دوسرے تک۔ وہ یہ سب ایک اجتماعی کردار کے ذریعے تمام انسانی علم دوسروں کو بخشا جاتا ہے، اس اللہ کی عطا کردہ اہلیت کیلئے اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ہر انسان کسی نہ کسی طرح بنی نوع انسان کے مسلسل علم اکٹھا کرنے کے عمل میں شریک رہتا ہے انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ 'خدا سے سیکھتا ہے'' اور یہ ایسی چیزیں سیکھتا ہے جو ایک فرد از خود نہیں سیکھ سکتا۔ (انسان مکمل طور پر خدا کا دست نگر اور محتاج ہے جو اسے ایک حیاتیاتی وجود دے کر تخلیق کرتا ہے اور اس میں علم حاصل کرنے کی خواہش اور اہلیت پیدا کر دیتا ہے، اس پر دوہری تاکید کی گئی ہے اور آخری تاکید اس وقت کی گئی ہے جب یہ آئندہ تین آیات میں مذکور ہوا ہے)۔ (۹)

''سچ مچ آدمی حد سے نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے آپ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔ بے شک سب کو تیرے رب کی طرف لوٹنا ہوگا'' (۹۶:۶۔۸)

یہ آخری تین آیات جدید دور کے انسان کی صفت بیان کرتی ہیں، جو سائنسی کارناموں کی وجہ سے یہ سمجھنے لگا ہے کہ اسے اب خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ قرآن کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ ''تمام حدود سے تجاوز کر رہا ہے، قانون شکنی کر رہا ہے'' اسے اللہ نے عقل و ذہانت کا جو تحفہ عطا کیا ہے یہ اس کی بے قدری ہے۔ قرآن کا یہ دوہرا چیلنج ہے کہ کوئی شخص اپنے تمام مقام

ومرتبے کو قرآن کے عطا کردہ مرتبے کے مقابلے میں جانچے اور اس کی بنیاد استدلال، منطق معقولیت اور مسلمہ سچائیوں پر رکھی گئی ہو جو اس رویے کے مناسب معلوم ہوتی ہے اور مزید برآں یہ کہ اسے قبول کرنا ان تمام نومسلموں کے لئے پہلا قدم ہوگا جو آخر کار دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ مزید آگے چلنے سے قبل قرآن پاک کے تراجم اور اسلوب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قرآن کی تشریحات و تفسیر اور نمایاں خدوخال

جب کوئی مسلمان قرآن عربی میں پڑھتا ہے تو وہ بہت اعلیٰ و افضل خوبصورتی، ہم آہنگی اور دانائی دریافت کرتا ہے۔ بہت سے غیر مسلم قارئین جو قرآن کے تراجم پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں ہم آہنگی نہیں، یہ جوش و ولولہ نہیں پیدا کرتا، غیر متبرک ہے۔ اس قدر بنیادی خیالات میں فرق کا ایک ماخذ یہ ہے کہ موجودہ اور پہلے کے بہت سے مترجمین یا تو مغربی مستشرقین ہیں یا عربی کے وہ سکالر ہیں جنہوں نے عربی صرف ونحو پر دسترس حاصل کر لی ہو۔ لیکن بہت سے لوگوں کے لئے عربی کبھی زندہ زبان نہیں بن سکی تھی۔ اور سارے مسئلے کا ماخذ یہیں مل جاتا ہے کیونکہ یہ گرامر پر دسترس اور عربی ادب سے واقفیت ''مترجم کو زبان کی اس روح کے ساتھ، غیر مادی اور ناقابل احساس حد تک عمل اشتراک اور باہمی تعلق سے آزاد نہیں کرتی جو صرف اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب اس زبان کے ساتھ اور اس کے اندر رہنے کا موقعہ ملے''(۱۰)

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ (ماہرین لسانیات کی اصطلاح میں) قرآن کی عربی کو عرب جزیرہ نما کے بدوؤں نے صحیح صحیح سمجھ کر محفوظ کرلیا تھا جو نبی کریم کے عہد میں اور آپ ﷺ کے بعد صدیاں گزر جانے پر بھی جوں کا توں محفوظ ہے۔(۱۱)

وہ عرب مسلمان بھی جو اس روایتی معاشرے سے باہر پیدا ہوئے اس کتاب مقدس کی بہت سی آیات کو بمشکل سمجھتے ہیں اور یہ مشکل اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب قرآن پاک کو کسی غیر ملکی زبان میں پیش کیا جارہا ہو۔ قرآن کی جو تفسیر و تشریح اس نے کی ہے اس سے ان میں سے چند مشکلات پر قابو پانے میں کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے اور انگریزی بولنے والے

Marfat.com

مسلمانوں میں یوسف علی کا ترجمہ اور تفسیر غالباً سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو مارمڈیوک پکتھال کی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں، اس لئے یہ لفظاً عربی کے قریب ہوتی ہے۔ تاہم تمام مسلمانوں کیلئے قرآن اللہ کی طرف سے نازل کی گئی الہامی کتاب ہے۔ اس لئے دوسری زبان میں اس کا کوئی سا بھی ترجمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ گئی ہوگی اور حتمی تجزیہ یہ بنتا ہے کہ قرآن کا ترجمہ صرف اس کی تشریح ہوتی ہے۔

ایک قاری جس کا پس منظر یہودی یا مسیحی ہو، جیسا کہ زیادہ تر مغربی نومسلم اسی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں، ابتداء میں اسے قرآن کے تین اہم خدوخال سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ ان خدوخال سے کافی حد تک مختلف ہوتے ہیں جسے وہ آسمانی صحیفہ سمجھتا ہے۔ پہلا یہ کہ قرآن ایک فرد پر نازل ہونے والا الہام ہے، اس مفہوم میں کہ ان پہلی سات آیات سے باہر جن میں اللہ سے رہنمائی کی درخواست اور التجا شامل ہے قرآن کا تناظر ہمیشہ یہ ملتا ہے جس میں اللہ پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے۔

مثلاً: ''آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بالیقین خدا تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ واقعی وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔'' (۳۹:۵۳)

اور ''قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب قرار پکڑ لے کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا نہ دشمنی کی۔'' (۹۳:۱۔۳)

جب قرآن پڑھنے والے کو التجا سکھاتا ہے تو یہ اسے اکثر اس ہدایت کے ساتھ لفظاً ''کہہ'' استعمال کرتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

''آپ کہئے کہ میں پناہ مانگتا ہوں آدمیوں کے مالک کی'' (۱۱۴:۱)

بائبل کے برعکس قرآن پاک میں ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں سلسلہ واقعات کو تاریخ وار بیان نہیں کیا گیا جبکہ بائبل میں تاریخ اور بائیوگرافی (سوانح نگاری) ہے۔

Marfat.com

عملاً یہ ممکن نہیں کہ باہر کے ماخذات کا حوالہ دیئے بغیر قرآنی آیات کی تاریخ اور مقام کا تعین کیا جا سکے۔ قرآن کو تقریباً کسی بھی ترتیب سے پڑھا جا سکتا ہے اور اسے مکمل طور پر نہ پڑھ لیا جائے تب بھی اہم وعظ و نصیحت اور احکام الٰہی کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملاً قرآن کا کوئی باقاعدہ آغاز یا اختتام نہیں ہے۔ مسلمانوں کیلئے یہ ایک بڑی برمحل اور مناسب علامت ہے کہ قرآن کا پیغام زمان و مکان کی حدود سے بلند تر ہے اور یہ کائنات کی سرحدوں سے بھی آگے تک اللہ کے علم اور دانائی میں موجود تھا۔

اسلام حقیقت کو ''مقدس'' اور ''سیکولر'' میں تقسیم نہیں کرتا قرآن انسانی تجزیے کے متنوع پہلوؤں کو اپنے پورے بیان میں باہم جوڑ دیتا ہے۔ قوموں اور افراد کا عروج و زوال، فطرت کی پابندی، معاشرے اور قانون کی تشکیل، انسانی نفسیات سبھی موضوعات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کی اس کی حیات ارضی میں رہنمائی کی جا سکے اور اس مرد یا عورت کو اللہ کے وجود اور وحدانیت کی سمت سرگرم عمل کیا جا سکے۔ زندگی نام ہے عناصر کے ظہور ترتیب کا اور قرآن میں بھی اسی بات کا تذکرہ ملتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تمام تاریخ، زندگی اور تخلیق اس کی گواہ ہے اور ایک واحد ذات عظیم و برتر سے کلی میل اور تقارب کی آرزومند ہے: اور اللہ اس سب کا منتظم، پرورش کرنے والا، اور مالک و آقا ہے۔ یہ دوسرے تمام بڑے مذاہب کے صحیفوں سے ایک بڑا انحراف ہے۔

عہد نامہ ہائے قدیم و جدید سے مماثلت

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہر قوم کو کسی خدا رسیدہ انسان کے ذریعے یہی ضروری پیغام موصول ہوا کہ انسان کو اپنی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع کر دینی چاہئے۔ مذہبی رسومات اور شریعت میں فرق تھا اور ایسا مختلف انسانی برادریوں کے ہنگامی حالات کے مطابق تھا لیکن بنی نوع انسان کی ترقی، اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ بغیر کسی تبدیلی کے اس آفاقی رہنمائی کو قبول کرنے اور اسے محفوظ کر لینے کیلئے تیار رہیں گے۔ وہ آفاقی رہنمائی ہے قرآن۔ جو نبی آخر الزمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی صورت میں

Marfat.com

نازل ہوا۔ بانی قبیلہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام (مکہ کا قبیلہ قریش، جس قبیلے سے محمد ﷺ تھے اور جسے ناز تھا کہ اس کا سلسلۂ نسب پیغمبر اسماعیل علیہ السلام سے ملتا ہے) قرآن کے مطابق ایک وعدۂ خداوندی کی تکمیل ہے اور یہ وہ نبی ہیں جن کا مدت سے انتظار کیا جارہا تھا جو موسیٰ علیہ السلام تک عبرانیوں کے بھائیوں میں سے ہوں گے۔ (عہدنامہ قدیم کی پہلی کتاب (۱۲:۲-۳)(۱۲)

قرآن حضرت محمد ﷺ کے مشن کو آپؐ سے پہلے آنے والے ہر نبی کے مشن کا نقطہ عروج اور تکمیل قرار دیتا ہے۔ اور ایسا کرتے وقت ان کی زندگیوں کے ضمنی واقعات بیان کرتا ہے۔ جب یہ ان پیغمبروں کا ذکر کرتا ہے جو جزیرہ نما عرب کے رہنے والے تھے اور دوسرے وہ جن کی اپنی اور جن کے ملکوں کی شناخت نہیں ہوسکی ان میں سے اکثر بائبل میں مل جاتے ہیں۔ اس کا بظاہر ایک سبب تو یہ ہے کہ ان میں اکثر جن میں محمد ﷺ بھی شامل ہیں کے آباؤ اجداد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے۔ یہ زیادہ اہم بات اس لئے ہے کیونکہ قرآن بائبل میں مذکور بہت سے پیغمبروں کے بارے میں محدود شناسائی تسلیم کرتا ہے۔ ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ ان کی کہانیاں عربوں کو معلوم تھیں اور یہ بات بھی کم وبیش پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ان کو بھی جانتے تھے جن میں سے بہت سے وہ عیسائی تھے جنہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے فوراً بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اس لئے یہ داستانیں اور قصے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے نہایت مؤثر ذرائع تھے۔

حال ہی میں امریکی یونیورسٹیوں کے مسلم طلبہ کے گروپوں نے اس موضوع پر کہ ''بائبل اور قرآن میں سے اللہ کا کلام کون سا ہے؟'' بہت سے مباحثوں کا اہتمام کیا ہے۔ مسلمانوں کا مؤقف یہ رہا ہے کہ چونکہ عہد نامہ قدیم اور جدید میں شامل بیانات میں تضادات ہیں (زیادہ تر یہ عددی نوعیت کے ہیں) اور وہ مسلمہ حقائق کے خلاف ہیں اس لئے بائبل الہامی صحیفہ نہیں ہوسکتی۔ جس ثبوت کا سہارا لیا گیا ہے وہ کم وبیش مکمل طور پر صدیوں پرانے مغربی بائبلی علم وفضل کی پیداوار ہے۔

شرکت کرنے والے بہت سے عیسائی اس تمہید کو تسلیم کرنے کیلئے رضا مند ہیں مگر نتیجے سے انہیں اتفاق نہیں، اس لئے کہ ہر فریق کے ذہن میں وحی کا ایک جداگانہ تصور ہے۔ جب

Marfat.com

ایک مسلمان وحی کا ذکر کرتا ہے تو وہ عموماً نہایت ہی براہ راست سی قسم کی طرف اشارہ کررہا ہوتا ہے: پیغمبر تو ایک انسانی وسیلہ ہیں جن کے ذریعے اللہ لفظی مفہوم کے مطابق ''بولتا ہے'' یا اپنی مرضی ومنشا ظاہر کرتا ہے جیسا کہ بائبل میں بیان ہوتا ہے: ''میں ان ہی بھائیوں میں سے ایک نبی مبعوث کردوں گا، تیری طرح کا اور میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈال دوں گا اور پھر اس سے وہ سب کچھ کہوں گا جو بطور حکم مجھے کہنا ہوگا۔ اور وہ پھر جب سچائی کی روح کی شکل میں آجائے گا تو وہ ہر طرح کی سچائی کی جانب تیری رہنمائی فرمائے گا: کیونکہ وہ پھر اپنے بارے میں نہیں بولے گا بلکہ جو کچھ وہ سُنے گا وہ وہی کچھ کہے گا۔ اور وہ تمہیں آنے والی چیزیں دکھائے گا۔'' مسلمان اس کا اعتراف تو کرتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ یہی صرف ایک قسم نہیں خدائی گفتگو کی۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

> ''اور کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرما دے مگر یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتے کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے۔'' (۴۲:۵۱)

آج کل مسیحی سکالروں کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ بائبل مختلف سطح کے مقدس الہام و وجدان کی تالیف پر مشتمل ہے۔ بوکائی لکھتا ہے:

وحی کے متن کا یہ تصور کہ اسے من وعن تسلیم کر لیا جائے اور اس پر ایک جملہ بھی سوال کے طور پر نہ پوچھا جائے ایک ایسا معاملہ تھا جس نے اس خیال کے لئے راستہ ہموار کیا کہ یہ ایسا متن ہے جو اللہ نے الہامی شکل میں ابھارا ہے، اس الہام و وجدان کو مختلف فانی انسانوں نے مختلف موقعوں پر قلمبند کیا۔ اس نے اپنے دور کے تصورات سے متاثر ہوکر اس وقت کی روایات، داستانوں اور مروجہ توہمات وضعیف الاعتقادی کو بھی شامل کر لیا تھا جب یہ لکھی جارہی تھی۔ (۱۳)

عہد نامہ جدید کے بارے میں کریگ لکھتا ہے:

> گو انجیل میں بلا شبہ جو کچھ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا وہ لفظ بہ لفظ موجود ہے، بہت سی جگہیں ایسی ہیں (لیکن سینٹ جان میں ایسا کہیں بھی

Marfat.com

نہیں) جہاں احیائے مذہب کا حامی ناقابل فہم و ادراک باتیں اپنے تحریری مواد میں شامل کر جاتا ہے۔ تدوین اور اختصار دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں انتخاب، تخلیق مکرر اور شہادت سبھی کچھ شامل ہے۔ انجیل مقدس کی ساری جلدیں اپنے اپنے مصنفین کے ذہنوں سے گزر کر آئی ہیں۔ یہ تجربہ کی بنیاد پر بیان کی جانے والی تاریخ ہے جسے اس تجربے نے جنم دیا۔ اسے خصوصی امتیاز اور واضح موزونیت کے طور پر لیا جانا چاہئے۔ (۱۴)

اور عہد نامہ قدیم خصوصاً مقدس گیتوں کے بارے میں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ اپنی اس مجموعی شہادت میں کہ انسانی زندگی میں خدا کے معنی کیا ہیں۔ بجنسہ اس سچائی کی اہمیت کو دوسروں تک پہنچاتی ہیں کہ خدا نے یہ چاہا کہ انسان سمجھ لیں۔ یہ جو کچھ خدا کے بارے میں جانتے ہیں اس حوالے سے جب یہ اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو خدا ان معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور ان میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ یا یہ کہئے کہ ظہور میں لانے کا یہ عمل ان خاص خاص انسانوں کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو وابستہ کر لیتا ہے اور وہ ان صلاحیتوں کے ذریعے دوسرے تمام انسانوں کے ذہنوں اور روحوں سے خطاب کرتا ہے۔ (۱۵)

مسیحی تناظر سے عدم مطابقت اور تضادات کی جو نوعیت اوپر بیان کی گئی ہے اس کی توقع کی جانی چاہئے اس لئے کہ یہ ایک بلا واسطہ الہامی و وجدانی تجربے کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ اس صورتحال کی جانچ پڑتال مشکل ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا چاہئے لیکن دونوں فریقین کو اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ کسی صحیفے کی تقدیس کی جانچ پڑتال کا اصل پیمانہ اس کی اثر انگیزی ہوتی ہے جو انسانوں کے دلوں کا رخ ایک خدا کی جانب موڑتی ہے، ان کی حفاظت، اصلاح اور رہنمائی کرتی ہے۔

اس بحث و تمحیص تک عام مسیحی رسائی یہ بتانے کیلئے ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) زیادہ تر سرقہ کیا ہے اور اسلام آپ ﷺ کے اپنے ذہن کی اختراع و ایجاد ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنے دور کے مروجہ مذہبی اور نظریاتی دھاروں سے مدد لی۔ آج جب کہ یہ نقطہ نظر

Marfat.com

تو معاصر مستشرقین میں اپنی وقعت کھو بیٹھا ہے۔ (۱۶) سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ درحقیقت ہر وہ دلیل جو مسیحی، اسلام کے خلاف استعمال کرتے تھے زیادہ شدومد اور مؤثر طریقے سے مسیحیت کے خلاف استعمال کی جاسکتی ہے۔

ان مخالفتوں اور مقابلوں سے ایک مثبت تاثر یہ ابھرتا ہے کہ یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ قرآن میں تو درحقیقت کہیں عدم مطابقت ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں استعارات، داستانوں اور تمثیلی قصوں کا ذکر نہیں کیونکہ اس میں تو ان سب کا ذکر ہے لیکن اس قسم کے تضادات جن سے مسیحی سکالرز کو بائبل کی الہامی حیثیت منوانے کیلئے اپنی پوزیشن ازسرنو مضبوط بنانے میں مدد ملی ہو بہت مشکل سے نظر آئیں گے۔ بلکہ ایک مسلمان تو یہی کہے گا کہ ایسا ناممکن ہے۔ قرآن میں ایسی عدم مطابقت سرے سے مل ہی نہیں سکتی۔ (۱۷) مسلمان کا قرآن کی معصومیت کے نظریے کا قائل ہونا پرخطر ہے کہ وہ اس میں انتہاء پسند ہے اور اگر وہ اس بارے میں زیادہ معتدل حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کی جذباتی برانگیختگی کم ہوجاتی ہے، خود قرآن اسے نظریہ بدلنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔

> ''تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف ہوتا۔'' (۴:۸۲)

شعبہ مطالعہ ادیان کے ایک رفیق کار نے قرآن پاک میں خیالات کی ہم آہنگی دیکھ کر اسے محمد ﷺ کی غیرمعمولی ذہانت کا ثبوت ٹھہرایا جنہوں نے اس کے خیال میں بائبل کو ''مکمل'' کیا۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ چونکہ محمد ﷺ نے یہودی اور مسیحی ماخذ سے استفادہ کیا اس لئے ان میں اتنی بصیرت تھی کہ انہوں نے بلحاظ مقدار تفاصیل کو شامل نہیں کیا۔ مثلاً زمان ومکان اور تعداد کے حوالہ جات جس سے مستقبل میں کسی بھی موقعہ پر تضادات ظاہر ہوسکتے تھے۔

اول تو اس بات کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ قرآن چند تفصیلات کو حذف کرنے کے بعد محض بائبل کی حکایات کو دوبارہ بیان نہیں کرتا۔ تقریباً ہر نظیر یا مماثلت کے بیان میں اہم اور بعض اوقات نازک اختلافی باتیں ملتی ہیں مثلاً قرآن میں جو قصہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیان کیا

Marfat.com

گیا ہے جنہیں اللہ نے چن کر تمام عمر رہنمائی بخشی وہ بتوں کے پجاری کیسے بن سکتے تھے اور قرآن حضرت سلیمان علیہ السلام پر لگائے جانے والے اس الزام کو صاف رد کر دیتا ہے۔ بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کی اپنے بیٹے کی قربانی دینے کا ذکر ہے۔ خدا براہ راست ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر انہیں اپنے بیٹے اسحاق کی قربانی دینے کا حکم دیتا ہے، اور بیٹا اپنے باپ کے عزائم سے بے خبر ہے۔ مگر قرآن میں اس خواب کا ذکر ہے جو ابراہیمؑ دیکھتے ہیں اور اسی بنیاد پر یہ پورا قصہ آگے بڑھتا ہے، بیٹا جس کی شناخت خواب میں نہیں کرائی جاتی اپنی مرضی سے اپنی جان کی قربانی دینے پر رضا مند ہو جاتا ہے اور پھر خدا اسے خود محفوظ رکھتا ہے۔ (اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی ایک دوسری صورت پیدا فرما دیتا ہے) (۱۸) سب سے زیادہ نازک اختلافات میں سے ایک اختلاف یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جہاں قرآن اور بائبل میں مماثل قصے بیان کئے ہیں وہاں قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کبھی مصلوب نہیں ہوئے۔

لیکن زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اکثر بائبل میں بیان کردہ ان قصوں کی تصحیح کی ہے جو محمد ﷺ کے دور کے صدیوں بعد مغربی سکالرز کی نظروں میں مشکوک تھے اور جن پر تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ (۱۹) حضرت یوسف کا جو قصہ بائبل میں بیان کیا گیا ہے اس میں حضرت یعقوبؑ کے بیٹے صحرائے سنائی کا طویل سفر گدھوں کی پیٹھ پر کرتے ہیں (عہد نامہ قدیم ۴۲: ۲۶) جبکہ اول تو اتنے وسیع و عریض صحرا کے سفر کیلئے گدھے بالکل ناموزوں ہیں اور دوسرے یہ کہ خانہ بدوشوں کے طرز زندگی کے بالکل خلاف بات ہے اور اس وقت تک ایسا ہی رہا جب تک ابراہیمؑ کی اولاد مصر میں آباد نہ ہو گئی۔ قرآن پاک میں ان کے سفر کا ذکر جہاں آتا ہے وہاں اونٹوں کا بیان ہوا ہے۔ (۱۲: ۶۵) اسی قصے میں بائبل کے حوالے سے مصریوں اور عبرانیوں کے درمیان ایک دشمنی پیدا ہو جانے کی توقع بھی کی گئی ہے جو بہت عرصے تک پیدا نہ ہوئی مثلاً یوسف کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے کیونکہ ہو سکتا ہے مصری عبرانیوں کے ساتھ بیٹھ کر روٹی نہ کھائیں اور اس میں مصریوں کی نفرت و حقارت شامل تھی ایسا تاریخی سہو قرآن میں نہیں ملتا اور قرآن میں حضرت یعقوبؑ کے خاندان والوں کے لئے مصریوں کا خاص تعصب مذکور نہیں۔ (۱۲: ۵۸-۹۳)

طوفان نوح کے وقت زمین پر موجود ہر جاندار کو تباہ کر دیا گیا تھا، انسان، جانور، رینگنے

والے کیڑے مکوڑے اور فضاء میں اڑنے والے پرندے۔ ان سب کا زمین پر نام ونشان نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ صرف حضرت نوح زندہ بچے تھے اور وہ جو کشتی میں ان کے ہمراہ سوار تھے۔ (عہد نامہ قدیم ۷: ۲۳) بائبل کے پرانے نسخوں میں جو تاریخ وار اعداد وشمار دیئے گئے ہیں اس کے مطابق یہ طوفان بائیسویں صدی قبل مسیح سے پہلے نہیں آنا چاہئے تھا۔ (۲۰) لیکن سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس عہد سے لے کر آج تک خطہ زمین پر بہت سی تہذیبیں آباد رہی ہیں اور یوں بائبل میں بیان کئے جانے والے طوفان نوح کی تردید ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اس طوفان کا تعلق ہے قرآن پاک بتاتا ہے کہ صرف قوم نوح تباہ ہوئی تھی۔ اور یہ بات ہمارے آج کے علم سے کسی طرح بھی متصادم نہیں ہوتی۔ (۲۵: ۳۷)

دو صحیفوں میں ایک اور نہایت حیران کن تضاد اس جگہ ملتا ہے، جہاں ایام تخلیق کائنات کا ذکر ہے عہد نامہ قدیم کے مطابق یہ مختلف مراحل یا ادوار تھے جو اس زمین کو تخلیق کرنے میں لگے اور ہر عہد یا دن چوبیس گھنٹے کا تھا۔ جیسا کہ ہم سب سمجھتے ہیں اور ہر بعد کے مرحلے کی تکمیل کے بعد اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور پہلے دن کی شام اور صبح (دوسری، تیسری وغیرہ) (عہد نامہ قدیم ا: ۵، ۸، ۱۳، ۱۹) بے شک کئی صدیوں تک یہی کچھ سمجھا جاتا رہا یہاں تک کہ ہم نے یہ دریافت کر لیا کہ اس زمین کے بنائے جانے میں زیادہ لمبا عرصہ لگا۔ قرآن پاک میں جہاں زمین کی تخلیق کا ذکر آیا ہے اور یہ ''ایام'' مذکور ہوئے ہیں ہمیں ایک ایسا مفہوم ملتا ہے جس میں پورا جواز شامل ہے: ''اس دور کا ایک دن تمہارے اعداد وشمار اور گنتی کے لحاظ سے ایک ہزار سال کے برابر ہے (۳۲: ۵) اس سے دو حقائق سامنے آتے ہیں۔ (الف) کہ ان دنوں کو دنیاوی زمانے کے پیمانے سے نہ ماپا جائے بلکہ یہ وقت کے زیادہ طویل وقفوں پر مشتمل ہیں۔ (ب) اور جب قرآن میں لفظ ''دن'' استعمال ہوتا ہے اور اللہ کی خلاقی کی جانب اشارہ ہوتا ہے تو اسے وقت کا کوئی مقرر حصہ نہیں سمجھ لینا چاہئے جیسا کہ ایک آیت میں آتا ہے۔ ''اس کے ایک دن کا عرصہ پچاس ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے'' (۷۰: ۴) کبھی کبھی کسی پیغمبر کا قصہ بیان کرتے وقت قرآن ایسی تفصیل شامل کرتا ہے جو بائبل میں نہیں ملتی اور پھر اس بات پر توجہ دیں کہ اللہ نے اسے (فرد، قوم یا واقعہ کو) آنے والے زمانوں کے لئے ایک ''نشانی'' بنا دیا۔ طوفان نوح کا بھی جو ذکر مختصراً اوپر ہوا ہے اس میں یہی کچھ ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے واقعہ میں ملتی ہے:

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔ پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادے سے (دریا میں) چلا یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں جواب دیا گیا اب ایمان لاتا ہے اور پہلے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا سو آج ہم تیری لاش کو نجات دیں گے تاکہ تو ان کیلئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے آدمی ہماری عبرتوں سے غافل ہیں۔''
(۱۰:۹۰-۹۲)

آیت نمبر۹۲ میں ایک آگاہی طلب حوالہ دیا گیا ہے جہاں فرعون کے جسم کو بعد میں آنے والے زمانوں کے لوگوں کیلئے ایک نشانی کے طور پر محفوظ کر لیا گیا۔ اس فرعون کی شناخت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مصر سے انخلاء کے وقت ان کا پیچھا کر رہا تھا ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سی قیاس آرائیاں اور غور و فکر ہوا ہے۔ بوکائی وسیع مطالعہ اور تحقیق کے بعد اس نقطہ نظر کی پرزور حمایت کرتا ہے کہ رامسس دوئم کا جانشین مرنفتاح ہی وہ فرعون ہے جو حضرت موسیٰؑ کے مصر چھوڑتے وقت موجود تھا۔ ۱۹۷۵ء میں اس فرعون کی حنوط شدہ لاش پر بوکائی نے ایک میڈیکل ٹیسٹ بھی کیا تھا اور یہ وہ لاش تھی جو ۱۸۹۸ء میں کنگز ویلی میں دریائے نیل کے دونوں کناروں (۲۱) پر آباد شہر تھیبیس میں دریافت ہوئی تھی۔ بوکائی کا قیاس یہ ہے کہ یہ ایک اشارہ ہے اس دریافت کی جانب جو اس آیت کے نزول کے تقریباً تیرہ سو سال بعد واقع ہوئی۔ قرآن میں چونکہ فرعون کی اصل شناخت کبھی نہیں بتائی گئی اس لئے ممکن ہے ''فرعون'' کسی نسل کا لقب ہو اور یہ مصریوں کی جانب سے اپنے بادشاہوں کے مردہ جسموں کو حنوط کرنے کے رواج کی جانب اشارہ ہو جو بھی اصل حقیقت ہو، ان کیلئے جو قرآن کو مانتے ہیں فرعونوں کی محفوظ شدہ لاشیں اس نشانی کی ایک اور تصدیق بنتی ہے جس کی سچائی کا دعویٰ قرآن کرتا ہے۔

قرآن اور سائنس

وہ موضوع جو پچھلی دو دہائیوں میں مغربی دنیا میں مسلم مقررین کی زیادہ توجہ حاصل کرتا رہا ہے وہ ہے جدید سائنسی دریافتوں کا قرآنی حوالوں سے تقابلی جائزہ۔ دو غیر مسلم سائنس دانوں، بوکائی (۲۲) اور (کسی حد تک) مور (۲۳) کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے تاہم یہ موضوع مسلم مصنفین کے لئے بیسویں صدی کے آغاز سے ہی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مسلم مذہبی سکالر اس موضوع کے بارے میں قدرے محتاط رہتے ہیں۔ اس کی ایک جزوی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی جدید سائنس کی تعلیم بہت کم ہے اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان کی دلچسپی مدافعانہ ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآن تو بار بار ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ ہم فطرت کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کریں کیونکہ یہ خدا کے احسان اور حکمت و دانائی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سائنس کی کسی نصابی کتاب سے بالکل مختلف کتاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دنیائے اسلام کے بہت سے مسلم سکالر شوآن کے ساتھ متفق ہوں گے کہ خدا کا اصل مقصد ''بچانا'' ہے، سکھانا اور تعلیم دینا نہیں اور خدا کی اصل دلچسپی دانائی اور ابدیت کے ساتھ ہے، ظاہری علم سے نہیں اور اس سے بھی کم تر انسانی تجسس کی تسلی و تشفی سے (۲۴)۔ اس انتباہ کو قبول کرلیا جائے تو ہم اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ فطرت کے کاموں کے بارے میں یہ سارے حوالے موجود ہیں اور وہ تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن کے نقطہ نظر سے اس کی خدائی ابتداء کی نشانیوں اور ثبوتوں پر غور وفکر کیا جائے۔

اس انتباہ کی ایک اور وجہ بھی ہے: وہ یہ کہ ہم میں یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ جدید سائنس کی ہر دریافت اور ہر نظریہ ایسا ہے جس کی قرآن میں پیش قیاسی کردی گئی تھی۔ مثلاً ایٹم کا پھاڑا جانا، ڈارونی ارتقاء، خلاء کے فرضی خطے اور انگلیوں کے نشانوں کی بے مثالیت، ان سب کا ذکر پہلے سے قرآن میں ہونا چاہئے۔ ان دلائل میں ان عربی کے الفاظ کو وہ نئے معنی پہنانے کا عمل بھی شامل ہوتا ہے جو نزول وحی کے وقت وجود نہیں رکھتے تھے مثال کے طور پر عربی لفظ ''ذرہ'' (۸:۹۹) جس کے اصل معنی تھے ''ایک چھوٹا سا ذرا'' یا ''مٹی کا ایک ذرہ'' جسے عام سائنسی اصطلاح میں ''ایٹم'' کا نام دیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اس آیت میں اس کے یہ معنی موجود

Marfat.com

ہیں کہ یہ وزن میں سب سے چھوٹا تھا جو انسانی علم میں تھا اور اسے یہ معانی مفسرین نے جدید دور کے پڑھنے والے کیلئے دیئے ہیں جو بہت اچھی بات ہے۔ مسائل و مشکلات تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی قرآن کی دوسری آیات کے تناظر میں بھی دلیل کے طور پر یہی معنی استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر اسے بنیاد بنا کر (۱۰:۶۱) کہ قرآن ضمنی ایٹمی ذرات کی دریافت کی پیش گوئی کرتا ہے۔ (۲۵)

الراغب الاصفہانی (۲۶) اور لین (۲۷) کے لسانیاتی مطالعے کے ذریعے ان کھائیوں سے بچا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح قرآنی اصطلاحات کے حقیقی معانی و مفہوم تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے اور جدید سائنس کی صرف ان دریافتوں تک ہم پہنچ سکتے ہیں جنہیں ہم مبنی بر حقیقت قبول کرتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں قرآن پاک کی کسی خاص آیت کو سمجھنے کی ضد نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ ''سوائے خدا کے کوئی اور اس کے حتمی معانی نہیں جانتا۔'' (۳:۷)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، پہلے الفاظ جو محمد ﷺ کے ذریعے وحی کی شکل میں نازل ہوئے وہ تھے: ''پڑھ! اپنے رب کے نام سے جس نے مخلوقات کو پیدا کیا'' وہ عربی لفظ جس کا میں نے ترجمہ کیا ''ایک چھوٹے سے رینگنے والے کیڑے سے'' وہ ہے ''علق'' بہت سے ترجموں میں یہ لفظ ''خون کا لوتھڑا'' استعمال ہوا ہے۔ انسان اپنی ارتقائی حالت میں اس شکل میں کبھی نہیں ہوتا اور اس اصطلاح کے یہ حقیقی اور اصلی معانی نہیں ہیں حالانکہ انگریزی میں یہ بڑی مترنم آواز دیتے ہیں۔

درحقیقت نزول وحی کے وقت ''علق'' کے معنی تھے کوئی کیڑا جو اس قابل ہو کہ اپنا ایک سرا کسی شے کے ساتھ چمٹانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ انسان کے ارتقاء کی ابتدائی سطح پر بارور اور زرخیز بیضہ کی نہایت موزوں تشریح ہے، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب یہ لفظاً رحم مادر میں جڑ پکڑتا ہے۔

تولیدی مادے کا رحم میں جڑ پکڑنا روئیں دار سطح کی نشوونما اور بیضے کو حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کیلئے طول دیئے جانے کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جو زمین میں جڑوں کی مانند اپنی خوراک رحم مادر کے گاڑھے پن سے حاصل کرتا ہے جو بیضے کی نشوونما کیلئے ضروری ہے۔ ان اشکال سے بیضہ رحم مادر سے فی الواقع چمٹ جاتا ہے۔ یہ جدید عہد کی دریافت ہے۔ (۲۸)

بیضے کے جڑ پکڑنے کے بعد حمل کا ابتدائی مرحلہ بڑھتے بڑھتے وہاں پہنچتا ہے جہاں

Marfat.com

اسے کسی آلے کی مدد کے بغیر گوشت کے چبائے ہوئے ٹکڑے (المضغة) کی مانند دیکھا جاسکے۔ پھر اس گوشت کے اندر ہڈیوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ پھر پٹھے اور ریشے بنتے ہیں جو ہڈیوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ آج ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ قرآن میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔'' (۲۳: ۱۲-۱۴)

اس مسحور کن مماثلت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو انسان کی نشوونما کے بارے میں قرآن کے بیان اور زمانہ حال کے علم جنین کی دریافتوں کے درمیان پائی جاتی ہے خصوصاً جب ہم انسانی نشوونما سے متعلق نزول وحی کے ہزار سے زائد سال بعد کے ان غلط تصورات کی اہمیت کے بارے میں سوچتے ہیں۔

کئی مقامات پر (۷: ۵۴، ۳۵: ۳۷، ۳۱: ۲۹) قرآن ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم رات اور دن کے باری باری آنے کے عمل پر غور وفکر کریں جو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی ہے۔ ایک دلچسپ حقیقت حال درج ذیل ہے :

''وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔'' (۳۹: ۵)

عربی فعل (الکوارۃ'' جس کا ترجمہ اوپر ''گردا گرد لپیٹنا'' دیا گیا ہے اس کے ایک اور بھی مختصر سے معنی ہیں۔ اس کا مقصدر وہی ہے جو اس عربی لفظ کا ہے جس کے معنی گیند کے ہیں (کرہ) اور اس کا مفہوم بالکل یہ ہے ''لپیٹنا'' یا ''بل دینا'' کسی گول شے کے گرد لپیٹنا یا بل دینا۔ جیسے سوت کے گولے کے گرد دھاگہ لپیٹنا ہے۔ زمین کے معاملے میں جو ایک سیارہ ہے معاملہ بالکل ایسا ہی ہے کہ اس کے گرد رات کا نصف کرہ لپیٹ کر اس کے بعد نصف کرہ دن اس

Marfat.com

کی جگہ لپیٹ دیا جاتا ہے۔ یہ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے ہے اور سورج اس کے مقابلے میں ساکن ہے یہ گردش نہیں کرتا۔ یہ بتاتے وقت قرآن کا اسلوب بیان قابل تحسین ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے اللہ کی جانب سے وحی کی شکل میں نازل ہونے والی آسمانی کتاب تسلیم کرلیا جائے۔

ایک نازک مگر غیر معمولی اختصار لئے ایک دوسری مثال وہاں ملتی ہے جہاں ایک مظہر قدرت کا ذکر ۱۶: ۶۸ میں یوں آتا ہے:

''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈال دی ہے تو پہاڑوں میں گھر بنالے اور درختوں میں اور جولوگ عمارتیں بناتے ہیں۔''

ان میں'' یہ حکم کہ ''بنالے'' ترجمہ ہے عربی لفظ ''ان اتخذی'' کا جو مؤنث استعمال ہوا ہے۔ (عربی زبان میں انگریزی زبان کے برعکس تذکیر و تانیث میں فرق کیا جاتا ہے) حالت تانیث اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب وہ تمام مادہ ہوں جن کی طرف یہ اشارہ کرتی ہے جبکہ حالت تذکیر اس وقت مستعمل ہوگی جب ایک پورے گروپ میں کم از کم ایک نر ہوگا۔ اس لئے دراصل قرآن پاک یہ کہہ رہا ہے: ''بنالو، اے شہد کی مادہ مکھیو، اپنے گھر'' شہد کی مکھیوں کے لشکر میں تین قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں: ایک مادہ ملکہ، کارکن شہد کی مکھیاں (جو شہد جمع کرتی اور چھتہ بناتی ہیں) اور شہد کی نر مکھی جس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ ملکہ کو حاملہ کردے اور جنہیں پھر کارکن مکھیاں مار دیتی ہیں۔ یہ کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں اور ان کے جنسی اعضاء پوری طرح نشوونما یافتہ نہیں ہوتے۔ پس اس حکم کا اسلوب بیان اس حقیقت کے عین مطابق ہے کہ شہد کی نر مکھیاں چھتہ بنانے میں حصہ نہیں لیتیں۔ اس کام میں تو صرف مادہ کارکن مکھیاں مصروف رہتی ہیں۔

چند آیات قرآنی نہایت جدید دریافتوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ کہکشاں کی طیف بینی کا مطالعہ کرتے ہوئے حال ہی میں سائنس دان اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ قرآن حکیم میں ہم پڑھتے ہیں:

''اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے بلکہ مسلسل اس میں توسیع کررہے ہیں۔'' (۵۱: ۴۷)

Marfat.com

آربری کی تشریح اس کے بہت قریب ہے کیونکہ لفظ ''سما'' کے معنی ہیں ''آسمان'' اس زمین سے ماورا کے معنوں میں اور لفظ موسعون فعل اوسعا کا صفت فعلی حالیہ کا جمع کا صیغہ ظاہر کرتا ہے جس کے معنی ہیں ''وسیع کرنا، وسعت دینا، پھیلانا''

ایسی ہی ایک اور مثال ہم پڑھتے ہیں:

> ''کیا ان کافروں کو معلوم نہیں ہوا کہ آسمان و زمین بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے؟'' (۲۱:۳۰)

اوپر دی گئی آیت کو ذہن میں رکھیں تو جدید سائنس کا ایک اور اصول کافی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ سائنس دانوں نے کچھ عرصے سے بات مسلمہ اصول کے طور پر مان لی ہے کہ یہ کائنات ابتداء ایک واحد مادے کا ڈھیر تھی جس کی لامتناہی کثافت بعد میں ایک شدید دھماکے (بگ بینگ سے) ٹوٹ پھوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ یہ بات بھی مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ ہر جاندار خلیہ زیادہ مقدار میں پانی سے بنتا ہے جو ہم جانتے ہیں کہ زندگی برقرار رکھنے کیلئے ضروری عنصر ہے۔ یہ آیت قرآنی ان تصورات کے عین مطابق ہے لیکن سب سے زیادہ دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ کفار کے لئے یہ چیلنج ساتویں صدی میں سامنے آیا۔ ہم اپنے آپ سے یہ سوال کر سکتے ہیں: یہاں کن کافروں سے خطاب ہے؟

حضرت محمد ﷺ کے معاصرین کے لئے اس وحی کے بہت سے اطاعت کے لئے مجبور کر دینے والے پہلو تھے لیکن وہ یہ سوال اس وقت تک نہ سمجھ سکتے تھے جب تک یہ کوئی قدیم اور زمانہ حال میں نامعلوم عرب دیومالائی قصہ نہ ہوتا جس کے ساتھ وہ اس کو جوڑ سکتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بہت بعد کے زمانے میں آنے والے لوگوں کے سمجھنے کی بات تھی جو جدید سائنسی دریافتوں سے واقف ہوں؟

آخری قابل توجہ بات یہ ہے جو ہمیں یہ معلوم کرنے کی جانب لے جاتی ہے کہ قرآن کے وہ مفسرین جو جدید عہد سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے تھے وہ ان آیات کو کیسے سمجھتے تھے۔ اول تو ایسا، غالباً چند مستثنات کے ساتھ تھا کہ یہ تمام آیات ایسی تھیں جنہیں ہر شخص اپنی

علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ تمام زبانیں، خصوصاً وہ جو آسمانی کتابوں (صحیفوں) میں استعمال ہوئی ہیں ان میں ایسے الفاظ شامل ہیں جن کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں اگر کوئی یہ نہ بھی جانتا ہو کہ زمین گول ہے وہ پھر بھی رات اور دن کے باری باری آنے سے واقف ہوتا ہے اور اسے مندرجہ بالا آیت میں سے مخصوص اور اجنبی الفاظ کا انتخاب کرنے پر غور کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ مفسرین نے بھی اکثر انہیں علامتی یا باطنی اصول کی روشنی میں سمجھا تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان آیات کے ایک ہی وقت میں بہت سی سطحوں پر مختلف معانی اور مختلف مقاصد ہیں۔ اس موضوع پر ہم بہت جلد بات کریں گے۔ بعض اوقات مفسرین سائنسی تشریحات اور وضاحتوں پر اتفاق کر لیتے ہیں جو اکثر و بیشتر مکمل غلط نہیں تھیں لیکن جو بعض اوقات بعد کی دریافت کے بہت قریب تھیں۔ بہت اہم بات یہ ہے کہ علامات و اشارات طویل آیات کا حصہ نظر آتے ہیں۔ جن میں بنی نوع انسان کی رہنمائی اور انہیں بچا لینے کی جانب زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مفسرین جو جدید سائنسی فکر سے شناسا نہیں ہیں ان تکنیکی نوعیت کی اہم باتوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ قرآن میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس امکان کو ظاہر کرتے ہیں کہ مستقبل میں ان کی سائنسی تشریح و توضیح ہو سکے گی۔ ''رمزیہ المقطعات'' جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں یہ ایک مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں (۲۹)۔ بوکائی اپنی کتاب ''دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس'' (۳۰) میں قرآن میں بار بار آنے والے اس حوالے ''آسمان و زمین اور اس کے درمیان کی ہر شے'' کے بارے میں اپنے قیاس کا اظہار کرتا ہے:

قرآن میں قیامت کے روز کا ذکر کرتے وقت تجسس پیدا کیا گیا ہے۔

''وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔ (۲۱: ۱۰۴)

اس حوالے سے جس میں آسمانوں کو یوں لپیٹ کر رکھ دینے کا ذکر ہے جیسے طومار میں

Marfat.com

اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں جیسا کہ پہلی تخلیق میں ابتداء کی گئی تھی اور جو اوپر مذکور صور اسرافیل کا ہمارا تصور ہے اس سے کیا یہ ممکن ہے کہ اس کائنات کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہے اور پھر یہ مرغولوں کی شکل میں صوراسرافیل کے بعد وسیع ہوتی گئی اور باہر کی طرف سے یہ کسی ایسے محور پر گھوم رہی تھی جو خط مستقیم تھا؟ کیا اس سیارے کا خاتمہ اس عمل کا الٹ واقع ہونے سے ہوگا؟ بیشک یہ محض ایک خیال ہے جس کی بنیاد زیادہ پھیلے ہوئے ظن وقیاس پر ہے لیکن یہ ان آیات کی موجودگی کی جانب اشارہ کرتا ہے جن میں صاف صاف مافوق الفطرت اشارات اور مفہوم ملتا ہے جس کی کسی روز ممکن ہے سائنسی حقیقت معلوم کر لی جائے۔ یہ ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے:

> ''جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔''
> (۶۷:۳۔۴)

Marfat.com

حالانکہ اس آیت میں تخلیق کائنات کے ان اسرار و رموز اور پیچیدگی کا ذکر ہے جس کا احاطہ انسان نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ یہ کسی قدرتی مظہر کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔

ہم اس موقع پر اس بات پر زور نہیں دے رہے، نہ ہمیں یہ اصرار ہے کہ قرآن پاک کی کچھ مخصوص آیات ایسی ہیں جو مخصوص سائنسی دریافتوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ہم تو صرف قرآن کے ان بیانات کا جائزہ لے رہے ہیں جن میں اس جہان رنگ و بو اور مختلف سائنسی نظریات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ ان میں اکثر گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ زیادہ قابل توجہ بات ہے جیسا کہ بوکائی کا مشاہدہ ہے، قرآن قرون سابقہ کی کتابوں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ بیان کرتا ہے یا بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ قدرت کس طرح کام کرتی ہے اور غلط فہمی پر مبنی نظریات کو دور رکھتا ہے کیونکہ قرآن میں بہت سے ایسے موضوعات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو جدید علم کو سہارا دیتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس میں کوئی ایسی بات کی گئی ہو جو کسی ایسی بات کی تردید کرتی ہو جسے دور حاضر کی سائنس نے تسلیم کر لیا ہو' (۳۱)

قرآنی آیات بالکل اسی کی تکمیل کرتی ہیں جو ان میں شامل اشارہ تجویز کرتا ہے۔ ان کی حیثیت تو رہنما نشانات راہ کی سی ہوتی ہے جو دُوسروں کی توجہ کھینچ لیتے ہیں اور گہرے غور وفکر کیلئے رہنمائی فراہم کرنے میں مدد دیتے ہیں اور بعض اوقات عقیدہ وایمان کی سمت لے جاتے ہیں۔ ان کی قوت وطاقت اس میں نہیں کہ وہ مظاہر فطرت کی مفصل اور مختصر تشریح فراہم کریں بلکہ ان کی اہلیت وصلاحیت تو یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں انسان کے تجسس اور تحسین آمیز ہیبت کو ابھارے۔ حالانکہ ہم ان آیات میں سے کسی ایک کے حقیقی معانی پر بحث کر سکتے ہیں اور اس باب میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے اس سے بلاشبہ یہ تاثر ملتا ہے کہ قرآن کے خالق کو یہ توقع ضرور ہوگی کہ اس کے مطالعہ سے انسان کی ذہنیت ارتقائی عمل سے گزرے گی اور ترقی کرتے کرتے اس دور میں پہنچ جائے گی جب استدلال اور سائنس سچائی کے لئے حتمی معیار یا کسوٹی تصور ہوں گے۔

مرکزی نکات غور وفکر

اوپر بیان کئے گئے مشاہدات بہت سے مسلمانوں کے لئے مایوسی کا سبب بنتے ہیں اور غیر مسلموں کو یقین نہیں دلا سکتے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ کوئی کتنا بھی بڑا صاحب علم و دانش کیوں نہ ہو پراسرار ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ خدائی صفات کا حامل بھی ہو۔ البتہ ان مشاہدات سے مزید تحقیق وجستجو کی تحریک ضرور پیدا ہوتی ہے۔ کسی مرحلے پر قرآن کو اپنے پڑھنے والے میں ایسے دائمی اور سرمدی سوالات ضرور ابھارنے چاہئیں: ''کیا خدا ہے، اور اگر وہ ہے تو اس کے ساتھ ہمارا رشتہ وتعلق کیا ہے اور اس زندگی کا مقصد اور اس کے معانی کیا ہیں؟''

قرآنی محاکات یا تمثال

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب کسی مقدس صحیفے کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو اصل معانی بعض اوقات کھو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مترجم پوری لگن اور تندہی سے اس کام کو ہاتھ ڈالے تو ایک لافانی چمک دمک اور تابانی قائم رہتی ہے اور انسانی

Marfat.com

مجبوری اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل زبان میں یہ زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور حیرت و ہیبت، حسن و خوبصورتی اور قرآنی محاکات کی آب و تاب اور اسلوب قائم رہتا ہے اور زیادہ گہرا اثر چھوڑتا ہے مثلاً جہنم کی نقشہ کشی کرتے ہوئے اس کے جو ڈراؤنے مناظر پیش کئے گئے ہیں جنت کی خوبصورت اور انعام و اکرام سے پر زندگی کا تصور اس کے سامنے دب کر رہ جاتا ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شاید ایسا ممکن ہو۔ جہنم کے بارے میں اس طرح کی شد و مد کے ساتھ کی جانے والی باتوں کی وجہ سے قرآن میں جس خدا کا ذکر ہے وہ معاف کرنے، درگزر کرنے اور رحم کرنے والے خدا کی نسبت انتقام لینے والا اور زیادہ قاہر خدا نظر آتا ہے۔ تاہم پورے قرآن پاک کے تناظر میں دیکھا جائے تو جس خدا کا تصور ابھرتا ہے وہ صرف خوف دلانے کی نسبت بچانے پر زیادہ آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور اسے ہم آئندہ کے کسی موقعہ کیلئے چھوڑتے ہیں۔

بیشک وہ بھی تشریحات اور تفاسیر پر انحصار کرتے ہیں، میرے خیال میں تمام مغربی نو مسلم قرآن پاک کے ادبی اسلوب کو بہت مؤثر ذریعہ تصور کرتے ہیں کیونکہ یہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں غیر محسوس طریقے سے یہ بات ڈال دیتا ہے کہ وہ مرد یا عورت (جو مطالعہ قرآن پاک میں مصروف ہیں) نزول وحی میں عملاً شریک ہیں ڈینی اس کی تصدیق نہایت خوبصورت انداز میں یوں کرتا ہے: مطالعہ قرآن کے دوران ایک لمحہ ایسا آتا ہے، مثلاً وہاں جہاں پڑھنے والے کی توجہ اس کے معانی پر مرکوز ہو، خواہ وہ بہ آواز بلند تلاوت کر رہا ہو یا خاموشی سے دل ہی دل میں پڑھ رہا ہو، جب پڑھنے والے ایک پراسرار اور بعض اوقات کس ڈراؤنی شے کی موجودگی محسوس کرنے لگتے ہیں چنانچہ بجائے قرآن کی تلاوت کرنے کے، پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے جیسے "قرآن اسے پڑھ رہا ہے"! یہ ایک حیرت انگیز طور پر پریشان کن تجربہ ہے جس کے لئے کسی شخص کا بہرصورت مسلمان ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اسے محسوس کر سکے۔ اسلام کی اشاعت میں قرآن کے اندر موجود یہ اسلوب ایک بڑے اور طاقتور ذریعہ کے طور پر موجود رہا ہے اور مسلمان بھی صراط مستقیم سے اپنی وفاداری بدستور قائم رکھتے ہیں اور قرآن تو خود دین کے وصف بیان کرتا ہے۔ (۳۲)

Marfat.com

دوبارہ آیات کی جانب

''ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان لوگوں کے گردونواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی اور یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ قرآن حق ہے۔'' (۴۱: ۵۳)

نشان راہ صرف ہماری رہنمائی نہیں کرتے: وہ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم صحیح راہ پر چل رہے ہیں اور ہمارے قدم درست سمت میں اٹھ رہے ہیں۔ اور یہ کہ ہمارے فیصلے درست اور صحیح ہیں۔ اس لئے اس سفر میں جو'' دور دراز سے خود ہماری ذات کے اندر تک ہے'' یہ قرآنی آیات ہی ہیں جو ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ درحقیقت قرآن پاک کی تمام ''آیات'' میں انسان کا فرض کیا ہے اس کی یاددہانیوں، اللہ کے ہاں جواب دہی اور اس کے ناگزیر فیصلوں تک کی ساری باتیں ان میں بتادی گئیں ہیں۔ وہ تمام آیات جو پہلے ہی مذکور ہوگئی ہیں اس نکتے کی وضاحت کریں گی۔ درج ذیل کو بنیادی طور پر ان کی خوبصورتی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔

''یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں شاید کہ تم سیکھ لو'' (۲۴:۱)

یہ سورۃ النور کا آغاز ہے جو مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے لکھنے والوں کے لئے قرآن کی سب سے زیادہ عام فہم سورتوں میں سے ایک ہے۔ بڑی فہم وفراست سے مالک بن نبی نے درج ذیل دو عظیم الشان آیات میں یہ دریافت کیا کہ اس کی نظر میں ''واضح نشانیوں'' سے کیا مراد تھی۔ (۳۳)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس

Marfat.com

طرح) روشنی پر روشنی بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی، (اور وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

منور اور روشن ''سورۃ النور'' بن نبی کو ایک ساز باز کرنے والی پیش گوئی نظر آتی ہے۔ تمثیلی قصہ ایک روشن اور چمکدار چراغ کی شبیہ پیدا کر دیتا ہے جو شیشے کی قندیل کے اندر بند ہے جو کسی انجانے (نزول وحی کے زمانے میں) تیل کے ذریعے جلتا ہے (''جو نہ مشرق کا ہے نہ مغرب کا'') یہ شعلے کے بغیر روشنی دیتا ہے۔ یہ تمثیلی قصہ بن نبی کے خیال میں بجلی کی روشنی کی جانب اشارہ کرتا ہے اور جب اس کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی جاتی ہے تو ہم صرف حیرت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی خیال آرائی سے پہلے تو اس آیت کے اسلوب کی تمام خوبصورتی پر زد پڑتی ہے لیکن یہ قرآن کی خاصیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہم آہنگی کیلئے اس میں روحانی اور دنیوی معلومات کو بیک وقت ساتھ ساتھ بیان کیا جاتا ہے اول الذکر مؤخر الذکر کو ہماری نظروں سے چھپا دیتی ہے کفر وشرک کی دو تمثیلی کہانیاں اور اس کے تباہ کن نتائج کا ذکر اس آیت کے فوراً بعد آتا ہے:۔

> ''(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ یا

Marfat.com

پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے اس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے، جسے اللہ نور نہ بخشے اس کیلئے پھر کوئی نور نہیں۔'' (۲۴:۳۹۔۴۰)

بن نبی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پہلی تشبیہ کے لئے ساتویں صدی کے کسی مکہ میں رہنے والے شخص سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسے استعمال کرے گا مگر وہ دوسری تشبیہ کے بارے میں دیکھتا ہے کہ اس میں جن کالے بادلوں اور سمندر کی موج خیز لہروں کی خیالی تصاویر پیش کی گئی ہیں وہ تو شمالی ساحلی علاقوں کے رہنے والوں کی سمجھ میں زیادہ آسکتی ہیں۔ وہ سمندر کے اندر پیدا ہونے والی موج پر دوسری موج کی موجودگی کے حوالے کو موجودہ بحری علم و تحقیق سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ جسے لہروں پر لہروں کو لاکر رکھ دینے کا قدرتی مظہر سمجھا جاتا ہے اور بصریات یا علم مناظر میں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جس گھٹاٹوپ اندھیرے سے واسطہ پڑتا ہے وہ جدید تحقیق کے مطابق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ روشنی پانی کے اندر جذب ہوکر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔ یہاں واضح موضوع بحث یہ ہے کہ ایسی زندگی جو صرف دنیاوی اغراض و مقاصد کیلئے وقف کر دی جائے اس کا انجام روحانی گھٹن اور مکمل فریب خوردنی کے عمل سے نکلنے میں ہوتا ہے۔ ہم بن نبی کے نقطہ نظر کی نسبت اس بات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم اسلوب بیان قابل توجہ ہے۔ اگر مجھے کفر و شرک کا مقابلہ سمندر میں غرق ہوجانے سے کرنا ہوتا اور میں نئے انگلینڈ کے ساحلی علاقے میں پلا بڑھا ہوتا تو میں یقیناً یہی الفاظ استعمال کرتا ''لہر کے بعد لہر'' بجائے اس کے کہ میں کہتا ''لہر کے اوپر رکھی ہوئی دوسری لہر۔'' شاید اس لئے کہ سوچنے والا اکثر سوچتا یہ ہے کہ یہ صرف سطح سمندر پر پیدا ہوتی ہیں اور یہ ایک کے بعد دوسری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں تو معاملہ اس طرح کا دکھائی دیتا ہے مگر قرآنی اسلوب بیان، بیشک زیادہ صحیح ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جب تک میں نے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زنی نہ کی ہوتو یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں سمندر کی گہرائیوں میں مختلف مقامات پر اندھیرے کی کم و بیش سطحیں دیکھ سکوں۔ اس لئے نسبتاً کم گہرے پانی میں۔ تالاب یا جھیل میں روشنی کی حد کم و بیش غیر متغیر

ہوتی ہے۔

بن نبی جس نتیجے تک پہنچا ہے ہم اگر اسے درست مان لیں تو جن آیات میں یہ زیادہ واضح پیغامات موجود ہیں وہ اسے دھندلا دیں گے جبکہ زیادہ آیات جداگانہ طور پر پیش کی گئی ہیں جیسا کہ انسانی تجربہ یا فطرت اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کا مقصد قرآن پاک کے ان بہت سے طریقوں میں سے ایک کی توضیع وتشریح کرنا ہے جس میں قرآن دعوت فکر دیتا ہے اور دنیاوی نکات فکر کو روحانی نکات فکر وتدبر میں مدغم کر دیتا ہے۔

دلیل وحجت کا کردار

''کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے'' (۲: ۴۴)

قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے طرز عمل اور اعتقادات پر نقادانہ نظر ڈالیں۔ نجات کا حصول تلاش حق اور سچائی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اطاعت قبول کر لینے میں ہے۔ قرآن کا ایک مدعا یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم پورے نظم وضبط کے ساتھ مذہبی سوالات تک پہنچیں۔ صحیح صحیح استدلال سے کام لیں تاکہ اپنے اندر کے تضادات اور عدم مطابقت تک پہنچ کر انہیں سامنے لائیں۔ قرآن کے بہت سے تمثیلی قصوں، کہانیوں اور تنبیہوں میں وہ سبق داخل کر دیے گئے ہیں جو صحیح اور غلط استدلال سے بحث کرتے ہیں۔ قرآن کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ استدلال یا دلیل وحجت میں ثبوت اور شہادت کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے:۔

> ''ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔'' (۲: ۱۱۱)

> ''یہ مشرک لوگ (تمہاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے'' ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے لوگوں نے

Marfat.com

بھی حق جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو" کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" (۶:۱۴۹)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قران خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔" (۵۲: ۳۳۔۳۴)

"وہ لوگ" اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہیں لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔" (۲۴:۱۳)

کئی مقامات پر قرآن مذہبی سوالات تک رسائی میں منطقی سقم اور نقائص کو بے نقاب کرتا ہے:۔

"یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں: یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔" (۲: ۱۱۳)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں" کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلاتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔" (۳۶: ۴۷)

پہلی آیت میں نہایت نازک و شفاف شیشے کے گھر کا ذکر ہے جہاں دوسرے مذہب کے خلاف استعمال کئے جانے والے دلائل اپنے مذہب پر بھی یکساں طور پر منطبق ہوتے ہیں۔

دوسری آیات میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جیسا جواب مذکور ہے اس میں نہ صرف اس بات کا انکار شامل ہے کہ انسان کی طبیعت اور مزاج میں فیاضی اور سخاوت پائی جاتی ہے بلکہ اگر یہ استدلال اختیار کرلیا جائے تو پھر انسان کو تو کسی بات کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہئے جس میں ذاتی حفاظت بھی شامل ہے۔

سورۃ الاعراف میں ایک تمثیلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ کس طرح واقعاتی شہادت سے سچائی سے بھٹک جاتے ہیں:

> ''لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں'' (۳۴) (۱۷۶:۷)

سورۃ الکہف میں اس بے معنی استدلال پر تنقید کی گئی ہے جو غیراہم تفاصیل پر کیا جاتا ہے:

> '' کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔''
> (۲۲:۱۸)

قرآن میں حکمت ودانائی کی حکایتیں اور حیران کن نصیحتیں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ اور ایک مرد بزرگ کا قصہ (۱۸: ۶۰۔۸۲) جب بیان ہوتا ہے تو پڑھنے والا یہ توقع کرنے لگتا ہے کہ جیسے اس کو ایک ابدی معمے کا حل ملنے والا ہے کہ بناوٹی اور ظاہری بری باتوں سے ایک بڑی اچھائی کا پہلو کیوں کر نکل سکتا ہے؟ جب وہ اپنے ذہن میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا

Marfat.com

ہے تو وہ درحقیقت اپنے آپ کو خدائی عدل و انصاف اور اچھائی برائی کی نوعیت کے بارے میں سکھا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں ہم اللہ کی نکتہ رس حکمت عملی کے بارے میں سیکھتے ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی افتاد اور مصیبت کے پس پردہ کیا معنی و مقصد پوشیدہ ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی کہانی (۲۱ : ۷۸۔۷۹) میں ہمیں گہری بصیرت کا سبق دیا گیا ہے قرآن کفار کی غلطیوں پر مسلسل گرفت کرتا ہے، ایسا یا تو براہ راست کیا ہے یا ایمان والوں کے واقعات کا ذکر کر کے۔ کافر کو شکست خوردگی کا احساس ہوتا ہے اور پڑھنے والا، جس حیثیت میں بھی ہو ایک جاری مباحثے میں شریک بن جاتا ہے۔ دراصل وہ دوسرے کرداروں کی زندگی میں حیات نو پانے والے تنقیدی قصوں سے ہدایت لے رہا ہوتا ہے۔

بنیادی مسائل کے بارے میں ہمیں گہری فکر دینے کیلئے ایک اور اہم طریقہ یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر تردید اور انکار کریں۔ اچھے اور برے کے سوال پر ہمیں بتایا گیا ہے کہ:

> ''کہو، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔'' (۴:۷۸۔۷۹)

یہاں ہم ان کاموں کے درمیان فرق کے بارے میں سیکھ رہے ہیں جو ''اللہ کے ہیں'' اور وہ جو ''اللہ کی طرف سے'' ہوتے ہیں۔ (۳۵) ہم اپنے افعال کے خود کرنے والے ہوتے ہیں، ہماری طاقت و صلاحیت اور ہماری اہلیت جو برے کام کرنے میں صرف ہوتی ہیں ''اللہ کی طرف سے'' ہیں۔ پس برا کام ''ہم سے'' منسوب ہونا چاہئے کہ یہ ہم نے کیا اور ''اللہ کی طرف منسوب'' نہیں ہونا چاہئے ذرا سا گہرائی میں جائیں تو برائی سے ہم اپنے تعلق اور نسبت کے بارے میں سمجھ جاتے ہیں اس لئے کہ اس دنیا میں جس برائی کا وجود ہے وہ مطلق و بے قید نہیں بلکہ اس سے اچھے کام بھی نکلتے ہیں۔ لامحالہ یہ طرز فکر ہمیں اس بحث کی جانب لے آتی ہے جو ایمان اور کفر کے درمیان ایک بڑی حد فاصل ہے۔ یہ آج بھی اتنی ہی بڑی ہے جتنی کبھی تھی صدیوں پرانا ''ایمان اور استدلال'' کا تصادم۔

ایمان اور استدلال

اگر اللہ غفور و رحیم ہے تو وہ ہمیں مصیبتوں اور پریشانیوں میں کیوں مبتلا کرتا ہے؟ اگر وہ سب کچھ جانتا ہے، علیم و خبیر ہے تو پھر وہ ہمیں آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے؟ اگر اس کی ذات خود کفیل ہے تو پھر وہ یہ کیوں چاہتا ہے کہ ہم اس کی پرستش کریں یا قربانی دیں؟ اگر سبھی کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو عبادت یا دعا کی قدر و قیمت کیا ہے؟ خدائی عدل و انصاف اور تقدیر یا بندے کے لئے اللہ کی محبت اور سزا کے درمیان مفاہمت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟ بے شک یہ سوالات نئے نہیں ہیں جب سے انسان پہلی بار خدا کے بارے میں باخبر ہوا ان سوالات نے مذہبی حوالے سے اسے پریشان کیا ہے۔ اس سے فرقہ بندی، ظلم و تشدد اور کفر کی راہیں کھلیں۔ حالانکہ ہر قدامت پسند مذہبی نظام اس کا جواب مہیا کرتا ہے لیکن پھر بھی جمہور کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے بلکہ اکثر تو انہیں جرح کرنے یا سوال کرنے سے منع ہی کر دیا جاتا ہے۔ ماضی میں اس سلسلے میں شاندار کوششیں ہوئی ہیں: مسلم مفکرین اور فلسفیوں میں سے ابن سینا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۳۶) آج کی دنیا میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے میں، بہت سے لوگوں کیلئے اللہ پر ایمان لانے کے راستے کی یہ بہت بڑی رکاوٹ رہے ہیں۔ ہم ان مسائل کے بارے میں اپنی تحقیق کی ابتداء دو اہم قرآنی تصورات پر بحث سے کرتے ہیں۔

متشابہات اور تمثیلی قصے

اسد کے خیال میں قرآن کے ''تمام کلیدی جملوں کی ایک کلید'' ساتویں سورۃ آلِ عمران کا یہ بیان ہے:

وہی ہے جس نے تمہارے لئے یہ کلام الٰہی نازل کیا ہے، جس میں صاف صاف اور واضح پیغامات ہیں، ایسے پیغام جو اپنے اندر واضح ہیں اور اپنے بارے میں واضح ہیں (آیات محکمات)۔ اب وہ جن کے دل سچائی سے انحراف اور اغماض برتتے ہیں قرآن کے اس حصے کی طرف جاتے ہیں جسے تمثیلی قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے جس سے یہ الجھاؤ اور تذبذب

تلاش کرتے ہیں اور اس کے حتمی معانی کی تلاش کرتے ہیں لیکن اللہ کے سوا کوئی بھی اس کے حتمی معانی نہیں جانتا۔

جس بات پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے وہ یہ موضوع ہے کہ کون سی آیات علامتی یا اشاراتی ہیں اور کن آیات کے لفظاً معانی لئے جائیں۔ اپنی تصنیف ''دی میسج آف دی قرآن'' (قرآن کا پیغام) (۳۷) میں اسد نہایت ہی قرین قیاس وضاحت بیان کرتے ہیں کہ وہ آیات جن کے معانی علامتی سمجھے جانے چاہئیں وہ حقیقت کے ان پہلوؤں سے مطابقت رکھتی ہیں جو انسانی تجربے، علم وادراک کی رسائی سے باہر ہیں اور جنہیں قرآن حکیم ''الغیب'' (پوشیدہ، ان دیکھا یا ادراک سے ماوراء) کا عنوان دیتا ہے۔ وہ بڑی شد و مد سے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ انسانی ذہن صرف ان سابقہ تجربات کی بنیاد پر کام کرسکتا ہے جنہیں وہ حقیقت سمجھ چکا تھا اور ایک بار اس بات کو مان لیا جائے تو

''ہمیں ایک بڑا اہم سوال درپیش ہوتا ہے: کیونکہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی تصورات، اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ایسی دنیا کا ذکر کرتے ہیں جو انسانی ادراک یا تجربے کی رسائی سے باہر ہوتی ہے۔ تو ہم تک کامیابی کے ساتھ کیسے پہنچائے جاسکتے ہیں؟ جن تصورات کی نقل یا نصف ثانی نہ ہو ہم سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ہماری ذہنی گرفت میں آ جائیں گے۔ ہم عملی اور تجرباتی طور پر جن تصورات تک پہنچے ہوتے ہیں یہ ان میں سے کسی ایک کا چھوٹا سا حصہ بھی نہیں ہوتا۔ (۳۸)

ایک کمزور سا تمثیلی استدلال اس کوشش میں دیکھا جاسکتا ہے جس میں کسی بینائی سے محروم شخص کو بادل کے بارے میں بتایا جارہا ہو یا جیسا کہ ایبٹ کی کتاب ''فلیٹ لینڈ'' میں سہ ابعادی پہنائی اس شے کو بتایا جارہا ہو جو خود صرف دو ابعادی وجود رکھتی ہو۔ (۳۹)۔ اسد کا کہنا ہے کہ اس صورتحال کے لحاظ سے جواب بالکل واضح ہے۔ ہم اپنے ادراک کی رسائی سے آگے حقیقتوں کی الہامی اور وجدانی تعریف و تجسس تک پہنچ سکتے ہیں۔ بھلا کس طرح؟ اس طرح کہ ان مستعار شبیہوں سے جنہیں ہم اپنے حقیقی، جسمانی یا ذہنی تجربات سے حاصل کرتے ہیں یا

جیسا کہ زمخشری اقتباسات میں آیت ۱۳: ۳۵ کی تفسیر وتشریح میں یوں بیان ہوا ہے "تمثیلی بیان کے ذریعے، کسی ایسی چیز کے ذریعے جسے ہم اپنے تجربے سے جانتے ہیں، کسی ایسی چیز کے بارے میں جو ہماری حد ادراک سے باہر ہو"...... چنانچہ قرآن ہمیں صاف صاف بتاتا ہے کہ اس کی بہت سی آیات اور بیان محض اس لئے تمثیلی شکل میں سمجھے جانے چاہئیں کہ چونکہ انہیں انسانی فہم وادراک کے لئے بیان کیا جارہا تھا۔ اس لئے انہیں کسی اور طرح سے اس تک نہیں پہنچایا جاسکتا تھا۔ اس لئے اس کے بعد ہم اس مقام پر پہنچتے ہیں کہ اگر ہم قرآن پاک کی کسی آیت، بیان یا اظہار کو اس کے ظاہری اور لفظی معنوں میں لینا چاہتے ہوں اور تمثیلی انداز کو پس پشت ڈال دیں تو ہم اس مقدس کتاب کی اصل روح کے خلاف کررہے ہوں گے۔ (۴۰)

پس ہمیں قرآن میں مذکور جنت کی ایسی مادی اور غیر روحانی تفصیلات ملیں گی جو خاص طور پر ساتویں صدی کے عربوں کے لئے بہت موزوں تھیں جبکہ اس کے ساتھ ہی ۳۲: ۱۷ میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ:

> "پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لئے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے" اسی طرح حالانکہ اللہ "پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں" (۶: ۱۰۰) اور "کائنات کی کوئی شے اس کے مشابہ نہیں" (۴۲: ۱۱) اور "کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے" (۱۱۲: ۴)

ہمیں پھر بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ خدا کا اور منشائے ربانی کا تذکرہ کریں۔ اس انسانی ضرورت کا احساس تمثیلی انداز اختیار کرنے سے ہوتا ہے تاکہ اللہ کی صفات بیان کرتے وقت، قیامت کے دن کا، جنت ودوزخ کا اور ایسے ہی دوسرے تصورات کا جن کی تشریح آیات متشابہات نہیں کرتیں ذکر کیا جاسکے۔ انسانی فکر اور زبان کی محدود دسترس کے باعث کوئی ملی جلی تشریح کردی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسا اسلوب جو پہلی نظر میں تقریباً تشبیہی رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے، مثلاً اللہ کا "غضب" یا "عتاب"، نیکی اور بھلائی کے کاموں پر اس کا "لطف وکرم" یا "محبت" جس کا اظہار وہ اپنی مخلوق کے لئے کرتا ہے۔ یا اس کا کسی

Marfat.com

گنہگار کو یا اس کو ''بھلا دینا'' جو اس سے غافل ہو گیا تھا۔ یا یوم حشر کسی گنہگار اور بد عمل انسان سے اس کی بداعمالیوں کا ''حساب'' لینا، اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ ایسے تمام حرف بہ حرف ''تراجم'' جن میں اللہ کے کاموں کا انسانی اصطلاحات میں ذکر کیا گیا ہے اس وقت تک ناگزیر ہوں گے جب تک ہم سے یہ توقع رکھی جائے گی کہ انسانی زبان کے ذریعے ہم تک جو اخلاقیات اور نیکی کے اصول پہنچے ہیں ہم ان پر عمل کریں گے۔ لیکن اس سے بڑی غلطی اور کوئی نہ ہوگی اگر ہم یہ سوچنے لگیں کہ یہ ''تراجم'' کبھی ہمیں اس قابل بنا دیں گے کہ ہم ناقابل تشریح بات کی تشریح کر سکیں۔ (۴۱)

شیاطین و جنات

قرآنی اصطلاحات ''شیطان'' اور ''جن'' اکثر ترجمہ ہو کر انگریزی ''Satan'' اور ''Ginie'' استعمال ہوتی ہیں۔ مغربی ذہن میں لفظ ''شیطان'' سے کسی مافوق الفطرت شے کا تصور ابھرتا ہے جو آدھا انسان آدھا حیوان ہو، جس کے سر پر سینگ ہوں اور جو دم اور سہ شاخہ رکھتا ہو۔ ''جن'' بھی اسی طرح کی ایک بدروح یا آسیب ہے جو بوتل کے اندر رہتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں ان لوک کہانیوں سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں جو ہمارے اردگرد ان لفظوں میں مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں سنی جاتی ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی کا رنگ حاصل کر لیتی ہیں۔ (۴۲) ایسے غلط تصورات کی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان کے اصل مفہوم پر بحث کریں۔

لفظ ''جن'' کا مصدر ''جن'' ہے جس کے معنی ہیں ''ڈھانپنا، چھپانا، پوشیدہ رکھنا، یا حفاظت کرنا۔'' پس لفظ ''جن'' کے اصلی معنی ہیں ''کوئی ایسی مخلوق جسے انسانی عقل یا شعور و ادراک سے نہ سمجھا جا سکے، یا جو انسانی تصور میں نہ آ سکے'' (۴۳) یوسف علی کی رائے میں یہ ایک ''روح یا نظر نہ آنے والی، چھپی ہوئی طاقت کا نام ہے'' (۴۴) اور عرب جیسا کہ محمد علی بیان کرتے ہیں، عموماً ''جن'' کی اصطلاح انسانوں کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان عرب لغت نگاروں کا حوالہ دیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ کو ''معظم الناس'' یعنی ''انسانوں کا خاص

Marfat.com

گروہ" یا انسانوں کے جمِ غفیر" (۴۵) کا نام دینا چاہئے۔

ایک عرب کی زبان سے انسانوں کا خاص گروہ سے مراد ہوگی غیر عرب دنیا۔ وہ تمام غیر ملکیوں کو جن کہتے تھے کیونکہ یہ ان کی نظروں سے اوجھل رہتے تھے۔" (۴۶)

اس لئے جن، اپنے انتہائی عام مفہوم میں ایک ایسی مخلوق یا طاقت ہے جس کا ادراک نہ کیا جا سکے۔

قرآن کی تفسیر و تشریح میں الطبری لکھتے ہیں کہ

عربوں کی گفتگو میں شیطان ہر وہ باغی ہے جو جنوں، انسانوں، درندوں اور ہر شے...... میں سے ہو۔ ہر چیز میں باغی کو "شیطان" کہتے ہیں، کیونکہ اس کا رویہ اور کام اس کے بقیہ ہم جنسوں سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ نیکی اور اچھائی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ (۴۷)

اس نے اپنے معانی ایک ایسے عربی مصدر سے لئے ہیں جس سے مراد ہے الگ تھلگ کیا ہوا یا جلاوطن کیا ہوا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ فعل شیطانا کی فاعلی حالت سے لیا گیا ہے۔ جہاں یہ اس طرح استعمال ہوا ہے۔ (۴۸)

ایک بار پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اصطلاح کو انسانوں کے ذکر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔۲: ۱۴ کی تشریح کرتے ہوئے الطبری، ابن عباس کا حوالہ یوں دیتے ہیں: کچھ یہودی ایسے تھے جو جب نبی کریم ﷺ کے ایک یا بہت سے صحابیوں ؓ سے ملے تو انہوں نے کہا: "ہم آپ کے دین کو مانتے ہیں" لیکن جب وہ ان سے جدا ہو کر اپنے ساتھیوں میں پہنچے، جو ان کے شیطان تھے تو انہوں نے کہا: "ہم تو آپ کے ساتھ ہیں، ہم تو انہیں دھوکہ دے رہے تھے۔" (۴۹)

وہ قتادہ اور مجاہد کا حوالہ بھی دیتے ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ شیطان "برائی کے وقت ان کے لیڈر تھے" اور منافقین اور کئی خداؤں کے ماننے والوں میں ان کے ساتھی تھے۔"

"قرآن اور حضرت محمد ﷺ کی احادیث مبارکہ بیشک ایسی مخلوق کے بارے میں بتاتی ہیں اور ان دنیاؤں کے بارے میں بھی جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں ان کے بارے میں ہمیں واضح اشارے ملتے ہیں۔ لیکن شیطان اور جن کے صرف یہ معنی و مفہوم ہی نہیں لینے

Marfat.com

چاہئیں، اس لئے کہ شیطان اور جن کی اصطلاحات کے ساتھ لوک کہانیاں شامل کردی گئی ہیں اور اس لئے بھی کہ یہ اصل عربی کی اصطلاحات کے زیادہ عام معانی کے لحاظ سے مختلف معنی لئے ہوئے ہیں۔ غلط فہمی سے بچنے کیلئے میں کبھی کبھی ان کیلئے ''روحانی مخلوق یا روحانی قوتیں'' یا ''ان دیکھی اور نظر نہ آنے والی مخلوق'' جیسے الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتا ہوں۔ اب جس موضوع پر بحث ہوگی اس میں میں نے ایسا ہی کیا ہے۔

زمان ولامکاں

مذہب کی ساری تاریخ میں زمان ولامکان کا تصور اور ان کا خدا سے تعلق متضاد فلسفیانہ قیاس آرائیوں تک محدود رہا ہے۔ اسے بڑی تفصیل کے ساتھ علامہ محمد اقبال نے اپنی تصنیف ''دی ری کنسٹرکشن آف ریلجیس تھاٹ ان اسلام'' (۵۰) میں پیش کیا ہے، جہاں انہوں نے جدید ذہن کے مطابق اور اسلام کے نظریاتی سرچشموں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تشریح ایک نئے زاویے سے کی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم سکالرز نے آپ کی اس کوشش کی کافی تعریف کی ہے حالانکہ دونوں طرف سے ان کے خیالات کی صحت و درستی سے متعلق کافی حد تک عدم اتفاق پایا جاتا تھا۔ (۵۱) اقبال کے الفاظ میں ہمیں ایسی کوششوں کو کم اہم نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ ہمارے ان نظریات کو سمجھنے سے علم دین سے متعلق کئی خلاف قیاس اور بعید از عقل باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو ہم ان کی مزاحمت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ آسمانی صحیفے خود بھی وقت یا زماں کو اللہ سے منسوب کرنے سے نہیں بچ سکتے اور دوسری جانب، اور یہ بات زیادہ اہم ہے، ہمارے سمجھنے میں جو کمی رہ جاتی ہے اس کی طرف سے بھی چوکنا رہنا چاہئے۔

زیادہ پیچیدگیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وقت یا زماں کی بات کرتے وقت ہم انسانی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو اللہ سے منسوب کر دیتے ہیں۔ چونکہ اللہ تو مکاں کی وسعتوں سے ماورا اور بالاتر ہے اس لئے ہم قدرتی طور پر خلائی اور مکانی حدوں کو اس کے ساتھ منسلک نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اللہ بذات خود زمین پر اتر آتا ہے یا چمن میں چلتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ہم اس بات پر بھی اصرار نہیں کریں گے کہ خدا ایک سہ ابعادی ذات

Marfat.com

ہے اور خلاء میں، مکانی وسعتوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کرتا ہے۔ اسی طرح سے ہمیں یہ مطالبہ بھی نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ کا ایک ماضی، حال اور مستقبل ہے اس لئے کہ اس سے یہ مطلب نکلے گا کہ ہماری طرح اللہ بھی زمانی حدود کا زندانی ہے۔ پھر یہ خیال تو اس کی ماورائیت اور لامکانیت سے متصادم ہوتا ہے۔ ہمیں اس خیال کو قبول کر لینے میں ذرا سی مشکل پیش آتی ہے کہ اللہ کا علم خلاء میں دو مختلف مقامات کو بیک وقت احاطہ کر سکتا ہے۔ ایسا غالباً اس لئے ہے کہ خلاء تک رسائی کی صفت ایک فوقیت و برتری کے منفرد نکتے کی جانب اشارہ کرتی ہے، ہم اس کا مقابلہ زمین سے بلند ہونے کے تجربے کے ساتھ کر سکتے ہیں خواہ یہ کتنا ہی ناقص اور بھونڈا کیوں نہ ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دور دراز کے واقعات کے علم سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ وقت یا زمانے کے لئے پورے احترام کے ساتھ، خلاء و مکان کے برعکس ہم ساکن اور غیر متحرک ہیں۔ ہم زمانے میں آگے کی جانب یا پیچھے کی طرف سفر نہیں کر سکتے اس وقت سے شمار کر کے ہم موجودہ وقت کی نسبت ایک گھنٹے بعد، ایک گھنٹہ آگے ہوں گے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ بات سمجھنا زیادہ مشکل ہوگی کہ اللہ کا وجود وقت و زمانے سے آزاد ہے یا اس سے ماوراء ہے، جیسا کہ اسے ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس پر یقین رکھیں کہ زمان و مکان کی ابعاد یا جہتوں میں سے اللہ کسی ایک کا بھی زندانی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ تو خود اس کا خالق ہے اور انہیں اس نے ہمارے لئے بنایا کہ ہم ان میں رہ کر نشو و نما پائیں۔ ایک بار پھر ہم یہ بات دہراتے ہیں کہ اللہ اپنی بے مثال برتری و فوقیت کی وجہ سے اپنے علم سے تمام واقعات کو خواہ وہ زمان و مکان میں کہیں بھی ظہور پذیر ہوں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ایک اور اہم نقطہ جو قرآن میں ایک خاص اہمیت کے لحاظ سے بہت واضح ہے وہ یہ ہے کہ زمانے کا ہمارا تصور معروضی طور پر حقیقی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یوم حشر کا نقشہ تخلیق کے ایک مختلف درجے اور ترتیب میں کھینچا گیا ہے اور اس پر ہم فوراً یہ سوچنے لگتے ہیں کہ زمانے کے متعلق ہمارے سابقہ نظریات و تصورات اب درست نہیں رہے اور یہ مطلق مکمل نہیں تھے۔

> ''جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یہ محسوس ہوگا کہ (یہ دنیا
> میں یا حالت موت میں) بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک

Marfat.com

ٹھہرے ہیں"؛ (۴۶: ۷۹) "اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے۔" (۱۰: ۴۵) "جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔" (۱۷: ۵۲)

"تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی۔" (۲۰: ۱۰۴) "پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا" بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے؟" وہ کہیں گے "ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔" ارشاد ہوگا۔ تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہونا کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا۔" (۲۳: ۱۱۲۔۱۱۴) "اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے" (۳۰: ۵۵)

مفسرین یوم حساب کے تمام حوالہ جات کا ذکر زمانہ مستقبل میں کرتے تھے کیونکہ ہمارے نقطہ نظر سے یہ مستقبل میں ہی برپا ہوگا۔ تاہم بہت سی آیات میں وہ زمانہ ماضی کا استعمال کرتے ہیں۔ مفسرین یہ فرض کر لینے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ یہ ایک ادبی طریقہ بیان ہے جو ان واقعات کے اٹل ہونے پر زور دیتا ہے۔ یوم حساب کا ذکر کرتے وقت زمانہ حال اور ماضی کے استعمال سے یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ یہ ایک بالکل مختلف ماحول میں سامنے آئے گا، ایک ایسا ماحول جس میں ہمارے موجودہ زمان و مکان کے تصورات کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ زمانے کے خیالی تصور کو "اللہ کے ایام" کے ہمارے زمینی ایام سے تقابل کے ذریعے مزید تقویت ملتی ہے۔ جہاں اللہ کا ایک "دن" ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے یا جس دن کا دورانیہ پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

Marfat.com

اللہ اور زمانے کے درمیان تعلق ونسبت پر یہاں کوئی مثال یا معیار پیش کرنے یا اسے مختصر بیان کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ میں تو یہ کہنا چاہوں گا کہ اس طرح کی کوشش لا حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات اس کے برعکس بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ زمانے کے بارے میں ہمارے تصورات معروضی طور پر صحیح اور حقیقی نہیں ہوتے۔ تصادم اور ٹکراؤ کی صورت کسی حد تک اس لئے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہم اپنے سامنے موجود تشریح وتوضیح کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''اگر اللہ نے پہلے ہی سے مستقبل مقرر اور معین کر دیا ہے تو پھر دست سوال اور دست دعا دراز کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟'' اس سوال سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دست سوال دراز کرتے ہیں تو اللہ زمانے میں موجود رہ کر قسمت میں لکھے ہوئے مستقبل میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن مستقبل کو پانے کیلئے کسی کی زمانے کے اندر موجودگی ضروری ہوتی ہے اور نتیجتاً یہ موجودگی محدود ہوگی۔ یہ سوال تضادات تک کیوں لے جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ایک تضاد کو تو پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ زمانے سے ماورا اور بالاتر بھی ہے اور وقت کے اندر محدود بھی۔ کوئی بھی سوال جو ان دو بے جوڑ اور بے میل باتوں یا قضیوں کو باہم ملا کر تسلیم کر لیتا ہے وہ ہمیشہ ایسے نتائج پر ختم ہوگا جن میں اختلاف اور تصادم پایا جائے گا۔ مثال کے طور پر یہ فرض کر لیں کہ ایک دائرہ ایک مربع ہے۔ اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ کیا ایک دائرے کے کونے ہوتے ہیں۔ اگر ہم دائرے کی گولائی پر زور دیں تب تو جواب نفی میں ہوگا اگر ہم ایک مربع شے کی صفات پر توجہ مرکوز کر لیں تو جواب اثبات میں ہوگا۔ جب کسی سوال پر کیا جانے والا غور وفکر لامحالہ متضادات پر ختم ہو تو پوچھا یہ جانا چاہئے کہ کیا خود یہ سوال کوئی معنی ومفہوم رکھتا ہے۔

''پہلے سے مقرر یا متعین'' یا مروجہ معنوں میں لفظ تقدیر ہی صرف مشکوک اور مبہم ہے۔ اگر اس کے استعمال سے یہ بتانا مقصود ہو کہ ماضی میں اللہ نے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا پروگرام تشکیل دیا تھا تو اس سے جو مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ زمانے میں اپنا وجود رکھتا ہے، وہ زمانے تک محدود ہے۔ اگر اس سے ہماری مراد یہ ہو کہ اللہ کی حکمت و دانائی ہر شے پر محیط ہے اور اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس سے متصادم نہیں ہوسکتا تب اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ''پہلے سے متعین یا مقرر'' کے بنیادی اور اساسی معانی یہ نہیں ہیں، جس کا

Marfat.com

مطلب ہے ''پیشگی یا پہلے سے تعین کرنا۔'' یہ اس تصور سے بھی متصادم نہیں ہوتا کہ اللہ ہماری التجاؤں اور دعاؤں کو سنتا ہے، یا ان کا جواب دیتا ہے۔

بہت سے مسلمانوں اور مستشرقین سکالرز کے لئے قرآنی الفاظ قدر، اور تقدیر کے معنی ہیں ''اللہ کی جانب سے اچھائی اور برائی کا پہلے سے مقسوم کر دینا'' یا دوسرے الفاظ میں اللہ نے ہمارے تمام کام پہلے سے ہماری قسمت میں لکھ دیئے ہیں یہاں تک کہ اس میں ہمارے اخلاق اور کردار و سیرت سے متعلق انتخابات بھی شامل ہیں لیکن جیسا کہ محمد علی اس ضمن میں یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ اور نظریہ ''نہ تو قرآن میں موجود ہے نہ عربی لغت میں اس کا کوئی وجود ملتا ہے۔''

پہلے سے متعین یا تقدیر میں لکھا ہوا، ایک ایسا عقیدہ و نظریہ ہے جو بہت بعد میں وجود میں آیا اور یوں لگتا ہے جیسے یہ اسلامی اور ایرانی مذہبی فکر کے درمیان تصادم کے نتیجے میں پیدا ہوا۔(۵۲)

الراغب الاصفہانی کے نزدیک قدر اور تقدیر کے معنی ہیں ''کسی شے کا تناسب اور توازن ٹھیک کرنا'' یا سیدھے سادھے الفاظ میں ''پیمائش یا ناپ تول'' قرآن میں ان کا مطلب ہے وہ قوانین خداوندی جو تناسب اور توازن پیدا کرتے ہیں:

> ''(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔'' (۸۷۔۱/۳)
>
> ''ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے۔'' (۵۴: ۴۹) اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔'' (۳۶: ۳۸۔۳۹) ''کس چیز سے اللہ نے اسے (انسان) پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔'' (۸۰: ۱۸۔۱۹)

اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ نے اس کائنات کو چند سائنسی قوانین کے تابع کر کے پھر اسے چھوڑ دیا ہو کہ یہ اپنے مقررہ راستے پر چلتی رہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا کوئی انسان بھی یہ تاثر نہیں لیتا۔ قرآن میں خدا کو الرب کہا گیا ہے۔ جو پرورش کرنے والا،

Marfat.com

محبت کرنے والا، قوانین کی پابندی کرانے والا اور سب کا حاکم اعلیٰ ہے۔ وہ ہر کہیں فطرت میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے والا دانا و بینا ہے۔

حیات انسانی کا مقصد

ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ادراک سے آگے اور بھی موجودات ہیں اور زمانہ ایک موہوم اور خیالی شے ہے لیکن یہ تسلیم کرلینا کہ ہماری نیکیاں اور اچھائیاں محض توا ہم ہیں، فریب نظر ہیں اور اللہ کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتاتی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کی اطاعت کا کوئی مقصد نہیں۔ اگر ہمیں اللہ پر ایمان لانا ہے تب ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ عدل و انصاف، محبت، ہمدردی، عفو و درگزر، سچائی اور رحم دلی سے متعلق ہمارے تصورات غالباً ناقص ہیں لیکن اس کے باوجود کسی ایسی اصلی و حقیقی شے سے ترکیب پاتے ہیں جس کا منبع و سرچشمہ اللہ ہو۔ اسی وجہ سے زندگی اپنی تمام تر مصیبتوں اور زبوں حالی، غلطیوں سے سیکھنے کے عمل سمیت اس قدر غیر معتدل اور غیر منطقی ہے۔ یہ کیا ممکنہ مقصد پورا کرتی ہے؟ جنتی زندگی کا آغاز کیوں نہیں ہوتا؟ اور پھر بھی قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ کے اپنے منصوبے کے مطابق ہماری ارضی زندگی انسانی وجود کا ایک ضروری مرحلہ ہے:۔

> ''جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔'' (۳:۱۹۱)

> ''ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس کر لیتے۔'' (۲۱:۱۶۔۱۷) ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟ پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی۔'' (۲۳:۱۱۵۔۱۱۶)

Marfat.com

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے اعمال کو تمہاری نیتوں سے جانچا جائے گا'' (۵۳) مقصد حیات کے بارے میں ہماری پہلی تجویز اور مشورہ یہ ہے جو قرآنی تصدیق سے مل کر اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ صحیح عقیدے، نیک اعمال، اس زندگی کی خوشی اور آخرت کی خوشی و مسرت سے واقف ہو جائیں، اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھ لیں اور ان پر جزوی ایمان لانے کے بجائے مکمل ایمان لے آئیں پھر ایمان کے نتیجے میں اچھے اعمال پیش ہونے چاہئیں اور دائمی خوشی و مسرت حاصل ہونی چاہئے۔ نیک کام جب نیک نیتی سے کئے جائیں تو اس سے ایمان میں مضبوطی، اطمینان وسکون اور بہتری پیدا ہونی چاہئے۔ اسلام میں اللہ کو ہمارے اعمال کی احتیاج نہیں اور نجات محض ظاہری عبادات اور رسم پرستی سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ انسانی رشتہ و تعلق میں سچے ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کیلئے فکرمند ہو اور معاشرتی زندگی میں ان کے کام آئے۔

> ''نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کیلئے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلام کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔''
> (۲:۱۷۷)

> ''اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے۔ پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کئے بیٹھے

ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لئے مسخر کیا ہے تا کہ تم شکریہ ادا کرو۔ نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔'' (۲۲: ۳۶۔۳۷) ''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو'' (۳: ۱۱۰) ''جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا، اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔'' (۲۹: ۶)

''یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمان ان کے لئے دِلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ پس اے محمد ﷺ اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم پرہیز گاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔'' (۱۹: ۹۶۔۹۷)

قرآن ہماری زندگی اور اخروی زندگی کی مسرتوں اور پریشانیوں کو انسانی رشتوں اور تعلق میں ہمارے اعتقادات اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے عمل سے منسلک کرتا ہے۔ پس ہمیں اپنی زندگی کے ہر پہلو میں آزمائشیں اور امتحانات ملتے ہیں۔ یہ وابستہ ہوتے ہیں ہماری بیویوں، بچوں، والدین، عزیز و اقارب، ناداروں، محتاجوں، یتیموں، مسافروں، مال و دولت اور ہمارے دنیاوی جھگڑوں اور تصادمات کے ساتھ۔ ہم جانتے ہیں کہ دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے، ہمدردی ورحمدلی، عدل وانصاف بہتر ہیں اس لئے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں حقیقی خوشی اور اطمینان بخشتی ہیں۔ قرآن یہ تصور دیتا ہے کہ بے شک مادی اشیاء سے ہماری قربت ضروری ہے مگر ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ''بہترین ٹھکانا تو اللہ کے پاس ہے۔''

''لوگوں کے لئے مرغوبات نفس۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی، زرعی زمینیں۔ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو

Marfat.com

بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟" (۳: ۱۴۔۱۵) قرآن پھر آگے چل کر آنے والی زندگی کی روحانی خوشی کا ذکر کرتا ہے جو ان کیلئے ہے جو یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں:

"یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں، فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں" (۳: ۱۷)

میں نے اپنے بچپن میں باپ سے پوچھا کہ کیا ان کے خیال میں ایسا ممکن ہے کہ کوئی جنت بھی ہوگی۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس تصور کا نہیں کر سکتے کیونکہ انسان حسد، نفرت، حرص اور اس غصے پر کبھی قابو نہیں پا سکتا جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔ کسی حد تک میرا خیال ہے وہ صحیح کہتے تھے کیونکہ انسان جب تک نیکی اور اچھائی کے اعلیٰ مقام تک ترقی کر کے نہیں پہنچ جاتا نہ تو وہ تجربہ کر سکتا ہے نہ وہ جنت اور بہشت میں رہ سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ انسان ہر لحاظ سے بے عیب بن جائے مگر اس قدر بے عیب ضرور بننا چاہئے تاکہ اس مرد یا عورت پر جب اس دنیاوی زندگی کی حقیقت اور مقصد حیات واضح ہو تو جو عیب موجود ہوں ان پر قابو پالیا جائے اور انہیں دھو ڈالا جائے۔

"ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے" (۷: ۴۳)

"اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔" (۲۹:۷)

اور یوں مقصد حیات ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی نشوونما میں نیکی، دانائی، عدل و انصاف، رحم، عفو و درگزر، دوسرے انسانوں کی فکر اور ان سے محبت، کوشش و جدوجہد کو ساتھ

Marfat.com

ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہے۔ قرآن پاک میں ان صفات کو سچے ایمان کی خوبیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ہمیں ان کو صرف اس لئے نہیں اپنانا کہ اس دنیا کو ایک بہتر جگہ بنائیں بلکہ اس یقین کامل کے ساتھ اپنانا ہے کہ یہ ایسی اعلیٰ وارفع صفات ہیں جو واحد ابدی سرچشمے سے نکلتی ہیں۔ اللہ سے۔ ان صفات کو ترقی دے کر ہم اپنے آپ کو اس قابل بنا لیتے ہیں کہ اللہ کے رحم وکرم، عفو و درگزر، عدل و انصاف، محبت اور دوسری صفات اپنی ذات میں پیدا کرسکیں ان معنوں میں ہم اللہ کے قریب تر ہونے کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر محبت کو لے لیجئے۔ ہم جس قدر محبت کے بارے میں زیادہ جانتے ہوں گے اسی قدر زیادہ ہم اللہ کی محبت کا تجربہ کرسکیں گے۔ ہم اس بات سے واقف ہیں کہ میرے بیٹے کا میری محبت کا تجربہ میرے کتے کی میری محبت کے تجربے سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہ میری مچھلی کے تجربے سے بڑا ہے۔ اس لئے کہ ایک بچے کا تجربہ کتے کے تجربے سے زیادہ اور ایک کتے کا مچھلی کے تجربے سے زیادہ ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اپنے والدین کیلئے میری محبت آج اس دور کی محبت سے کہیں زیادہ ہے جب میں بچہ تھا، ایسا اس لئے ہے کہ اب میرے اپنے بچے ہیں اور میں پہلے سے کہیں بہتر اور زیادہ اس بات کو محسوس کرسکتا ہوں کہ میرے ماں باپ مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہوں گے۔ پس ہم جس قدر اوپر بیان کی گئی صفات کو بڑھائیں گے اسی قدر اللہ کی عظمت اور جمال کا ہمارا تجربہ بڑھے گا، یہاں بھی اور حیات بعد الممات کی دائمی گھڑیوں میں بھی۔

قرآن پاک میں قیامت کے روز کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب تند و تیزی میں بے حد وحساب اضافہ ہو جائے گا، اس سے ہماری اس دنیا کی زندگی کی جدوجہد کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس روز ہم اس سچائی کا مقابلہ کریں گے کہ ہم کیا بن گئے ہیں، کیونکہ تمام دنیوی بدحواسیاں اور اشاراتی وغیر واضح باتیں چھین لی جائیں گی اور ہمارے پاس ہمارے اعتقادات اور اخلاقی وروحانی سرمایہ ہی رہ جائے گا جسے ہم دنیا سے کما کر ساتھ لائے ہوں گے۔ ''پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔'' (۹۹: ۷۔۸) اگر قرآنی اصطلاح استعمال کریں تو ''میزان'' میں ہم اچھے ہیں تو ہم انتہائی خوشی ومسرت اور بہتری کے تجربے سے گزریں گے۔ اور اگر ہم بنیادی طور پر بُرے ہیں تو

Marfat.com

ہم بہت بڑے خسارے میں ہیں۔ اس خوشی یا غم کو ہم پر مسلط نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ہماری اخلاقی اور روحانی نشوونما کے ساتھ بڑے گہرے طریقے سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہم جوں جوں نیکی و پارسائی کی مختلف سطحوں پر پہنچتے ہیں قرآن اور حدیث مبارکہ ہم پر واضح کرتے ہیں کہ جنت و دوزخ کے مختلف درجے ہیں۔ رحم مادر میں آخری مراحل میں بچہ جس طرح اپنے وجود کی آئندہ کی سطح کو فیصلہ کن انداز میں متاثر کرتا ہے، اسی طرح اس زندگی میں ہمارا اخلاقی و روحانی ارتقاء ہماری آخرت کی زندگی سے جزو لاینفک کے طور پر پیوست ہے۔ گویا یہ بات واضح ہوگئی کہ

''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔'' (۱۷:۱۵)

زندگی تجربات کا مجموعہ ہوتی ہے جو جنت کی روحانی مسرت کی طرف معمولی سا اشارہ کرتے ہیں۔ اپنے بچے کیلئے ماں یا باپ کا پیار ایسا ہے جس میں بے لوث اور جذباتی قربانی و ایثار سے لبریز محبت اور اعلیٰ انسانی اوصاف کا اظہار ملتا ہے۔ میں جب رات کو اپنی تین بچیوں کو سویا دیکھتا ہوں تو میرے دل میں پدری محبت و پیار کے ایسے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں کہ میری آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ میری اہلیہ اور میں انہیں کھڑے کھڑے تصور میں گلے لگاتے ہیں اور محبت کی گرمی سے بھرپور ہمارے جذبات طوفان کی صورت امڈ آتے ہیں جن کے بارے میں مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ''یہ دنیا اور دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔''

خوشی اور نشوونما کی ان صلاحیتوں کے ساتھ اخلاقی زوال و پستی اور مصائب و پریشانیوں کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ مگر کیوں؟ ایک شخص یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ محبت، رحم دلی، سچائی اور ایسی ہی دوسری صفات اور خوبیاں بہت بڑی خوشی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ تو ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم نے جہاں سے آغاز کیا تھا ہم اب وہاں پہنچے ہیں۔ زندگی کا آغاز جنت سے کیوں نہ ہوا؟ یہ تمام اوصاف اور نیکیاں ہماری سرشت میں کیوں نہ شامل کر دی گئیں؟

اس کا جواب کم وبیش واضح ہے۔ وہ نیکی جو نظام العمل میں شامل ہو وہ سچی اور اصلی نیکی نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ کوئی کمتر شے ہی ہوتی ہے۔ آپ کمپیوٹر کے لئے تو نظام العمل مقرر کر سکتے تھے کہ وہ کبھی غلط بیانی نہ کرے لیکن وہ سچا کمپیوٹر تو نہیں بن جاتا۔ نہ ہی کوئی جسم کی عکاسی کرنے والا لاشعاعی آلہ رحم و ہمدردی کے جذبات رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ اسے بیماروں کی مدد کیلئے بنایا جاتا

ہے۔قرآن فرشتوں کو کبھی نافرمانی نہ کرنے والی مخلوق کے طور پر پیش کرتا ہے اور انسان کو استعداد اور مخفی قوت کے لحاظ سے زیادہ بڑا دکھایا ہے مگر ساتھ ہی کبھی کبھی نافرمان اور نااطاعت گزار بھی۔ انسان کے اخلاقی وروحانی ارتقاء کے قرآن نے تین ضروری عناصر ترکیبی بتائے ہیں۔اپنی مرضی و منشا کا مالک ہے، انتخاب کی اہلیت رکھتا ہے، عقل وشعور سے نوازا گیا ہے تاکہ اپنے چنے ہوئے کاموں کے نتائج کا بھی خود ہی ذمہ دار ہو اور ان سے سبق سیکھے اور تیسرا یکساں طور پر اہم عنصر یہ ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں آفات ومصائب سے گھرا ہوتا ہے۔

آیئے پچھلی دونوں مثالوں کی طرف لوٹتے ہیں۔سچا بننے کیلئے سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہوئے اسے جھوٹ بولنے کا موقع بھی ملتا ہے اس لئے اسے عقل وفہم سے کام لے کر انتخاب کرنے اور چننے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ہم دیانتداری کے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتے ہیں اگر ہم مشکلات میں بھی سچائی پر ڈٹے رہیں، یا یوں کہیے کہ جسمانی اور مادی نقصان کے خدشے کے باوجود ہم ثابت قدم رہیں۔رحم دلی وہمدردی کے جذبات میں اضافے کیلئے مصائب اور پریشانیوں کی بھٹی سے گزرنا اور درگزر کرنے کا انتخاب حاصل ہونا ضروری ہے اور یہی معاملہ تمام نیکی کی باتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔محبت، صدقہ وخیرات، عدل، عفو ودرگزر، اور دوسری تمام نیکی کی باتوں اور اچھائیوں کے ساتھ۔ان میں سے ہر ایک میں مختلف مدارج حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس متبادل کے طور پر بھی کچھ ہونا چاہئے تاکہ ان کے برعکس ہم جس کی طرف جا سکیں اور اس بات کا بھی امکان موجود رہے کہ نفرت، لاتعلقی، حرص، انتقام اور مشکلات یا دکھ درد بھی ہمارے راستے میں موجود ہیں۔بے شک شروع ہی سے ہمارا میلان اچھائی اور نیکی کی جانب ہونا چاہئے، کم ازکم جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو نیکی و پارسائی کا بیج تو ہم میں بو دیا جائے۔مسلم مفسرین نے قرآن کے اس بیان اور ارشاد باری تعالیٰ کو اس طرح سمجھا:

''اس میں (آدمی میں) اس نے اپنی روح پھونک دی۔'' اور حدیث نبوی کے مطابق ہر بچہ اللہ کے حضور جھک جانے اور مطیع وفرمانبردار بن جانے کی فطرت اور میلان لیکر پیدا ہوتا ہے۔(۴۵)

ہمارا یہ تصور کہ مصائب و پریشانیاں، مشکلات اور اخلاقی و روحانی ارتقاء کیلئے ہماری

Marfat.com

جدوجہد ضروری ہے اور ہمیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ مشکل وقت میں زندگی کا اصلی اور بنیادی مقصد کیا ہے قرآن میں اس کا ذکر بار بار ہوا ہے۔

''اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے......'' (۲:۱۵۵۔۱۵۶)

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول ﷺ اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے'' (۲:۲۱۴)

''مسلمانو تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی۔'' (۳:۱۸۶)

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔'' (۸۴:۶)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے'' (۳:۲۰۰)

پس زندگی عروج وزوال کا ایک مسلسل عمل ہے حالانکہ اللہ ہمیں بے شمار مواقع فراہم کرتا ہے کہ ہم رہنمائی پاسکیں، اور اللہ ہی کہ ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی

Marfat.com

موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو ہم سب کو ہدایت دے دیتا۔ ہم غلطیاں اور گناہ کرتے ہیں، ان پر نادم ہوکر توبہ کرتے ہیں اور پھر ان سے سبق سیکھ کر اچھائی اور نیکی کے اعلیٰ وارفع مدارج تک پہنچ جاتے ہیں۔ گویا وہ گناہ اور غلطی، جس کا احساس ہو جائے اور جس پر سچے دل سے توبہ کرلی جائے وہ آخرکار ہمیں بلند درجے پر لے جاتی ہے۔

''جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے، وہ بڑا غفور ورحیم ہے'' (۲۵: ۷۰)

مثال کے طور پر اللہ کا انکار بلا شبہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے لیکن اس کا ارتکاب کر کے اور پھر اس کی پاداش میں جو بڑا نقصان ہوتا ہے اور جو خلاء محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس گناہ سے وہ انسان معذور ہوگیا ہے مگر اس کے بعد جب ایمان کی دولت ملتی ہے تو یہ بڑا درد آمیز مگر قیمتی تجربہ ہوتا ہے، اس لئے کہ ایمان کو رد کرنے کے نتائج انتباہ سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہ اندرونی طور پر اپنائے ہوئے سبق بن جاتے ہیں۔ گناہ کرنے، احساس گناہ اور توبہ کرنے کی صلاحیت ختم ہوجائے تو ہماری روحانیت پر جمود طاری ہوجائے۔ اس دنیا کی زندگی میں یہ ہماری ترقی کیلئے اس قدر اہم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر بنی نوع انسان گناہ کرنا چھوڑ دے تو اللہ ان کی جگہ کوئی اور مخلوق پیدا فرما دے گا جو گناہ کرنا جاری رکھیں اور توبہ کر کے اس سے معافی کے خواستگار ہوں۔ (۵۵) (مسلم)

قرآن پاک کی کئی آیات میں ہم پڑھتے ہیں: اللہ جسے چاہے سیدھا راستہ دکھا دے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔'' گولڈن زیہر ایسے بیانات پر بحث کرتا ہے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ براہ راست مؤخر الذکر کو گناہ کے ارتکاب کی جانب لے جاتا ہے۔ فیصلہ کن فعل ''اضل'' اس سیاق وسباق میں استعمال نہیں ہوا جس سے ہم یہ سمجھ لیں کہ اس کے معنی ہیں ''گمراہ ہوجانا'' بلکہ اس کے معنی ہیں ''گمراہ ہونے یا بھٹکنے کو چھوڑ دینا'' یعنی کسی شے کی پرواہ نہ کرنا، اس کو مشکل صورت حال میں راستہ نہ دکھانا۔ ''ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ (۶: ۱۱۰) ہمیں اس مسافر کو تصور میں لانا چاہئے جو تنہا ریگستان میں سفر کر رہا ہے۔ قرآن کے طرز کلام کے پیچھے رہنمائی اور گناہ کا یہی تصور کارفرما ہے۔

Marfat.com

سرگرداں مسافر لامحدود وسعتوں میں اپنی حقیقی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش میں ہوتا ہے ایسا مسافر وہ انسان ہے جو زندگی کے سفر پر ہے۔(۵۶)

بھٹک جانے کا تصور اور پھر رہنمائی حاصل کرنا، ہدایت پانا، یہ ایسی بات ہے جسے کئی توثیقی اعلانات کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ ہمارا میلان اور رغبت دیکھ کر اور ہمارے انتخاب پر ہدایت دیا کرتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ فاسق و نافرمان کو ہدایت نہیں دیتا، وہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا نہ ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اللہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے جو اس کے احکامات پر دھیان دیتے ہیں، مخلص اور نیک نیت ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں۔ ''پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے، اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا'' (۶۱:۷) (۵۷) اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ جن کی رہنمائی فرماتا ہے ان میں اخلاص، خلوص نیت اور آمادگی موجود ہو تو تب یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور یقیناً اللہ اپنے پکارنے والوں اور تلاش کرنے والوں کو ضرور جواب دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

> ''اور اے نبی، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں'' (۱۸۶:۲)

مسلمانوں کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بہت پسندیدہ حدیث ہے:

> ''اگر کوئی اللہ کی جانب ایک بالشت بڑھتا ہے تو وہ اس کی جانب دو بالشت آتا ہے اور اگر کوئی اس کی جانب چل کر آئے تو وہ دوڑتا ہوا آتا ہے۔'' (۵۸)

قرآن کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کا انعام، نیک اعمال کا صلہ بھی ہمیں ملتا ہے اور ہمارے برے کاموں کی افتاد بھی ہم پر پڑتی ہے:۔

> ''جو شخص بھی معاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کیلئے کرے گا اللہ یقیناً دنیا

جہاں والوں سے بے نیاز ہے۔'' (۲۹:٦)

''دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔'' (٦: ۱۰۴)

''(اے نبی ﷺ) ہم نے سب انسانوں کیلئے یہ کتاب برحق تم پر نازل کردی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لئے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہوگا، تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔'' (۴۱:۳۹)

جیسا کہ ہم اوپر دی گئی آیات میں دیکھ سکتے ہیں اسلام کا تصور گناہ انسان کی اپنے ہاتھوں اپنی ہی تباہی اور اپنی اصل فطرت کے خلاف بغاوت ہے:

''لو اب عذاب جہنم کا مزہ چکھو، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔'' (۳: ۱۸۲)

''انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہوگئے۔'' (۷: ۵۳)

مگر اسکے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے'' (۹: ۷۰)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے'' (۳۹: ۵۳)

''گناہ'' کے لئے مستعمل عربی لفظ جو بار بار استعمال ہونے والے اس جملے میں آتا ہے وہ ہے ''ظلم'' وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔'' یہ فعل ظلم سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ''ناانصافی

Marfat.com

کرنا، زیادتی کرنا، کسی مرد یا عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کرنا۔" جو لفظ گناہ کے تصور پر مزید زور دیتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کے معنی پہناتا ہے۔ جب ہم، جیسا کہ قرآن میں کئی مقامات پر آتا ہے، اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ساتھ ناانصافی اور ظلم کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ ہم اپنے روحانی مراتب اور درجات پر ڈاکہ ڈال کر ان سے اپنے آپ کو محروم کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

صراط مستقیم

سگمنڈ فرائڈ نے انسانی نقش پر اثر انداز ہونے والے تین عناصر کی نشاندہی کی ہے:۔ ذات، انانیت اور خودی۔ عام اصطلاح میں ذات نفسیاتی توانائی کا وہ وسیلہ ہے جو ان حیوانی خواہشات کو تیز تر کرتا ہے جو کسی فرد کے حیاتیاتی وجود کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً حرص، طاقت، شہوت، حسد اور غرور و تکبر۔ خودی ہماری نیکی، اخلاق اور خطا کے تصور کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہ اعلیٰ وارفع کوششوں کی جانب ہمارے لئے کشش پیدا کرتی ہے انانیت وخود پسندی محض وہ ذہانت ہے جو ذات کی ضروریات کو کنٹرول کر کے ان میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور اس سلسلے میں معاشرے اور خودی کے مطالبات کو سامنے رکھتی ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ ایک صحت مند شخصیت وہ ہے جس میں انانیت دوسری دو قوتوں کو مؤثر طور پر اعتدال میں رکھتی ہے اس لئے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی دوسری دو پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے تو فرد یا تو معاشرتی طور پر تباہ ہو جاتا ہے یا اپنے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریے نے بہت سے دوسرے لوگوں کی کوششوں کو جنم دیا جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان تین ترغیبات کا منبع کیا ہے۔

اسلامی تصور اور نظریے میں یہ تین قوتیں بڑی حقیقی ہیں اور شیطانی، ذاتی اور ملکوتی نظریات وتصورات میں گڑھی ہوئی ہیں۔ شیطانوں کی مخلوق اللہ کی وہ مخلوق ہے جو ہمارے دلوں اور دماغوں میں وسوسے ڈالتی ہے تاکہ ہماری جھوٹی خواہشات کو ابھارنے میں کامیاب ہو جائے۔ فرشتے (۵۹)، دوسری مخلوق کے درمیان روحانی عظمت اور ایثار وقربانی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ذات وہ انسانی شخصیت ہے جسے ان ترغیبات میں اعتدال پیدا کرنے کی

Marfat.com

کوشش کرنی چاہئے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک بنیادی مقصد ہے، جسے اگر مؤثر طریقے سے کنٹرول کرلیا جائے تو اس سے انسان کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان کو پیدا کیا جاتا ہے جو اس کی گھٹیا نفسانی خواہشات کو انگیختہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ جو فرشتہ پیدا کیا جاتا ہے وہ اس کے اعلیٰ تصورات اور نیک خواہشات کو تحریک دیتا ہے۔ جب محمد ﷺ سے آپ ﷺ کے حاضرین نے پوچھا کہ کیا آپؐ کے ساتھ بھی شیطان پیدا کیا گیا ہے تو حضور ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں، مگر اللہ نے میری مدد کی تاکہ میں اس پر حاوی ہو جاؤں اور وہ مغلوب ہو کر مجھے اچھائی کے علاوہ کسی اور کام کی ترغیب ہی نہیں دیتا'' (۶۰)

روحانی اور مادی دنیا متضاد قوتوں کا امتزاج ہے اور اس حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''ہم نے ہر شے کے جوڑے پیدا کئے ہیں'' (۶۱) وہ ایک دوسرے سے مل کر یہ کائنات بناتے ہیں جس میں اس نے ''میزان'' قائم کردیا ہے اور ان کے لئے اللہ نے ایک قدر، اک قانون اور پیمانہ مقرر کردیا ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے ''امت وسط'' بنایا ہے جو دو انتہاؤں کا درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں، روحانی اور مادی کے درمیان اعلیٰ، وارفع اور کم تر و پست۔ اور ایسا کرنے میں وہ رہنمائی، عمل، جدوجہد اور غلطی کے ذریعے سیکھنے کے عمل کے ذریعے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قرآن جسے ''تقویٰ'' کہتا ہے وہ اس میں برتر و اعلیٰ مقام کے حصول کی کوشش کرتا ہے جسے عموماً ترجمہ کرتے وقت ''خوف اور ڈر'' کے معانی پہنائے جاتے ہیں جبکہ اس کے حقیقی معانی ''چوکس اور ہوشیار رہنا'' ''مدافعت کرنا'' اور اسلامی اصطلاح میں ایک ایسی حالت جس میں ذاتی تنقیدی باخبری اور ایمان کے تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا جذبہ موجود ہو (۶۲) قرآن پاک میں جہاں منافقین، جھوٹوں، بزدلوں اور کنجوسوں کا ذکر آیا ہے وہاں ایمان والے کو اس کی ان صلاحیتوں کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے جن کے ضائع ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس طرح کی سرزنش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایمان والے اپنی نیک نیتی پر توجہ دیں۔ یہ ایک طرح سے یاد دہانی بھی ہے جو قرآن پڑھنے والے کو اس کی ذات سے واقف کراتی ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ نے پہلی بار نزول وحی کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ان کے پاس حاضر ہوا جس نے آپ کو بغلگیر کیا، بھینچا اور آپؐ سے فرمایا کہ ''پڑھ''

Marfat.com

(اقراء) حضور ﷺ نے جواب دیا کہ وہ پڑھنا نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ امی تھے۔ فرشتے نے دوسری بار آپ کو بغلگیر ہو کر بھینچا اور فرمایا کہ وہ پڑھیں۔ حضور ﷺ نے اس بار بغیر کسی خوف اور ڈر کے وہی جواب دہرایا۔

تیسری بار کے بعد حضرت محمد ﷺ نے محسوس کیا جیسے ان کا سینہ بڑی آب و تاب کے ساتھ منور ہو گیا ہے اور آپؐ نے سمجھ لیا کہ آپ کو تلاوت کرنی ہے جو آپؐ نے کی۔ آپ نے سورۃ نمبر ۹۶ کی پہلی چار آیات پڑھیں (۶۳)۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں یہ واقعہ قرآن پاک کی تلاوت کے تجربے پر مشتمل ہے۔ کچھ آیات میں ہے قرآن روشن و منور کر دیتا ہے، کچھ میں خوف اور ڈر پیدا کرتا ہے اور کچھ میں ہے کہ گلے لگا لیتا ہے اور کچھ میں اطمینان بخشتا ہے اور ہمت و حوصلہ دیتا ہے۔

مذہبی رسومات کے مطابق عبادات، روزہ، زکوٰۃ اور حج ایک فرد کو تمام عمر سہارا دیتے ہیں۔ وہ اسے مقصد حیات یاد دلاتے ہیں اور اندرونی قوت، قوت فیصلہ اور کردار سازی میں مدد دیتے ہیں تا کہ وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔ جب کوئی ایسا شخص جس کی پرورش مغرب میں ہوئی، مسلمان ہو جاتا ہے تو ایسے مرد اور عورت اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی کونے کھدرے میں رینگ رہے ہیں۔ وہ اچانک ایک تشکک اور صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو خاندان، دوست اور رفقائے کار بھی انہیں رد کر دیتے ہیں۔ ایسا محض اس لئے ہوتا ہے کہ صدیوں سے مغرب اسلام کے بارے میں عداوت اور غلط فہمیوں کا شکار رہا ہے۔ ایک نو مسلم کیلئے یہ وقت بے حد مشکلات کا ہوتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے نماز نے بڑی مدد دی اور اطمینان بخشا۔ نماز فجر کو ایک خاص تفوق حاصل ہے اور میں نے دیکھا کہ ہر صبح ۵ بجے بستر سے نکلنا تا کہ نماز فجر ادا کر سکوں ناممکن نظر آتا تھا مگر میں نے اس کیلئے ایک حکمت عملی وضع کر لی تھی۔ (۶۴) میں نے تین الارم والی گھڑیاں لے کر ان کے وقت میں پانچ پانچ منٹ کا فرق سیٹ کر لیا تھا اور انہیں اپنے سونے کے کمرے اور غسل خانے کے درمیان رکھ دیا تھا جب پہلا الارم ۴:۵۰ بجے میرے سرہانے بجتا تو میں اس کا بٹن دبا کر اسے خاموش کرا دیتا اور حسب معمول سو جاتا۔ پانچ منٹ بعد میرے سونے کے کمرے اور غسل خانے کے درمیان رکھی ہوئی گھڑی کا الارم بج اٹھتا، میں رینگ کر وہاں پہنچتا

Marfat.com

اور اسے بھی خاموش کرا کے پھر آ کر سو جاتا۔ اب آخری گھڑی جو غسل خانے میں تھی جب پانچ منٹ بعد الارم دیتی، میں اٹھ کر اسے بھی خاموش تو کر دیتا مگر اب میں چونکہ غسل خانے کے اندر پہنچ چکا ہوتا اس لئے نماز کیلئے وضو کر لیتا۔

مجھے جب ہر صبح اپنی نیند کی خواہش پر فتح حاصل کر کے بیدار ہو جانے کی عادت پڑی تو اس سے مجھے ایک خاص قسم کی طاقت حاصل ہوئی۔ اب میں نے عدم تحفظات سے نبرد آزما ہونے کیلئے اپنے آپ کو زیادہ تیار پایا۔ میں اپنے دوستوں کو بتاتا کہ آپ کے اعتقادات کوئی بھی ہوں اگر آپ لوگ ہر صبح پانچ بجے بستر سے نکل آنے کیلئے اپنے آپ کو منظم کر لیں تو آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ کوئی چیلنج بھی آپ کیلئے بڑا چیلنج نہیں ہے۔ وقت گزرنے پر، چند ہی ہفتوں بعد مجھے دو الارم والی گھڑیوں کی ضرورت رہ گئی تھی اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے صرف ایک گھڑی ہی کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔ پھر تو ایسا بھی ہوا کہ میں گھڑی کو چابی دینا بھول جاتا اور الارم نہ بھی بجتا تو میں وقت پر جاگ جایا کرتا تھا۔ تمام اسلامی مذہبی رسومات میں کردار کی آزمائش اور کردار سازی کیلئے یہی عنصر کارفرما ہوتا ہے۔

ایمان لانے کے بعد ایک خاص احساس راحت وطمانیت حاصل ہوتا ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں مذہبی عبادات روزمرہ کا ایک معمول بن جاتی ہیں اور بوجھل محسوس ہوتی ہیں اور جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں نئے ایمان لانے والے بتاتے تھے کہ یہ مذہبی عبادات کس طرح ان کے لئے اہم آزمائش بن جاتی تھیں اور قوت ارادی کو مضبوط بنانے میں مدد دیتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب یہی احباب بتاتے تھے کہ اب یہ نمازیں نظم وضبط کی بات کم اور حصول اطمینان وسکون کا ایک تجربہ محسوس ہوتی تھیں اور اب ان کے اندر سے یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ نماز، روزہ اور دوسری مذہبی رسومات کی پابندی کریں۔ مزید آگے چل کر ایک مرحلہ ایسا آیا اور یہ ان کی روزمرہ زندگی کی اس تگ ودو کے ساتھ پیوستہ تھا جس میں یہ اپنے آپ کو اور بہتر اور اچھے مسلمان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مذہبی رسومات خصوصاً نمازیں تو ایک نہایت طاقتور جذباتی اور روحانی معرکہ تھا۔ ایک ایسا وقت جس دوران وہ بڑی شدت کے ساتھ اللہ کی موجودگی کے خیال سے چوکس رہتے تھے جہاں اب یہی نماز محض محبت کرنے تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ انہیں آغوش رحمت مل جاتی ہے۔ اور یہ وہی

Marfat.com

محبت ہے جو اب ان کی زندگیوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی رسومات کی حیثیت ایک ایسے دروازے کی ہے جو زندگی کے سانس کی جانب کھلتا ہے، ایک ایسی زندگی جو زیادہ حقیقی اور زمین پر موجود ہر شے سے زیادہ جاندار ہو اور آخر کار یہ روحانی زندگی کی تمنا اور محبت انہیں فتح کر لیتی ہے۔

تاہم اسلام میں پرستش مذہبی رسومات سے آگے کی بات ہے۔ دوسرے بہت سے اسلامی نظریات کی طرح اس کی روح یا جوہر اس کے عربی مصدر کی ہیت میں ملتے ہیں۔ پرستش کیلئے اسلامی اصطلاح ''عبادۃ'' ہے جس کا مصدر ''عبد'' ہے (یعنی غلام) عبادت کا مقصود اللہ کی اطاعت وغلامی میں اپنے آپ کو مکمل طور پر دے دینا ہے۔ اس کے حیات پرور مضمرات اس کی نفی میں ملتے ہیں۔ بت پرستی اللہ کے ماسوا کسی اور کی غلامی قبول کر لینا ہے۔ اور اس کے نتائج اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لینے پر ختم ہوتے ہیں۔ جب قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

''کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟'' (۲۵: ۴۳)

تو یہ اس شخص کا ذکر ہے جو اپنی خواہشات کا غلام بن گیا ہو۔ اسی طرح قرآن ان لوگوں کی مثالیں بھی پیش کرتا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو طاقت، حرص، روایت پرستی، غرور و تکبر، مال و دولت اور مختلف قسم کی آرزوؤں اور دوسرے انسانوں کا غلام بنا لیا ہو۔ ان چھوٹے معبودوں میں سے کسی ایک کی بھی غلامی کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ عبادت جو صرف اللہ کی کی جانی چاہیئے وہ کسی اور معبود کی کی جارہی ہے اور اللہ کا ہمسر اور حریف پیدا کر لیا گیا ہے اس سے نشوونما رک جاتی ہے اور ایسے افراد اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کرتے اور اپنی تباہی و بربادی کی جانب بڑھنے لگتے ہیں، انسان کیلئے اطمینان اور خوشی کی بات اپنی صلاحیتوں کو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے کی جانب موڑ دینا ہے اور یہ منزل اس کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونی چاہیئے۔ ایک مسلمان مرد یا عورت جب اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے ہیں تو وہ ایسا کسی احساس شکست یا کسی ذلت واہانت کے تصور سے نہیں کرتے بلکہ اس مرد یا عورت کو یہی واحد راستہ نظر آتا ہے جو حقیقی آزادی کی طرف لے

Marfat.com

جانے والا نہایت موزوں اور شایان شان راستہ ہوتا ہے۔

پس ایک مسلمان کے لئے اسلام مذہب سے زائد کوئی شے ہے۔ یہ ایک نظام ہے رہنمائی کرنے والا، اس کا اندر کی سمت جانے والا راستہ اس کی ذات کی گہرائیوں تک جاتا ہے اور باہر کی جانب والا راستہ اس کے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق ورشتے تک پہنچتا ہے، اور آخری منزل ہوتی ہے اس کی مراجعت اپنے رب کی طرف ایک مرد یا عورت دن میں پانچ وقت کی نماز کے دوران کم سے کم سترہ بار اللہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں: ''اے ہمارے رب ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' یہ وہ وسطی راستہ ہے جو سکون وطمانیت کی طرف جاتا ہے۔ یہ مل جائے تو ایک ایسا راستہ سامنے آ جاتا ہے جو اس زندگی کے ایک طاقتور، خوبصورت، پرسکون سکھ چین والی سمت جاتا ہے اور آنے والی زندگی میں اس سے بھی بڑے اور لامحدود مقام تک لے جاتا ہے۔ زندگی ایک جدوجہد اور تلاش وجستجو ہے ایک حیرت انگیز، اعلیٰ وارفع اور نہایت شیریں کشمکش سپردگی تک۔ ہر انسان خواہ اسے احساس ہو یا نہ ہو اطاعت گزاری کے لئے تڑپتا اور اس منزل تک پہنچنے کیلئے بے چین رہتا ہے...... یہ منزل ہے............ اسلام......

اندرونی نکات غور وفکر

مقدس صحیفے بے چینی و بے قراری کی کیفیت کے ساتھ ہمیں ہمارا اصل دکھاتے ہیں اور یوں ہمارے راز ہائے سربستہ اور کمزوریوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس ذکر کو پڑھنا تکلیف دہ ہوسکتا ہے، ہم سے ایسے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں کہ ہم یا تو انہیں نظر انداز کرنا چاہیں گے یا ان کے جوابات کو ملتوی کر دینا پسند کریں گے۔ رفتہ رفتہ اور غیر محسوس انداز میں قرآن ہماری قوت برداشت کو کمزور کرتا ہے۔ غیر متوقع طور پر وہ آیات جو ہماری انسانیت ظاہر کرتی ہیں جبری وصولی شروع کر دیتی ہیں اور اپنا معاوضہ لینا شروع کرتی ہیں:

''(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے
جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر
جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس

Marfat.com

نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی...... یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اس کیلئے پھر کوئی نور نہیں۔" (۲۴:۳۹_۴۰)

ایک ملحد اس مایوس محقق کو خوب پہچانتا ہے جس کی زندگی اس خوشی کے حصول کے لئے ایک بے ثمر کوشش ہے جو ایک فریب نظر سے گزر کر دوسرے فریب نظر تک پہنچتا ہے اور ہر بار کی شکست ومحرومی اس کی پیاس میں اضافہ کرتی جاتی ہے، وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا عارضی دنیاوی زندگی میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ مکمل یقین کے ساتھ اپنے معاملے کے بارے میں دلیل وحجت پیش کرتا ہے اور اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سارے عمل میں اللہ کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ ملحدانہ زبان میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے اور اس کے پیش نظر جو مقاصد ہیں وہ اعلیٰ وارفع ہیں، وہ دوسروں کو دکھ دینا اور دوسروں سے دکھ اٹھانا جاری رکھتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ وہ اپنی ہی تباہی و بربادی میں بری طرح گھر جاتا ہے۔

"انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے۔" (۲: ۲۰۴_۲۰۵)

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز

Marfat.com

نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتو (تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے۔'' (۱۰۲: ۱۔۶)

جب قرآن بزدل، منافق، متکبر، سچ جھٹلانے والے، ظالم اور اس کے ساتھیوں، وہ شخص جو ریا کار ہے اور چاہتا ہے کہ نماز کے دوران لوگ اسے دیکھیں، حالانکہ وہ ضرورت مندوں کی تکالیف اور پریشانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے کا ذکر کرتا ہے تو قرآن پڑھنے والا جانتا ہے کہ کسی حد تک ان میں سے ہر بات اس کی اندر موجود ہے۔

''جب یہ نماز کیلئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔'' (۴: ۱۴۲)۔

''اور وہ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضروریات کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں''۔ (۱۰۷: ۱۔۷)

جب ان کی باری آتی ہے جنہیں جب بھی کسی اعلیٰ مقصد کیلئے لڑنے کیلئے کہا جائے تو وہ بہانے بنانے لگتے ہیں، ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ ہم نے دوسروں کو مایوس اور پریشان دیکھ کر کتنی بار ان کی طرف پیٹھ کر لی اور ان کی مدد نہ کی۔ قرآن اس بارے میں بتاتا ہے :

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبائے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔'' (۴: ۷۵)

ان آیات میں ہمیں اپنی بدترین مخفی قوتوں کا علم ہوتا ہے۔ یہ ہمارا پیمانہ بن کر ہمیں ہم پر آشکارا کرتی ہیں۔ ہمیں بہترین انسانوں کی مثالیں بھی دی جاتی ہیں: پیغمبروں میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ، خواتین میں حضرت مریم، حضرت آسیہ

Marfat.com

اور شیبا، فرعون کے نادم اور تائب جادوگر جنہوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ فرعون انہیں سولی پر چڑھا دے گا، مصریوں میں سے وہ اجنبی جو موسیٰؑ کے پیغام کی سچائی کے دفاع میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اور غار کے وہ لوگ جنہیں ان کے ایمان کی وجہ سے مار دیا گیا تھا۔ غار کے لوگوں کی طرح وہ جوان ہیں اور بوڑھے ہیں سورۃ یوسف کے معمر یعقوبؑ کی مانند۔ ہمیں مرد، عورتیں، والدین اور بچے، شوہر اور بیویاں ایمان والوں کے بھی ملتے ہیں اور کافروں کے بھی۔ نہ ختم ہونے والی کشمکش اور انتخاب کے درمیان عملاً ہر قسم کا معاشرتی تناظر دکھائی دیتا ہے اور یہ کشمکش نظر آتی ہے کہ ''کیا میں حق کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا یا کیا میں منہ موڑ کر نکل جاؤں گا؟''

ان بیانات میں تیزی آتی جاتی ہے۔ ہم اللہ کا انکار کرنے والے اور حق کا دفاع کرنے والے کے درمیان جو تصادم ہے اس میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ذہنی تناؤ پیدا ہوتا ہے تاکہ جلد کسی فیصلے پر پہنچا جائے کیونکہ زندگی ایک میزان میں رکھی ہوتی ہے۔ تقریباً ان تمام اعلانات برتری میں حق کے ماننے والے کو ایذا اور ظلم و ستم کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ نبی ﷺ اور ان کے ماننے والوں کے نقطہ نظر سے، ظالم اور اس کے ان حمایتیوں کی نظر سے جو ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں اور اپنے ظلم کا جواز پیش کرتے ہیں اور ایک عام آدمی کے نقطہ نگاہ سے۔ ہم لامحالہ طور پر یہ سوال پوچھنے لگتے ہیں ''میری ان کے درمیان کہاں جگہ بنتی ہے؟'' ''ان میں سے میرا شمار کن افراد میں ہوتا ہے؟''

قرآن کے مطالعہ کے دوران پتہ چلتا ہے کہ بنی نوع انسان کے روحانی نقصان پر اور اتنے مختلف قسم کے لوگوں کی کہانیوں پر لوگ کس طرح سوچتے ہیں اور ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے اور یوں ایک نمایاں قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ قرآن کی تمثیلات، آیات اور سورتوں سے ایک نہایت صاف و شفاف اور واضح تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ پھر انسان کی ذات بہت کھل کر اور صاف صاف سامنے آنے لگتی ہے۔ قرآن ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں آپ اپنے نقائص، کمزوریاں، دکھ درد اور نقصان، جوہر، قوت اور ناکامیاں دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے اندر گہرائی تک جھانک کر آپ کسی ایسی شے کو پہچاننے لگتے ہیں جسے آپ ہمیشہ اچھی طرح جانتے تھے: کہ کوئی معبود نہیں ماسوا اللہ کے۔ لا الہ الا اللہ

Marfat.com

تسلیم کرنا اور بات ہے اور عمل پیرا ہونا اور۔ ایک ڈر اور خوف یا تشویش پھر بھی ایسی ہے جو ایمان وعقیدے اور اطاعت گزاری کے درمیان ایک دیوار کی مانند حائل ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے والے کی ساری تگ و دو کے دوران قرآن میں ایسی سورتیں ہیں جو اس کی مدد کو آتی ہیں۔ اور یوں مدد کو آتی ہیں جس طرح کسی زخمی دل تک پہنچنے والا وہ ہاتھ جو عرش سے نمودار ہوا ہو۔ یہ سورتیں روح کے متعلق بھی اتنا کچھ ہی بیان کرتی ہیں جس قدر اس فرد کے متعلق۔ جب آپ کو اس بات کے علم کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ خدا آپ کے ساتھ ہے، کہ وہ آپ کی سنتا ہے، اللہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ''اور اے نبی ﷺ! میرے بندے اگر میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات تم انہیں سنا دو شاید کہ وہ راہ راست پائیں'' امید اور آس کے بارے میں جب تم شک وشبے میں مبتلا ہو جاتے ہو تو اللہ یوں یقین دلاتا ہے۔

> ''(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور رحیم ہے۔'' (۳۹: ۵۳)

اور اطاعت گزاری کے وقت جب تم اپنے رنج وغم کی گہرائیوں کے ساتھ اپنے خالق کو پکارتے ہو تو وہ تمہیں آغوش رحمت میں لے لیتا ہے:

> ''مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔''

''جواب میں ان کے رب نے فرمایا

''میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے'' (۳: ۱۹۲-۱۹۴)

قرآن میں ایسی سورتیں ہیں جو روحانی طور پر پاک صاف ہوجانے اور اپنے کئے پر نادم ہونے کی کیفیت تک راستہ کھول دیتی ہیں، مثلاً

''اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔ (ایمان لانے والو! تم یوں دعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہوجائیں، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔''
(۲: ۲۸۶)

قرآن کی دوسری سورتوں میں انسان کی تسلی اور اس یقین دہانی کا ذکر ہے کہ اللہ انہیں تنہا نہیں چھوڑتا جو اس کی تلاش وجستجو میں رہتے اور اس کی طلب رکھتے ہیں۔ میں نے جب پہلی بار قرآن پاک کی سورۃ نمبر ۹۳ پڑھی تو میں اللہ کے اس وعدے کا ذکر دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس نے پرورش کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں نصف گھنٹے تک روتا رہا۔ میری کیفیت کچھ اس گمشدہ

Marfat.com

بچے کی سی تھی جسے آخر کار اس کی ماں نے بچالیا تھا۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ روشن و تاریک دونوں زمانوں میں خدا ہمیں بالکل چھوڑ نہیں دیتا بشرطیکہ ہم صرف ایک بار اس کی جانب مڑ کر تو دیکھیں۔

''قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے (اے نبی ﷺ) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہوا۔ اور یقیناً تمہارے لئے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا'' (۹۳:۱۔۸)

میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ درحقیقت قرآن کا آغاز یا اختتام کوئی نہیں، اس لئے اس کے بنیادی نظریات کی تصدیق کسی بھی ترتیب سے اس کے مطالعہ کے بعد کی جاسکتی ہے اس فرد کے لئے جو قرآن کی دعوت پر لبیک کہنے والا ہو، اس کیلئے اس کی ترتیب مرکزی یا محوری ہے۔ اس لئے کہ جوں جوں آپ اس کے مطالعہ کے دوران آگے صحیح ترتیب کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں، اس کا اسلوب اسی قدر زیادہ التفات اور جذباتیت کا حامل ملتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جوں جوں انسان ایمان لے آنے کے لمحے کے قریب پہنچتا ہے، بلاوا اسی قدر زیادہ ایک مقناطیسیت اور کشش لئے ہوئے ہوتا ہے۔ قرآن کے آخر میں مختصر سُورتیں اس کے اہم موضوعات کو از سرنو اپنی گرفت میں لپیٹنے لگتی ہیں اور نصیحت و تلقین میں شدت پیدا کر دیتی ہیں۔ غرور و تکبر کی خوفناک قیمت ادا کرنے کی آخری یاددہانی کے بعد اور خودسر ہو کر ایمان کو رد کرنے کے بعد انسان آخری تین سورتوں پر پہنچتا ہے جو لفظاً پڑھنے والے کو سکھاتی ہیں یا یوں کہئے کہ اس کے سامنے وہ الفاظ رکھ دیتی ہیں جنہیں وہ ایک تڑپ اور اشتیاق کے ساتھ نماز کے دوران پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مسلسل تین بار، چند سطور کے ذریعے علیحدہ علیحدہ کر کے، پڑھنے والا مرد یا عورت اپنے ایمان کا اعلان کرنے کی طلب یا خواہش محسوس کرنے لگتے ہیں۔

''کہو، وہ اللہ ہے، یکتا'' (۱۱۲:۱) ''کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب

کی۔'' (۱۱۳:۱) اور ''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے حقیقی معبود کی۔'' (۱۱۴:۱)

وہ مرد یا عورت ایک نئی زندگی اور سپردگی کے کنارے پر لے آئے گئے ہیں:

اشهد ان لااله الا الله و اشهد ان محمد الرّسول الله

(میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ماسوا اللہ کے، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)

ان کیلئے جنہیں اسلام قبول کر لیتا ہے، قرآن اس بات کا سب سے بڑا گواہ ہے کہ خدا مسلسل پرورش کرنے والا اور محبت کا مظہر ہے۔ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح یہ لوریاں دے کر آپ کو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا ہے یہاں تک کہ آپ بہہ کر اس میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بجائے تاریک سمندر میں ڈوبنے کے آپ اپنے آپ کو ایک مقدس نور اور رحم و کرم کے سمندر میں مستغرق دیکھتے ہیں۔ (۶۵)

مسلمان ہو جانے کے بعد، میں نے کوشش کی کہ ہر نماز مسجد میں با جماعت ادا کروں مگر میں زیادہ تر فجر، نماز مغرب اور نماز عشاء کے لئے جا سکا کیونکہ ان نمازوں میں قرآن پاک کی تلاوت بہ آواز بلند کی جاتی ہے۔ نمازیوں میں سے کسی ایک ساتھی نے بڑے تجسس کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہا کہ میں ان تین نمازوں میں شرکت کا اہتمام بطور خاص کیوں کرتا تھا جبکہ یہ تینوں نمازیں تو باقی نمازوں کی نسبت زیادہ بوجھل محسوس ہونی چاہئے تھیں اور پھر تلاوت بھی ایک ایسی زبان میں ہوتی تھی جو میرے لئے مکمل طور پر اجنبی تھی۔ میں نے اس وقت تک اس معاملے کو زیادہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا مگر پھر بھی میں نے تقریباً جبلی طور پر جواب دیا تھا۔ ''ایک بچے کو اپنی ماں کی آواز کیوں تسکین بخشتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''حالانکہ وہ تو ابھی الفاظ کے معنی تک نہیں جانتا، زبان تک نہیں سمجھ سکتا، مگر پھر بھی وہ اس آواز سے مانوس لگتا ہے، جو اسے اطمینان و سکون دیتی ہے ایسی آواز جس کے بارے میں وہ بچہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے ماضی بعید میں وہ اس سے واقف تھا اور جو ہمیشہ سے اسے جانتی ہے۔'' میری زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے جب میں نے یہ محسوس کیا کہ کاش میں اس آواز کی حفظ و امان میں ہمیشہ رہ سکتا۔ مگر ایک نو مسلم کو حقیقی دنیا میں رہ کر ایمان کے ساتھ منسلک رہنا اور بلند درجات تک پہنچنا چاہئے۔

Marfat.com

حواشی

(۱) ودھر اسلام۔ ایچ اے آر گب (نیویارک: اے ایم ایس پریس، ۱۹۳۲) ۳۵۰

(۲) دی میسج آف دی قرآن۔ (قرآن کا پیغام) محمد اسد (جبرالٹر، دار الاندلس ۱۹۸۰ء) پیش لفظ کا ص (۱۱)۔

(۳) ایضاً دی قرآن۔ تھامس بی اروِنگ۔ دی فرسٹ امریکن ورژن (بیٹلبارو وی ٹی۔ امانہ بکس ۱۹۸۵ء) مارمڈیوک ڈبلیو پکھتال، دی میسج آف دی گلوریس قرآن (نیویارک: دی مسلم ورلڈ لیگ ۱۹۷۷ء)

(۴) دی روڈ ٹو مکہ۔ محمد اسد (جبرالٹر، دار الاندلس، ۱۹۸۰ء) حامد الجار دی روٹس آف دی اسلامک ریوولوشن (انٹاریو: اوپن پریس ۱۹۸۳ء)۔ دی قرآن۔ اروِنگ۔ ویسٹرن سولائزیشن۔ کنڈیمنڈ بائی اٹ سیلف۔ مریم جمیلہ (لاہور، کراچی) وٹ از صوفی ازم؟ مارٹن لنگز۔ (لندن، جارج ایلن اینڈ یونون ۱۹۸۳ء) میسج آف دی گلوریس قرآن: پکھتال۔

(۵) اسلام اینڈ کیپٹلزم۔ میکسم روڈسن (پینگوین بکس لندن ۱۹۷۴ء)۔ فرتھ جوف شون، انڈرسٹینڈنگ اسلام: لندن جارج ایلن اینڈ یونون لمیٹڈ، ۱۹۶۳ء) ترجمہ۔ ڈی ایم میتھسن، ۱۹۶۳ء، این انٹروڈکشن ٹو اسلام: فریڈرک ڈینی۔ (نیویارک۔ میکملن ۱۹۸۵ء) اسلام: دی سٹریٹ پاتھ۔ جان ایل ایسپوزیٹو (آکسفورڈ پریس، نیویارک، ۱۹۸۸ء)

(۶) توشی ہیکو ازوسو نے اپنی کتاب ''گاڈ اینڈ مین ان دی قران (قرآن میں خدا اور انسان) میں قرآن کی معنویاتی ترتیب کا بہترین تجزیہ کیا ہے (سلیم، ایم اے۔ ایرز پبلشر ۱۹۹۴ء)۔ کینتھ کریگز کی تصنیف ''دی ایونٹ آف دی قرآن'' بھی دیکھئے جو بڑی بصیرت افروز کتاب ہے (جارج ایلن اینڈ یونونون، لندن ۱۹۷۳ء)

(۷) راڈنسن: ''اسلام اینڈ کیپٹلزم''

(۸) ایچ لیمنز: کیریکٹرسٹک ڈی محمد ڈی، ایپرس لی قران ۱۹۳۰

(۹) اسد: دی میسج ۔۴۔۹۶۳

(۱۰) ایضاً ص iii، پیش لفظ۔

(۱۱) محمد ایچ ہیکل: دی لائف آف محمد ﷺ ترجمہ محمد اسماعیل فاروقی (نارتھ امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء)

(۱۲) دی ہولی بائبل، کنگ جیمز ورژن، تھامس نیلسن ۱۹۷۷ء

(۱۳) مورس بکائی: وٹ از دی اورجن آف مین؟ (پیرس ۱۹۸۳ء) ۱۰

Marfat.com

(۱۴) کینتھ کریگ، دی کال آف دی منرٹ (نائیجیریا: ڈے سٹار پریس ۱۹۸۵ء) ۲۴۹ (۱۵) ایضاً۔ ص ۲۵۲

(۱۶) بہت سے جدید مغربی مصنفین جنہوں نے اسلام پر کام کیا ہے متفق ہیں کہ محمد ﷺ کا یہ دعویٰ کہ قرآن ان پر وحی کی شکل میں خدا نے نازل کیا بالکل سچا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے ایچ اے آر گب: محمڈنزم (لندن۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۲ء) ص ۲۵ جہاں وہ لکھتا ہے:

محمد ﷺ نے جس شدومد سے معاشرتی ناانصافی اور فراڈ کی مذمت کی ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر مکمل سکون کی حالت میں تھے لیکن ان کا اندرونی جوش وجذبہ معاشرتی انقلاب کیلئے تبلیغ کی خاطر پھوٹ نہیں پڑا تھا بلکہ آپ نے اسے ایک مذہبی رخ دے دیا تھا اور ایک غیر متزلزل یقین واعتماد کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ انہیں خدا کی جانب سے قدیم سامی پیغمبروں کی یہ تنبیہہ علی الاعلان کرنے کیلئے کہا گیا ہے۔ ''اپنے سابقہ اعمال پر پشیمان ہو جاؤ کیونکہ خدا کی طرف سے تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔''

مزید دیکھئے: ای منٹگمری واٹ: محمد ﷺ ایٹ مکہ (لندن: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ۱۹۵۳ء) ص۔۵۔۸۰ جہاں وہ قرآن کو تخلیقی حملہ اور یورش قرار دیتا ہے۔

(۱۷) مسیحی مخالفین نے وہ کچھ تو دریافت کرلیا جوان کے خیال میں تضادات اور عدم مطابقت پر مبنی تھا لیکن اس تنقید کا اختصار اور اکثر ہرزہ سرائی بہت کھٹکتی ہے۔ کم وبیش ہر مسیحی واعظ یا ادیب اسی ایک ناکافی ثبوت کا سہارا لیتا ہے۔

قرآن کی اس آیت کو جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ مریم کو ان کے عزیز و اقارب ''ہارون کی بہن'' کہتے ہیں بار بار قرآن کے تاریخی سہو کے طور پر دہرایا جاتا ہے اس تنقید کی حقیقت ان پر واضح ہوجاتی ہے جو عہد نامہ جدید سے واقف ہوں جہاں مریم اپنی کزن الزبتھ کو ''ہارون کی بیٹی'' کہتی ہیں۔ سامی ثقافتوں اور عربوں اور مسلمانوں میں آج بھی اس طرح کے الفاظ مثلاً ''بیٹی''۔ ''بھائی'' ''چچا'' ''چچی'' اور ''بیٹا'' مغرب کی نسبت زیادہ آزادی کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس قسم کے لقب ''چلڈرن آف اسرائیل'' ''سن آف ڈیوڈ'' اور ''مائی مسلم برادر'' ایسے ہیں جنہیں لفظاً کبھی نہیں لیا جاتا۔ اگر کوئی یہ تسلیم کرلے کہ مریم ہارون کی نسل سے ہونے کے ناطے الزبتھ کی براہ راست کزن تھی۔ مگر وہ باپ کی طرف سے ہارون کی نسل سے نہیں تھیں تو یہ لقب ''ہارون کی بہن'' زیادہ موزوں رہے گا۔

ایک شاطرانہ چال یہ بھی مستعمل ہے کہ کسی قرآنی آیت سے وہ تشریح بھی منسوب کردی جاتی ہے جو اصل عربی عبارت میں مراد ہی نہ ہو۔ مجھے ایک واعظ یاد آرہے ہیں جو ایک سائنسی تضاد و

Marfat.com

ناموافقت کو پیش کرنے کی ناکام کوشش کررہے تھے، فرمانے لگے: دریائے نیل کے سالانہ سیلاب نے مصریوں کو زندگی بخشی نہ کہ بارش نے جس کا ذکر قرآن کرتا ہے۔ گویا قرآن نے سالانہ سیلابوں کے فائدوں کو نکال دیا ہو یا یہ کہ جیسے بارش مصری کسانوں کے لئے اہم نہ ہو۔

مجھے اس بات کا ذکر بھی کردینا چاہئے کہ کچھ ناقدین جو قرآن کی اہانت کرنا چاہتے ہیں انہوں نے چند ابتدائی تفاسیر سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ابوعبیدہ کی وہ تفسیر جس میں قرآن میں شامل قواعد یا صرف ونحو کی بے قاعدگیوں کی فہرست شامل کرکے اس پر بحث کی گئی ہے ان میں نشان حذف جو عبارت حذف ہوجانے کی وجہ سے آئے ہیں، واحد فاعل کے ساتھ جمع کے فعل کا استعمال اور اسماء کی تذکیر و تانیث میں اختلاف جیسے نکات شامل کئے گئے ہیں۔ ابتدائی دور کے مسلمان شارحین اور مفسرین نے اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ یہ تو بہت معروف فصاحت و بلاغت کے طریقے تھے جو اس دور میں مروج تھے اور ان میں سے بہت سے تو آج بھی مستعمل ہیں جنہیں عرب شعراء استعمال کرتے ہیں۔ تاہم مغرب میں عربی پڑھنے والے بہت سے طلبہ ان سے ناواقف ہیں کیونکہ یہ طلبہ عربی زبان کی ان باریکیوں اور نزاکتوں تک نہیں جاتے۔

(۱۸) قرآن پاک کا تسلسل اور ترتیب بتاتی ہے کہ اسماعیلؑ کی قربانی تو مقصود و مطلوب تھی۔ لیکن ابتدائی دور کے مسلمان مفسرین میں اس موضوع پر بہت بحث ہوئی۔ دیکھئے فائرسٹون کی بحث اس کی تصنیف: جارنیز ان دی ہولی لینڈ (نیویارک، سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک، ۱۹۹۰ء)

(۱۹) دیکھئے نبی بن مالک: دی قرآنک فینامنا ترجمہ: اے بی کرکری (امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز ۱۹۷۳ء) جس میں مزید تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(۲۰) بوکائی: بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس ۳۲۔۵

(۲۱) ایضاً ۳۱۹۔۴۱

(۲۲) ایضاً۔

(۲۳) کیتھ ایل مور: ڈیولپنگ ہیومن، تیسرا ایڈیشن (فلاڈیلفیا ڈبلیو بی سانڈرز کمپنی ۱۹۸۲ء)

(۲۴) شوآن: انڈرسٹینڈنگ اسلام ص ۴۵

(۲۵) یہ رجحان دوسرے مذاہب کے لوگوں میں بھی ملتا ہے۔ ایک مقرر نے اپنے سامعین کو بتایا کہ عہد نامہ جدید میں تخلیق کی بگ بینگ تھیوری (صور اسرافیل) دی گئی ہے، کیونکہ جان کی انجیل میں بتایا گیا ہے کہ ''شروع میں لفظ'' موجود تھا۔ کیونکہ زبان کی دنیا میں لفظ ایک واحد اکائی ہے کہ یہ جب بولا جاتا ہے تو اس کی آواز سے ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے جسے ہم اجسام کی دنیا میں مختلف اشیاء کے گروہوں میں مشابہت کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ وہ نظریہ جو ایک واحد حقیقی نقطے پر مجتمع ہونے

Marfat.com

والے ایسے اجزاء کا مجموعہ ہے جو لا محدود کثافت کی شکل میں پھٹتی ہے۔

(۲۶) ابوالقاسم الحسین الراغب الاصفہانی (وفات ۵۰۳ ہجری) المفردات فی غریب القرآن

(۲۷) ولیم ای لین۔ عریبک انگلش لیکسیکان (عربی انگریزی لغت) لندن ۹۳۔۱۸۶۳

(۲۸) بوکائی۔ دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس۔ ص ۲۰۴

(۲۹) خلیفہ راشد کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ان حروف مقطعات کے اسرار و رموز کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ وہ ان حروف اور انیس کے ہندسے کے درمیان ایک ربط پیدا کرتی ہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔ (۷۴: ۳۰) مسلم سکالرز بجا طور پر ان کی اس دریافت کو ماننے میں متذبذب ہیں۔

دیکھئے خلیفہ راشد: قرآن: دی فائنل ٹیسٹامنٹ (ٹکسن اے زیڈ: اسلامک پروڈکشن: ۱۹۸۹ء)

(۳۰) بوکائی: دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس۔ ص ۱۴۸

(۳۱) بوکائی: دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس، ص ۱۶۳۔ وہ اپنے مطالعہ کو اس رائے کے ساتھ ختم کرتا ہے۔

محمد ﷺ کے عہد میں علم کی سطح کے پیش نظر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ قرآن کی بیان کردہ بہت سی باتیں جن کا تعلق سائنس سے ہے کسی انسان کا کام ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بالکل جائز اور معقول بات ہے کہ قرآن کو نہ صرف وحی کی شکل میں آنے والی کتاب تصور کیا جائے بلکہ اسے ایک خاص مقام دیا جائے اس لئے کہ یہ ایک صداقت و استناد کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور اس میں سائنسی باتوں کا ذکر بھی ہے اور اسے آج کے دور میں جب پڑھا جائے تو انسانی اصطلاحات میں یہ وضاحت طلبی کے لئے ایک چیلنج دکھائی دیتا ہے۔

(۳۲) فریڈرک ڈینی۔ اسلام (نیویارک، ہارپر اینڈ رو) ۱۹۸۷ء ص ۸۸

(۳۳) مالک بن نبی۔ دی قرآنک فینامنا۔ ۸۴۔۱۶۵

(۳۴) گیری ملر نے اس مثال کی طرف میری توجہ دلائی۔

(۳۵) مرتضیٰ مطہری: فنڈامنٹلز آف اسلامک تھاٹ، ترجمہ کیمپسل (برکلے، میزان پریس، ۱۹۵۸ء)

(۳۶) آرتھر جے آربری: اوسنا آن تھیالوجی (لندن، جے مری، ۱951ء)

(۳۷) اسد: دی میسج، ص ۹۸۹۔۹۱

(۳۸) ایضاً ۹۸۹۔۹۱

(۳۹) ایڈون اے ایبٹ: فلیٹ لینڈ (نیویارک: ڈوور، ۱۹۵۲ء)

(۴۰) اسد: دی میسج ۹۸۹۔۹۱

(۴۱) اسد: دی میسج ۹۸۹۔۹۱

Marfat.com

(۴۲) علی: دی میننگ آف دی ہولی قرآن ۳۱۹ نوٹ ۹۲۹

(۴۳) محمد علی: ریلیجن آف اسلام (نیو دہلی: ایس چند اینڈ کو، نیا ایڈیشن) ص ۱۸۸

(۴۴) علی: دی میننگ آف دی ہولی قرآن، ۳۱۹ نوٹ ۹۲۹

(۴۵) علی محمد، دی ریلیجن آف اسلام ص ۱۹۱

(۴۶) ایضاً

(۴۷) الطبری: دی کمنٹری آن دی قرآن، جلد اول، ترجمہ: جے کوپر (لندن: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۷) ص ۴۷

(۴۸) ایضاً ص ۴۷

(۴۹) ایضاً ص ۱۳۱

(۵۰) محمد اقبال۔ دی ری کنسٹرکشن آف ری لیجیس تھاٹ ان اسلام۔ (لاہور) ایس ایچ محمد اشرف پبلی کیشنز: ۱۹۸۲ء)

(۵۱) حفیظ ملک: اقبال۔ پوئٹ فلاسفر آف پاکستان (نیو یارک، کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۱ء)

(۵۲) محمد علی: دی ریلیجن آف اسلام، ص ۳۱۷۔۸۔

(۵۳) صحیح بخاری: ترجمہ، محمد محسن خان (بیروت اسلامک یونیورسٹی۔ الدار العربیہ پبلشرز، نیا ایڈیشن) جلد پنجم

(۵۴) ایضاً ۲۳: ۸۰۔۹۳)

(۵۵) گارڈنز آف دی رائٹس: ریاض الصالحین'' آف امام نووی، کا ترجمہ مترجم۔ محمد ظفر اللہ خان (لندن: کرزن، ۱۹۷۵ء) ص ۹۵

(۵۶) گولڈ زیہر: انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیالوجی اینڈ لاء، پرنسٹن یونیورسٹی پریس پرنسٹن، ۱۹۸۱ء۔ ص ۷۹۔۸۰)

(۵۷) میں فضل الرحمٰن صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنی تصنیف، میجر تھیمز آف دی قرآن (قرآن کے اہم موضوعات) میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی۔

(۵۸) گارڈنز آف دی رائٹوس، ترجمہ: محمد ظفر اللہ خان ص ۲۸

(۵۹) علی: دی ریلیجن آف اسلام ص ۱۲۹_۹۹۱

(۶۰) ابن حنبل، مسند (قاہرہ، المیمنہ پریس، نیا ایڈیشن) جلد اول، ص ۳۹۵، ۴۰۱

(۶۱) دیکھئے فضل الرحمٰن: میجر تھیمز آف دی قرآن (قرآن کے اہم موضوعات) جس میں ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آیات ۳۱: ۱۰، ۳۶: ۲، ۴۲: ۱۱، ۴۳: 12، ۵۱: ۴۹، ۵۳: ۴۵ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

(۶۲) لین، ولیم ایڈورڈ: عربیک انگلش ڈکشنری، لندن ۱۸۸۳۔۳۸)

(۶۳) صحیح بخاری: ترجمہ، محمد محسن خان، جلد: ا

(۶۴) میرے لئے فجر کی نماز کی ادائیگی اسلام کی خوبصورت ترین اور نہایت دلگداز اور متاثر کن مذہبی رسومات میں سے ایک ہے۔ جب دوسرے لوگ سو رہے ہوں نماز کیلئے جاگ جانا ایک عارفانہ اور روحانی سائمل لگتا ہے۔ آپ کے کانوں میں قرآن کی موسیقی، خوش الحان قاری حضرات کے ذریعے پہنچتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے عارضی طور پر آپ نے اس دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور اللہ کی حمد و ثناء کرنے والے فرشتوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔

(۶۵) یہ کنایہ ''انڈرسٹینڈنگ اسلام'' کے مصنف نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔ (لندن: جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ۔۱۹۶۳ء)

Marfat.com

تیسرا باب

رسول اللہ ﷺ

''اے بے شک نبی ﷺ تو اہل ایمان کیلئے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔'' (۳۳:۲)

شہر میں افواہ تیزی سے پھیل رہی تھی اور صحن میں جمع ہونے والے مجمع کی بے چینی اور بے قراری ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ حالانکہ گذشتہ کچھ دنوں کے دوران بہت سی اچھی علامات ظاہر ہوئی تھیں مگر اس کے باوجود لوگ خوفزدہ تھے۔ ہوسکتا ہے یہ ان کا سب سے بڑا امتحان اور آزمائش ہو، مصائب و مشکلات سے، ہجرت سے، جنگ و جدل سے اور موت سے بھی بڑی آزمائش، اس کے لئے وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے، اپنی مثالی رہنمائی، حیرت انگیز روحانیت، رحمدلی و ہمدردی، حوصلہ انگیز تبسم اور شفقت بھری ظرافت طبع سمیت ...... ''اٹھو! ابوتراب'' (ابوتراب کے نام سے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو پہلی بار پکارا تھا)'' وہ ہنسے اور انہوں نے خطرے سے چونکے ہوئے اپنے چچازاد کے خاک آلود چہرے سے گرد و مٹی صاف کرتے ہوئے کہا: یہ آپ ہی تھے جنہوں نے نہایت عجز و انکساری اور عزت و احترام کے ساتھ اپنا چغہ مبارک زمین پر بچھا کر معمر خاتون کے بیٹھنے کیلئے جگہ بنا دی تھی۔ وہ آپ کی بے ترتیب مگر پر اعتماد چال کیسے بھول سکتے تھے جس وقت آپؐ پہاڑی پر چڑھتے تھے، وہ یہ کیسے فراموش کر سکتے تھے کہ آپ کا نواسہ اس وقت حضور ﷺ کے کندھوں پر سوار ہو جاتا تھا جب آپ نماز پڑھا رہے ہوتے تھے؟۔ اور اللہ ہمیشہ ان کے ساتھ تھا۔ غار میں، احد کے

Marfat.com

میدان میں، اور منبر پر۔ یہ افواہ سچ نہیں ہوسکتی! ان لوگوں نے سوچا۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟
حضرت عمرؓ اچانک صحن میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجمع کی جانب دیکھتے ہوئے چلا کر کہا:
''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔'' یوں لگتا تھا جیسے وہ جھوٹی افواہیں پھیلانے والوں کو اپنی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیں گے۔ اپنے سامنے مجمع پر انہیں اس وقت فوقیت حاصل تھی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ پرجلال دکھائی دے رہے تھے، ان کی آنکھوں سے غم و غصے کے نکلتے ہوئے شعلے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کر گزریں گے۔ نبیؐ فرمایا کرتے تھے کہ عمرؓ کو دیکھ کر شیطان اپنا رخ بدل لیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے! پہلے تو لوگوں کو اطمینان حاصل ہوا کہ حضرت عمرؓ نے چند سیکنڈ پہلے رسول اللہ کو حجرے میں دیکھا تھا مگر لوگوں کے کانوں میں آپؐ کی زوجات مطہرات کے رونے چلانے کی آوازیں ان کے کمروں سے آرہی تھیں، چنانچہ حضرت عمرؓ کے احتجاج کو بہت پراسرار اور غیر حقیقی سمجھا گیا۔ اس لڑکے کی مانند جو اپنے باپ کی موت کا یقین کرنے سے انکار کردے۔ پھر ان لوگوں کو یقین آ گیا کہ جو اندوہناک خبر ان تک پہنچی تھی وہ سچ تھی۔ اے خدا ہماری مدد فرما! محمد ﷺ چلے گئے ہیں!
جب وہ مسجد کی سمت بڑھے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھوڑا پسینے پسینے تھا اور ہانپ رہا تھا۔ وہ گھوڑے سے تیزی کے ساتھ اترے اور اپنی صاحبزادی کے حجرے کی جانب بڑھے۔ پردہ اٹھاتے ہوئے آپ نے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ جواب ملا: ''آج اندر آنے کیلئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔'' وہاں پہنچے جہاں ان کے داماد لیٹے ہوئے تھے۔ پیغمبر خدا سے ان کی دوستی برسوں پرانی تھی، نبوت ملنے سے بھی پہلے کی، حضرت خدیجہؓ سے شادی سے بھی پہلے کی، اس زمانے سے جب آپ دونوں ملی معاشرے میں روشن امکانات کی توقع رکھنے والے نوجوان تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جھکے اور اپنے محبوب کے چہرہ مبارک پر بوسہ دیا:
''آپ زندہ تھے تو حسین و جمیل تھے اور آج موت پر بھی اتنے ہی حسین و جمیل ہیں''
انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کا سر مبارک بڑی نرمی سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر بلند کیا جبکہ آپ کے آنسو حضور ﷺ کے چہرہ مبارک پر گرے۔ ''آہ! میرے دوست، میرے یار غار، آپ مجھے میرے والدین سے زیادہ پیارے تھے! موت جو اللہ کے حکم سے آپ کو آئی ہے، آپؐ نے اس کا ذائقہ چکھا ہے۔ آج کے بعد آپ کو کبھی موت نہیں آئے گی''۔ پھر بڑی احتیاط

Marfat.com

کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور ﷺ کا سر مبارک تکیے پر رکھ دیا، دوبارہ جھک کر آپؐ کے چہرہ اقدس پر بوسہ دیا، چادر سے ڈھانپ دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ حضرت ابوبکرؓ چھوٹے قد کے اور اکھرے بدن کے تھے مگر نرم دلی کے لئے مشہور تھے۔ وہ دیکھنے میں ایک قدرتی لیڈر جیسے حلیے کے مالک نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایک بار ان کی اپنی بیٹی نے انہیں نماز پڑھانے کے لائق محض اس لئے نہیں سمجھا تھا کہ آپ بہت جذباتی طبیعت کے مالک تھے۔ تاہم حضور ﷺ ان سے بہت اچھی طرح واقف تھے ابوبکر صدیقؓ مجمع کے سامنے گئے، انہوں نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی چاہی مگر حضرت عمرؓ جو ابھی تک لوگوں سے پر جوش خطاب فرمارہے تھے، نہیں چاہتے تھے کہ کوئی درمیان میں مخل ہو۔ چونکہ لوگ وہ کچھ سننا چاہتے تھے جو ابوبکر صدیقؓ کہنے والے تھے اس لئے ان کی توجہ ان کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بات اس طرح شروع کی۔ ''ان کے لئے جو محمد ﷺ کی پرستش کرتے تھے'' حضرت عمرؓ کے کانوں سے یہ الفاظ ٹکرائے تو وہ اور مجمع میں شامل لوگ خاموش ہوگئے۔ ابوبکرؓ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہیں کہ محمد ﷺ اس جہان فانی سے رخصت فرما گئے ہیں! مگر وہ لوگ جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، یہ جانتے ہیں کہ اللہ لافانی ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔'' انہوں نے جب قرآن پاک کی یہ سورۃ تلاوت فرمائی تو ان کی آواز شدت احساس و جذبات سے لبریز تھی۔

> ''محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔'' (۳:۱۴۴)

حضرت عمرؓ جو اس احساس سے ہکا بکا ہوگئے تھے کہ نبی ﷺ واقعی وفات پا گئے ہیں۔ اپنے گھٹنوں پر جھک گئے تاکہ اس رنج و غم سے اپنے آپ کو آزاد کرا سکیں جسے انہوں نے اب تک قبول کرنے سے انکار کر رکھا تھا۔ بعد میں وہ بتایا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ نے جب قرآن پاک

Marfat.com

کے الفاظ دہرائے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اور دوسرے لوگ انہیں پہلی بار سن رہے تھے حالانکہ دوسرے روز تک اس اندوہناک خبر کی سرکاری طور پر تصدیق نہیں کی گئی تھی مگر اس سوال کا جواب کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد اب سیاسی انتظام وانصرام کس کے ذمے کیا جائے (نبوت میں تو کوئی آپ ﷺ کا جانشین نہیں تھا) اسی وقت بہت سے لوگوں کے دلوں میں موجود تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور خلافت بہت مختصر رہا کیونکہ وہ دو سال بعد انتقال فرما گئے مگر یہ مختصر دور پوری خلافت راشدہ کے عہد میں نہایت نازک دور تھا کیونکہ انہیں مسلمانوں کو بحیثیت امہ اس کی ترقی کے مشکل ترین مرحلے سے گزارنا تھا۔ قرآن پاک کا نزول مکمل ہو چکا تھا، اسے نسخہ کیمیا کے طور پر اپنانے کا عملی مظاہرہ کیا جا چکا تھا، اور نبی ﷺ کی موجودگی میں جو تحفظ امہ کو حاصل تھا وہ اب نہ رہا تھا اور اسے اسلام کا پیغام نئی اور نامعلوم دنیا تک پہنچانا تھا۔ یہ کام ایک لحاظ سے آسان بنا دیا گیا تھا کیونکہ صحابہ کرام کے طرز فکر اور ان کی شخصیات کو گزشتہ بیس برس کے واقعات نے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ قرآن پاک اور محمد ﷺ کی مثال کسی ایسے لٹریچر کی سی نہ تھی جو دو علیحدہ علیحدہ وجود رکھتا ہو اور جس کے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہو۔ یہ تو اب (قرآن اور قرآن ناطق) ہر مسلمان کی زندگی کے جزو تکمیلی یا جزو لاینفک تھے۔ مگر وہ بہت بڑے خطرے جو پوری امہ کو درپیش تھے، ابتداء ہی سے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے موجود تھے۔ فرقہ بندی اور انسانی میلان کہ ہم اپنے ولیوں اور بزرگوں کو اور اپنے سورماؤں اور بہادروں کو اتنا اونچا لے جاتے ہیں کہ خدائی رتبے پر جا فائز کرتے ہیں۔ انہیں بھی جو خود اس رجحان اور انسانی میلان کے خلاف لڑنے کیلئے بھیجے گئے تھے۔ یہ سارے مسائل موجود تھے۔

ایک مغربی نو مسلم کو دور حاضر میں ان ہی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے، گو ایک مختلف زاویے سے۔ اسے کسی نہ کسی طور پر اس امہ میں اپنی جگہ بنانی ہوتی ہے جس کی روایات اس وقت اس کیلئے بہت زیادہ اجنبی ہوتی ہیں۔

قرآن۔ رسالت مآب ﷺ تک رسائی کا ذریعہ

بنیادی اسلامی عقائد اور اعمال پر انگریزی زبان میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ (۱) جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سے امریکی نو مسلم انگریزی میں ترجمہ شدہ قرآن پاک اور اس کتاب

Marfat.com

مقدس کی انگریزی میں تفسیر وتشریح کے ذریعے نبی ﷺ کی ذات اقدس تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ یقیناً بہت مناسب بات ہے کیونکہ قرآن ہی ہمیشہ سے مسلم امہ کیلئے ایمان کا اصل سرچشمہ رہا ہے۔

یہودی عیسائی پس منظر رکھنے والے قدرتی طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی الہامی کتاب میں زیادہ حصہ محمد ﷺ اور ان کی امت کے بارے میں ہوگا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مثلاً ''محمد ﷺ'' کا نام پورے قرآن میں صرف چار بار آیا ہے جبکہ ''عیسیٰؑ'' کا نام پچیس مرتبہ اور ''موسیٰ'' کا نام ایک سو چھتیس بار آیا ہے۔ (۲) جیسا کہ اس سے پہلے والے باب میں اس بات پر بحث ہو چکی ہے کہ قرآن دراصل صرف ان سے متعلق ہے جو اسے پڑھتے ہیں اور جن کا خدا سے کوئی تعلق اور نسبت ہو۔ یہ سچ ہے کہ کوئی شخص مختلف تاریخی واقعات کی جانب اشارات وکنایے سمجھ سکتا ہے مگر حوالہ جات دانستہ طور پر مبہم نظر آتے ہیں تاکہ جس جدوجہد اور چیلنجوں کا حوالہ دیا گیا ہے انہیں کسی بھی دور کی کسی بھی قوم کے افراد پر منطبق کیا جاسکے گا۔

تاہم محمد ﷺ کے افکار، جذبات و احساسات، توقعات اور مایوسیوں کے کافی قرآنی حوالے موجود ہیں جو ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم آپؐ کی شخصیت کی کوئی تصویر بناسکیں۔

اسلام کے بارے میں ان غیر مسلم سکالرز سے ہمارا زاویہ نظر مختلف ہوگا جو قرآن کی تائید میں مادی اور نفسیاتی وجوہات رکھنے والی تحریک کی تحقیق میں رہتے ہیں۔ ہم اس شخص کے نقطہ نظر سے محمد ﷺ کو جاننے کی کوشش کریں گے جسے اس بات پر پورا یقین ہو کہ قرآن اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہے، اس لئے کہ یہی وہ راستہ ہے جو عموماً ایک نومسلم اختیار کرتا ہے۔ قرآن کے بارے میں اس کے اعتقادات محمد ﷺ کے بارے میں اس کے علم کی نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ مزید برآں ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ قرآن کیا چاہتا ہے کہ ایک مومن نبی ﷺ کو کیا سمجھے کیا مرتبہ دے۔

محمد ﷺ کے بارے میں قرآن ایک نہایت ممتاز اور نمایاں نقطہ پیش کرتا ہے کہ آپؐ پر چونکہ قرآن نازل ہوا اس لئے بے شک وہ خصوصی اہلیت وقابلیت کے مالک ہیں مگر اسکے باوجود وہ ایک بشر ہیں۔ قرآن میں ایسی کوئی بات نہیں جس کی وجہ سے پیغام کی نسبت سے پیغامبر کو

Marfat.com

کچھ اور بنا کر پیش کیا جائے۔ ہم پہلے ہی وہ سورۃ دیکھ چکے ہیں جو حضرت ابوبکرؓ نے مسلم امہ کو نبی ﷺ کی وفات کے بارے میں اعلان کرتے وقت پڑھ کر سنائی۔ قرآن میں اور بھی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جو یہی نقطہ نظر پیش کرتی ہیں:

''کہو میرے اختیار میں خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔'' (۱۰:۴۹)

''تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔'' (۱۳:۳۸)

''اور انہوں نے کہا'' ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کرے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو روذررو ہمارے سامنے لائے۔ یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔'' اے محمد ﷺ ان سے کہو'' پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور کچھ بھی ہوں؟'' (۱۷:۹۰-۹۳)

''لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کی اسی قول نے کہ'' کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟'' (۱۷:۹۴)

'' کہتے ہیں'' یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور ناداروں میں چلتا

Marfat.com

پھرتا ہے؟ (۲۵:۷) ''اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے''
(۱۷: ۷۴-۷۵)

قرآن محمد ﷺ کے مشن اور جدوجہد کو دوسرے پیغمبروں کے مشن اور کوششوں سے مماثل ٹھہراتا ہے جو آپؐ ہی کی مانند بشر تھے۔ نفس کے برے میلانات ان پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں مگر وہ جو عمل صالح کرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے بچ جاتے ہیں، یہ زیادہ علم رکھنے والوں کی تلاش کرسکتے ہیں، ان پر جذبات غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بھی جذبات میں بہہ جاتے اگر اللہ کا خالص فضل وکرم شامل نہ ہوتا۔ ان کے قدم لڑکھڑا سکتے ہیں، شک وشبہات ان کے دل ودماغ میں بھی اٹھتے ہیں، یہ بھی اللہ کی رہنمائی طلب کرتے ہیں اور اپنے مالک ومولیٰ سے عفوودرگزر کی درخواست کرتے ہیں۔

محمد ﷺ کے فانی ہونے کو نہایت مؤثر طریقے سے ان قرآنی سورتوں میں بیان فرمایا گیا ہے جو حضور ﷺ کی نفسیاتی اور روحانی ضرورتوں اور ان میں جو ان کی روزمرہ زندگی کے عام واقعات میں دخل دیتی ہیں، سے مخاطب ہیں۔ مسلم سکالرز ان میں دائمی سبق ڈھونڈتے ہیں اور وہ نبی ﷺ کے اور ہمارے درمیان فاصلے کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں یہ بڑی غیر منطقی اور غیر حقیقی بات ہوگی اگر ہم کسی ایسے شخص سے جو روشن ضمیری اور روحانی تجلیات کو اپنے مطیع کرلیتا ہے یہ توقع رکھیں کہ وہ عقل سلیم کو کام میں نہیں لائے گا۔ اس لئے آپؐ کے مشن کے ابتدائی مراحل میں ہم اس قسم کی یقین دہانیاں دیکھتے ہیں:

''اے نبی ﷺ تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا'' (۹۳: ۳)

اور

Marfat.com

''(اے نبی ﷺ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا؟ اورتم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جوتمہاری کمر توڑے جارہا تھا؟ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا'' (۹۴:۱۔۴)

اور

''تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہواور یقیناً تمہارے لئے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والانہیں اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔'' (۶۸:۲۔۴)

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کئی موقعوں پر آپ کوتنبیہ بھی کی گئی،مثلاً جب آپ نے قبل از اسلام کے اس تعصب کے خلاف لڑنا چاہا جس کا تعلق سابقہ غلاموں کے ساتھ شادی کرنے سے تھا اور اس کوشش میں حضور ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید اور اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کو بار بار تاکید کی کہ طلاق سے بچ جائیں حالانکہ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے سے بالکل خوش نہیں تھے۔ (۳) یا جس وقت آپ نے اپنے ایک نابینا صحابی (حضرت ابن ام کلثوم حضرت خدیجہ کے پھوپھی زاد بھائی) کو ناپسندیدگی کے ساتھ نظر انداز کردیا تھا جو چند مکی امراء کومشرف بہ اسلام کرنے میں بڑے جوش و جذبے کا اظہار کررہا تھا (۴) جب آپؐ نے ازواج باہمی سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کے نتیجے میں اپنے اوپر اور اپنی ازواج مطہرات پر چند ناواجب پابندیاں عائد کردی تھیں۔ (۵) تمدنی اختلافات کے باوجود شادی شدہ قارئین قرآن میں دیئے گئے ان بہت سے اشاروں کنایوں کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کی تعریف کرسکتے ہیں جو محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں خانگی معاملات کے تناؤ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

قرآن ہمارے اور پیغمبروں کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور رشتے کو اس حقیقت کے ذریعے توازن بخشتا ہے کہ بے شک وہ ہوتے تو بشر ہیں مگر اپنی بشری حیثیت میں بلا شبہ امتیاز استثنار کھتے ہیں۔ وہ اللہ کے منتخب بشر ہوتے ہیں جو انسانی مرتبے میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں اور اللہ کے نیکوکار اور چنے ہوئے انسانوں میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں ایک خاص صفت کی بناء پر برگزیدہ کیا جاتا ہے، یہ متقی، اور اللہ کی پرستش کرنے والے

ہوتے ہیں، انہیں دوسرے انسانوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ محمد ﷺ کی مثال خاص طور پر نہایت خوبصورت دی گئی ہے کہ آپ خلق عظیم کے مرتبے پر فائز ہیں۔ حضور ﷺ اللہ کے محبوب ہیں اور خدا اس کے فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب کسی پیغمبر پر نکتہ چینی کی جاتی ہے یا وہ پچھتائے تب بھی پیغمبر کی غلطی کو بغاوت، حکم عدولی یا اللہ کے احکامات سے تجاوز کرنے کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ یہ تو ایک وقتی طور پر اللہ کی طرف سے سونپے گئے مشن اور پیغمبر کے ذاتی جذبات و امنگوں کے آپس میں آمیز ہوجانے کے باعث ہوتا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت یہ بات بالکل ناگزیر دکھائی دیتی ہے اور ایک اوسط درجے کے عام انسان کے لئے تو یقیناً یہ قابل درگزر ہے۔ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ ان دو کے درمیان کس قدر مہین حد فاصل ہے اور یہ ایک پیغمبر سے اعلیٰ ترین معیار کا مطالبہ کرتی ہے۔

پس حضرت سلیمانؑ اپنے آپ کو قصور وار ٹھہراتے ہیں کہ مال و دولت اور طاقت و اختیارات کی دلربائی نے ان کی توجہ ذکر الٰہی سے ہٹا دی تھی اور حضرت داؤدؑ اس بات پر تائب ہوئے اور پچھتاتے ہیں کہ مقدمے کا فیصلہ دیتے وقت ان کے ذاتی جذبات فیصلے پر کیوں اثر انداز ہونے لگے تھے (دو فریق دنبیوں کے بارے میں اپنا مقدمہ ان کے پاس لائے تھے) گویا آپ خواہش نفس پر پچھتائے اور تائب ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت تائب ہوئے جب آپ نے غلط فہمی کی بناء پر اپنے بھائی (حضرت ہارونؑ) کو قصور وار ٹھہرایا۔ یا حضرت یونسؑ جو اپنے لوگوں کو چھوڑ گئے تھے یعنی اللہ کی اجازت کے بغیر اپنے مقام ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ (٦) یہ سب اس وجہ سے ہے کہ پیغمبران اپنے اپنے مشن کے ساتھ نہایت گہری وابستگی رکھتے تھے اور جب یہ مشن رک جاتا ہے تو انہیں بڑی دل شکستگی ہوتی ہے۔ اور ہم محمد ﷺ کو تعصب ختم کرنے کی کوششوں میں قصور وار ٹھہرانے کا سوچ بھی نہیں سکتے یا اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے میں ان کے جوش و جذبے میں کمی کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں کر سکتے یا یہ کہ جب آپ ﷺ کسی خاندانی جھگڑے کا منصفانہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ ﷺ کا فیصلہ غیر منصفانہ ہوگا۔

اللہ کے پیغمبروں کی تصویر کشی قرآن کرتا ہے وہ یہودی اور مسیحی عقل وفہم کے درمیان ایک وسطی راستے پر ہوتی ہے۔ عہد نامہ قدیم میں ان پر جو بڑے بڑے گناہوں کے الزامات

Marfat.com

لگائے گئے تھے وہ ان سے بری کردیئے گئے ہیں لیکن جس طرح حضرت عیسیٰؑ مسیحیت میں خدائی صفات کے کمال پر دکھائی دیتے ہیں انہیں وہ درجہ و مقام نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ کو انجیل مقدس میں مکمل انسانی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ یہ دونوں رجحانات انتہائی درجے کی منفیت اور یاسیت کی طرف لے جاتے ہیں، اول تو اس لئے کہ مثالیں بمشکل قابل مثال ہیں اور ثانیاً اس لئے کہ ایسی کوشش حقیقت پسندانہ نہیں ہوگی۔ اسلام پر یہ تنقید غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ برائی کی طرف انسان کی پیدائشی کمزوریوں اور میلانات کو مناسب طور پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔

لیکن جیسا کہ گذشتہ باب میں بحث کی جا چکی ہے کہ اسلام اور خاص طور پر قرآن انسان کے اپنی تباہی کے میلانات کا پورا پورا جائزہ لیتا ہے۔ ایسی تشویش یا فکر مندی ہی مکمل پیغام نہیں نہ ہی یہ زندگی میں انسان کا مقصد ہے۔ قرآن کے نزول کا مقصد صرف یہیں تک محدود نہیں کہ ہماری ناکامیوں سے آگاہ کیا جائے یا اللہ کے لطف و کرم اور اس کی صفات غفاری کے بارے میں ہمیں بتایا جائے۔ بلکہ یہ ہماری حوصلہ افزائی کیلئے اور ہمیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر قابو پانے کیلئے جدوجہد کر کے اپنی اصلاح کر لینے کی ہدایت بہم پہنچانے کیلئے ہے۔ یہ بھی کبھی بھی آسان کام نہیں رہا، قرآن کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی کوشش کبھی ترک نہیں کرنی چاہئے نہ ہمیں مایوس و ناامید ہونا چاہئے۔ اللہ کی اطاعت تک کا فاصلہ صرف ایک قدم طے کرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، یہ تو ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ قرآن پاک میں خدا نے اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ رغبت اور لالچ کے ذریعے ہم بریت و معافی تک پہنچیں۔ یہ تو ایسی صفات تھیں جن کا خدا کے بندوں سے تقاضا کیا گیا تھا۔ یہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اللہ انسانوں سے محبت کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ بغیر کسی سختی کے رضا کارانہ طور پر، اپنی خوشی و آزادی سے تمام انسان اس خالق و مالک کی مرضی و منشا کے سامنے جھک جائیں، سر تسلیم خم کر دیں۔

مغربی دنیا کے نومسلموں کا تسلسل کے ساتھ کیا گیا ایک تبصرہ یہ ہے کہ قرآن میں جس محمد عربی ﷺ کا ذکر ہے وہ اس محمد ﷺ سے بالکل مختلف ہیں جو روایات اور سیرت کی کتابوں، ہفتہ وار نماز جمعہ کے دوران واعظین کے خطبات میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہمیں کوئی متضاد یا ناموافق اور بے جوڑ نقطہ نظر ملتا ہے بلکہ فرق ان معنوں میں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی مختلف صفات بیان کرتا ہے۔

Marfat.com

وعظوں، کہانیوں، روایتوں اور جنگ و جدل میں آپ ﷺ کی فتوحات کا ذکر ہے، معجزات بیان کئے گئے ہیں آپ کی شاندار قائدانہ صلاحیتوں کا ذکر ہے، صحابہ کرام کی وفاداری بیان کی گئی ہے، قوانین، قواعد وضوابط کے نفاذ اور تشہیر کی تفصیل ملتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی بے مثل روحانیت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو لوگوں کو متاثر کرتی ہیں، خصوصاً ابتدائی دور کے مسلمانوں کو کیونکہ یہ چند ایک ایسے واقعات تھے جن سے ان پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں سے بہت کچھ دھندلا جاتا ہے جس میں نبی ﷺ کی اپنی سیرت بھی شامل ہے۔ جو کچھ باقی بچتا ہے وہ یہ رہ جاتا ہے کہ ایسا انسان ہے جو اپنے ہمسائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے، انہیں دکھ نہیں دیتا اور غزوۂ احد میں شکست و ناکامی کے باوجود اپنے پیروکاروں اور ساتھیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے۔ بہت جلد دوسروں کو معاف کردیتا ہے اور ماضی کے دشمنوں کی ارواح کی بخشش کیلئے دعا کرتا ہے سراپا رحمت ہے، اسے مہربان اور رحمدل دکھایا جاتا ہے، جو ایمان والوں کیلئے سراپا رحمت ہے، رحمت ہے تمام انسانوں کے لئے، تمام مخلوقات کیلئے۔ اپنے مشن کی کامیابی کیلئے فکر مند دکھائی دیتا ہے اور دوسرے انسانوں کیلئے، ان کی ہدایت کیلئے حریص نظر آتا ہے حالانکہ اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اس کو ہدایت نہیں کرتا، اس پر اُسے یاد دلایا جاتا ہے کہ اس کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں تک پیغام پہنچادے۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ جن سے وہ محبت کرتا ہے ان کو ہدایت بھی مل جائے اگر اللہ نے اس کے برعکس فیصلہ کرلیا ہو۔ یہ ایک جزوی جھلک ہے، ایک پرتو ہے محمد ﷺ کا لیکن یہ بہت اہم بھی ہے اس لئے کہ قرآن میں جو کچھ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے یہ اس سیرت وکردار کا ایک رخ ہے۔

اسے بہتر طور پر جاننے، قریب تر سے جاننے کی خواہش کو دبایا نہیں جاسکتا، خاص طور پر اس وقت جب کسی کی نشوونما (قبول اسلام سے قبل) بائبل پر ہوئی ہو جہاں پیغمبروں کو مرکزی مقام ودرجہ حاصل ہوتا ہے۔

قرآن محمد ﷺ کے اندر کی کشمکش کو تمثیلی شکل میں پیش کرنے سے گریز کرتا ہے، ہمارے لئے صرف مختصر اشارات اور نشانات رہ جاتے ہیں۔ ہم حضرت عیسیٰؑ کی طرح مثلاً جب وہ صحرا

Marfat.com

میں اپنے بہکاوے اور تحریص سے لڑتے ہیں آپ کے خدشات، شک وشبہات اور اضطراب کو براہ راست اور صاف صاف نہیں دیکھ سکتے (متی ۔۴ لوقا۔۴) یا گت سمانے کی شب اپنی گرفتاری سے قبل (متی ۲۶۔ مرقس ۔۱۴۔لوقا۔۲۳) یا اپنے آخری کرب میں صلیب پر (متی ۔ ۲۷۔مرقص ۔۱۵۔لوقا۔۲۳)

سیرت اور حدیث کے دوسرے اسلامی ماخذ میں بھی جن پر نیچے بحث ہوگی، ہمیں آپؐ کے بیانات، ردعمل کے بارے میں معلوم تو ہوتا ہے مگر ان کے اندرونی اور ذاتی تصورات کے بارے میں ہمیں بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس سے میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہم بہت کم نبیؐ کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تا کہ ہمیں حضور ﷺ کے جذبات واحساسات تک رسائی کی سعادت حاصل ہو سکے۔ اس کے برعکس ہم آپؐ کے بارے میں کسی وسیلے یا واسطے کے ذریعے معلومات حاصل کرتے ہیں خواہ وہ خداوند کریم خود ہو یا حضور ﷺ کے کوئی صحابی۔ غالباً محمد ﷺ کو اس ذاتی سطح پر جاننا کبھی ہمارا کام ہی نہ تھا تا کہ ہمیں یہ ضرورت ہی پیش نہ آئے کہ ہم اس قدر ادب و احترام کے لائق ہستی کو جان سکیں۔ اور ہم اپنی تمام روحانی آرزوئیں اور تمنائیں مکمل طور پر صرف الرام الراحمین کی ذات سے وابستہ کرسکیں۔ جزواً اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ خدائی منصوبے اور نظام کے ڈھانچے میں نبی کریم حضرت محمد ﷺ کے منصب کا ذکر بار بار کیوں آتا ہے۔ یہ تقریباً بے نام منصب اور تقرر ہیں رسولؐ (پیغمبر) اور نبیؐ (۷)

مسجد میں

مجھے کلمہ شہادت پڑھے تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور محمود اور میں اب دوستوں سے بھی زیادہ قریبی رشتے میں منسلک ہو چکے تھے اسلام نے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی گاڑی میں فیرفیلڈ ایک ایسا لیکچر سننے گئے جس کا اہتمام مقامی مسجد میں مسلم طلبہ کے گروپ نے کیا تھا، یہ مسجد ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھی جو پہلے گھر تھا مگر بعد میں اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم سامعین میں پیچھے کھڑے ہو گئے تھے اس لئے نہیں کہ میں واحد امریکی تھا بلکہ اس وجہ سے کہ صرف ہم دونوں مغربی لباس میں تھے۔ پھر زیادہ دیر نہ گزری

Marfat.com

تھی کہ ہمیں فرش پر بیٹھنے کو جگہ مل گئی تھی، پہلے مقرر نے بولنا شروع کیا۔ وہ اپنے سننے والوں کو یاد دلا رہے تھے کہ نبی ﷺ اور آپ ؐ کے صحابہ کرام کے مقابلے میں ان کا ایمان کمزور تھا اور اس ضمن میں مقرر نے یہ قصہ سنایا:

> محمد ﷺ کو صحرا میں ایک بدو ملا جسے آپ ؐ نے اسلام کی دعوت دی۔ بدو اسلام لانے سے ہچکچا رہا تھا اور نبی ؐ سے جو آپ ؐ فرما رہے تھے اس کا ثبوت چاہتا تھا۔ حضور ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا کوئی گواہ کافی ہوگا۔ ''ہم بہت دور کھڑے ہیں، میلوں دور تک دوسرا کوئی انسان نظر نہیں آ رہا۔ اس صورت میں آپ ؐ کی گواہی کون دے گا؟'' بدو نے کہا۔ نبی ؐ نے قریب کے ایک درخت کی جانب اشارہ فرمایا اور کہا: ''یہ میرا گواہ ہوگا''۔ اسی لمحے اس درخت کا تنا ایک طرف سے زمین سے پھٹا اور چل کر دونوں کی جانب بڑھا پھر ایک قدم اور اٹھا کر مزید قریب ہوا اور اس لمحے اس کے تنے کا دوسرا حصہ بھی زمین سے جدا ہو چکا تھا۔ بدو نے خوفزدہ ہو کر یہ سب کچھ دیکھا اور چلایا۔ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

میرا دوست محمود میرے چہرے کی طرف دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ میں مطمئن نہیں تھا اور پھر اس نے اپنے طور پر لیکچر کے بعد اس کی کمی کی تلافی کرنی چاہی جو اس لیکچر میں مجھے محسوس ہوئی تھی۔ بے شک وہ یہ کہنے میں صحیح تھا کہ یہ نمائندہ سامعین نہیں تھے اور اس قصے کی قدر و قیمت اس کا تاریخی استناد نہیں تھا بلکہ خدا کے تصور اور اس کے جلال کو سننے والوں کے دلوں میں ابھارنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ مگر سامعین میں سے زیادہ لوگ مبہوت ہو کر یہ قصہ اور ایسے ہی دوسرے قصے سن رہے تھے اور سننے کے بعد ہمیشہ تعریف و تحسین کا اظہار کرتے تھے۔ مگر یہ اسلامی سے زیادہ ایک مغربی عذر خواہی اور معذرت ہے۔ میری ذاتی رائے میں ایسے قصے کہانیاں اس دلیل و حجت کی اہمیت کے خلاف جاتی ہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں ملتا ہے اور جس میں تخلیق کائنات اور قدرت کی صناعیوں کے مقابلے میں مافوق الفطرت باتوں کی اہمیت

Marfat.com

کم کر کے دکھائی گئی ہے۔تاہم محمود نے اپنی ایک خاص موقعہ شناسی کی صفت سے کام لے کر ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ کر کے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ہم کون ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے تناظر کی درستی سے محض اس لئے انکار کردیں کہ یہ ہمارا نقطہ نظر یا ہماری معلومات سے مطابقت نہیں رکھتی؟۔

مجھے اب یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ حدیث نبوی کے مقام کے تعین کے بارے میں، اپنی نئی امہ کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے مجھے زیادہ علم کی ضرورت تھی۔ میں ایک طرح کے الجھے ہوئے خیالات سے دوچار ہونے والا تھا۔ایک قسم کی بھول بھلیوں میں داخل ہونے کو تھا،تحریف وکجی،تشکیک اور کٹر مذہبی عقیدے کی بھول بھلیوں میں۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کی چھان بین صرف اطاعت شعاری کے ساتھ سطحی طور پر کی جاسکتی ہے اوراس میں بدگمانی یا وسوسے کی گنجائش بہت کم رکھی گئی ہے۔ یہ وہ علم ہے (علم حدیث) جس پر استشراق نہایت بھیانک تنقید کرتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلم سکالرز کی ان تصانیف میں خواہ وہ انگریزی میں ہوں یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہوں اس حملے کا جواب بہت ناکافی اور کمزور دیا گیا ہے۔(۸) جومسلمان مغربی دنیا میں رہتے ہیں ان کیلئے اس کے مؤثر جواب کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع اور مضمون ہے جوامت مسلمہ کومتحد کرنے اوراس کی رہنمائی کیلئے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور ایک بالکل ہی اجنبی ماحول میں اپنی حفاظت کیلئے ایک بہت بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ایک مرد یا عورت جب ایمان لے آتے ہیں تو انہیں بہت جلد یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی زندگی میں سنت اور حدیث کا کیا رول ہے اور اسے اختیار کرنے کی انہیں کس حد تک ضرورت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اختیارات اور حق انتخاب اس قدر شدید دیئے گئے ہیں کہ بہت سے نومسلم جلد یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جس امہ میں وہ شامل ہوئے ہیں اس کے افراد اوران کے درمیان ایک کھچاؤ اور کشیدگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

میرے خیال میں اس صورتحال سے بچنا آسان تھا اگراس موضوع پر دیانتدارانہ،طور پر کھلی بحث اور تبادلہ خیالات کا موقعہ فراہم کردیا جاتا۔ بے شک اس مسئلے کوحل کرنے کیلئے میرے اندر وہ قابلیت وصلاحیت یا تجربہ نہیں تاہم پھر بھی میں اپنے محدود تناظر میں چند اہم نکات پیش کروں گا۔آیئے ہم چند کلیدی اصطلاحات سے ابتداء کرتے ہیں۔

Marfat.com

حدیث، سُنت اور سیرت

عبداللہ ابن سلام نے الزبیدی کی سند کے متعلق کہا: عبدالرحمٰن ابن القاسم نے کہا: میرے والد القاسم نے مجھے بتایا کہ حضرت عائشہؓ نے کہا۔ نبیؐ نے نظریں اوپر اٹھائیں اور تین بار فرمایا: اپنے عظیم صحابہ کرام کے درمیان بیٹھ کر...... (۹) درجہ بالا حدیث کی ایک ایسی مثال ہے جو مجموعی طور پر اس شعبہ علم سے تعلق رکھتی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور سے مسلم اور غیر مسلم سکالرز کے لئے گہرے مطالعہ کا موضوع رہا ہے۔ لفظ ''حدیث'' کے اصل معنی ہیں ''جدید، نیا، نئے انداز ے۔'' جب اسے فعلی شکل میں ابلاغ کیلئے استعمال کیا جائے تو عموماً اس کا مفہوم ''نیوز یعنی خبر'' لیا جاتا ہے۔ کسی نے جو کہا یا جو واقعہ ہوا اس کی رپورٹ یا تفصیل۔ اور جسے گواہوں نے بتایا یا جنہوں نے باوثوق ذرائع سے اس کے بارے میں سنا تھا۔

اسلامی علم و فضل میں علم حدیث نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال (یعنی جو آپ نے فرمایا اور جو عملی زندگی میں کیا) کے مطالعہ تک محدود ہے اسے مسلمان اپنی زندگیوں میں رہنمائی کا دوسرا ابدی ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ (قرآن کو اولین ذریعہ سمجھا جاتا ہے)۔ لفظ سنت کے لفظی معنی ہیں ''راستہ'' یا ''راستہ جس پر سفر کیا گیا ہو''۔ جب سنت کے حوالے سے استعمال ہو تو اس کے معنی ہیں زندگی بسر کرنے کی مثال اور آپ کا مثالی نمونہ۔ اسوۂ حسنہ۔ اس لئے اسے حدیث لٹریچر کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے، کیونکہ ہم حدیث ہی کے واسطے اور ذریعے سے محمد ﷺ کے کاموں اور آپؐ کی زبانی کہی گئی باتوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ محمد ﷺ کی بہت سی سوانح عمریاں سیرت کی کتابیں کہلاتی ہیں لیکن سردست ہم صرف حدیث کے موضوع تک اپنی گفتگو محدود رکھیں گے۔

اوپر دی گئی مثال کی طرح ہر حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں: ''اسناد'' (روایت کرنے والوں کا ایک سلسلہ جن کی زبانی یہ بیان کی گئی ہے) اور ''متن'' (اصل نفس مضمون اور موضوع کا مواد)۔ اس شعبے کے مسلم ماہرین دونوں حصوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، دو احادیث جن کا متن ایک ہو لیکن اسناد مختلف، استناد یعنی صحت و صداقت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی مختلف ہوگی۔ اسناد میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہر مرحلے پر کسی حدیث کو منتقل

Marfat.com

کرنے اوراس کی ترسیل کے وقت اختصار کو بڑی توجہ دی جاتی ہے جو مسلمانوں کیلئے کسی حدیث کی درستی، صحت وصداقت اور ان افراد کا قابل اعتبار ہونا جن کی زبانی روایات احادیث کے مستند مجموعوں تک پہنچی تھیں، ان سب باتوں کی تصدیق کرتی تھی۔ نہایت قابل احترام، احادیث کے جمع کنندگان کے زہد وتقویٰ کا جب ذکر ہوتا ہے تو اس تصور کو تقویت ملتی ہے، مثلاً البخاری اور مسلم، جنہوں نے طویل سفر کی مشکلات اور تکالیف برداشت کیں تب کہیں نئی احادیث اکٹھی کر سکے اور ان کے متن کی زبان کو درست کیا اور پہلے سے موجود احادیث میں انہیں مربوط بنانے کی کوشش کی۔ اسلامی عہد کی تیسری صدی میں احادیث کے مستند مجموعے تیار کئے گئے جو مولف سکالرز کے ناموں کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع الترمذی، سنن النسائی اور سنن الدارمی، زیادہ تر مسلم ماہرین ان چھ مجموعوں کو سب سے زیادہ مستند سمجھتے ہیں جبکہ ان سب میں البخاری اور مسلم کو استناد وصداقت کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ ان بڑے محدثین کا کام دوسری اسلامی صدی کے آخر میں اس لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کیونکہ قانونی استدلال میں احادیث نبوی نے ایک اہم مقام حاصل کرلیا تھا (۱۰) اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس سے انکار ممکن نہ تھا کہ ہزاروں احادیث سیاسی، گروہی و جماعتی، حیلۂ شرعی کے نام پر، تعصب، ذاتی اغراض اور شرانگیز مقاصد کیلئے گھڑ لی گئی تھیں (۱۱)۔ اس بات کی طرف دھیان دینا ضروری ہے کہ یہ مستند مجموعے کوئی نئے نہ تھے بلکہ یہ تو عروج تھا ایک اجتماعی کوشش کا جسے مسلم سکالرز نے نبی ﷺ کی زندگی ہی میں شروع کیا تھا تا کہ آپ ﷺ کی زندگی سے متعلق مستند معلومات کو تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جائے۔ (۱۲) اس کام میں جعل سازی کس حد تک شامل ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جن ساٹھ ہزار احادیث کو امام بخاری نے پرکھا ان میں سے صرف دو ہزار چھ سو دو کو صحیح البخاری کے لئے قبول کیا۔ (تکرار کو شمار نہیں کیا) (۱۳) یہ بات گمراہ کن ہے کیونکہ امام بخاری نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کے مجموعہ احادیث سے باہر کوئی مستند احادیث نہیں تھیں۔ اور ساٹھ ہزار کی تعداد حتمی رپورٹوں سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ ان میں تمام مختلف واسطے شامل ہیں جن کے ذریعے یہ ان تک پہنچیں۔

جب امام بخاری نے کسی مخصوص حدیث کو منتخب کیا تو اسی متن کی بہت سی دوسری احادیث کو آپ اس بنیاد پر رد کردیتے تھے کہ اس کے اسناد امام بخاری کی کسوٹی اور معیارات پر

پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کیلئے اور تمام محدثین کے لئے، کسی حدیث کی صحت وصداقت اصولاً اس کے اسناد سے متعین کی جاتی تھی جبکہ متن کو محض ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ (۱۴) کسی حدیث کے مستند ہونے کیلئے ضروری تھا کہ اس کے راویوں کی ایک طویل فہرست ان لوگوں کے ناموں پر مشتمل ہو جو قابل اعتماد ہوں اور ان کے عیوب اور نقائص چھپے ہوئے نہ ہوں۔

مثال کے طور پر اگر اسناد کسی طرح سے منقطع ہو گئے ہوں، یعنی راویوں میں سے دو کا جسمانی اور ذاتی رابطہ فی الحقیقت برقرار نہ رہ سکا ہو تو اس حدیث کو بلا تامل رد کر دیا جائے گا۔ دوسری اسلامی صدی کے دوران کسی حدیث کی اسناد کا قابل اعتماد ہونا ایک ایسی ضرورت تھی جو احادیث کے راویوں کے ضخیم سوانحی کوائف جمع کرنے کی اہمیت کو وجود میں لاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے کردار، ایمانداری و راستبازی اور ذہانت و قابلیت کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے پر زور دیتی تھی۔ (۱۵) یہ لٹریچر جو اسماء الرجال (مردوں کے نام) کہلاتا ہے اس قدر وسیع اور قیمتی تقریباً آزاد و جداگانہ علم بن گیا کہ سپرنگر نے اسے ''دی گلوری آف محمڈن لٹریچر'' (اسلامی ادب کا عروج) کا نام دیا۔ (۱۶)

علم حدیث، روایات کو تین درجوں میں تقسیم کرتا ہے: صحیح، حسن اور ضعیف۔ اس آخری درجے اور گروپ کو مزید تقسیم کر دیا گیا ہے: معلق۔ مقطوع، منقطع، مرسل، مادوع، اور اسناد میں یا متن میں غلطی پائی جائے تو اسے مصحف کہیں گے۔ مسلمانوں کی پہلی نسلوں میں یہ احادیث بھی اپنے منتقل کرنے والوں کی تعداد کے حساب سے تقسیم کی گئی ہیں۔ ''متواتر'' کو پہلی تین نسلوں کے اس قدر زیادہ منتقل کرنے والوں کے لئے منتقل کیا گیا کہ ان کے استناد کے بارے میں بہت کم شک وشبہ ہوتا ہے (۱۷) احادیث کو منتقل کرنے والوں کی کم از کم تعداد کیا ہونی چاہئے اس بارے میں سکالرز کی آراء مختلف ہیں یہ تعداد سات سے لے کر ستر تک بتائی گئی ہے۔ اس گروپ میں احادیث کی تعداد بہت کم ہے۔ ''مشہور'' جو تعداد میں زیادہ ہیں، پہلی نسل میں سے انہیں منتقل کرنے والوں کی تعداد دو سے چار تک تھی اور آئندہ کی دو نسلوں میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اسلامی قانون میں شروع ہی سے احادیث کے ان دو گروپوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلی تین نسلوں میں ''احد'' احادیث کو منتقل کرنے والوں کی تعداد چار یا اس سے کم تھی اور امام شافعیؒ (۱۸) کے دلائل کی بناء پر یہ ''متواتر'' اور ''مشہور'' احادیث کے

Marfat.com

ساتھ مل کر سنی فقیہان کیلئے اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ اور حوالہ بن گئیں۔ (مستشرقین انہیں عام طور پر رجعت پسند کہتے ہیں)

اس مختصر سی تمہید سے اس کلاسیکی اسلامی علم کی وسعت و پیچیدگی کے بارے میں یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ بدقسمتی سے اس شعبے کے ماہرین میں ایک بہت قلیل سی تعداد ہو گی جو اپنے تبحر علمی پر ناز کر سکے۔ جیسا کہ صدیقی لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں مکمل نظام تعلیم، خصوصاً علم حدیث (جہاں تک میری معلومات ہے) گھٹتے گھٹتے محض ایک رسم یا شعائر کی حیثیت تک محدود ہو گیا ہے۔ بہت کم اساتذہ ایسے ہوں گے جو اسماء الرجال، ایک ایسا مضمون جو مطالعہ حدیث کیلئے بہت ضروری ہے، کا علم رکھتے ہوں۔ (۱۹)

وہ نومسلم جن کی حدیث لٹریچر تک براہ راست رسائی قرآن تک رسائی کے مقابلے میں بہت کم ہے، اپنے آپ کو اس شعبے کے بارے میں پابہ زنجیر محسوس کرتے ہیں، ماہرین کے بروقت نہ ملنے کی وجہ سے کئی روایات کا حوالہ بلا امتیاز عام مسلمان دے دیتے ہیں۔ تاکہ کسی بھی تصور یا رویے کی تصدیق کر سکیں۔ یہ معاملہ نومسلم کے پس منظر میں مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔ اگر نو مسلم مرد یا عورت یہودی مسیحی روایت سے آیا ہے، جو کسی حد تک رد کی جا چکی ہے تو اس مرد یا عورت نے پہلی ہی شہادتوں کا ایک متوازی ورثہ رد کر دیا ہوتا ہے جو کم از کم اب تک محفوظ سمجھی جاتی تھیں۔ ان مغربی ماہرین علم و فضل کی تنقید کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے جنہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہودی اور مسیحی صحیفوں میں انسانی مداخلت کو بے نقاب کر دیا ہے اور یہ ماہرین محمد ﷺ کی احادیث کے سلسلے میں اسی طرح کے نتائج تک پہنچے ہیں۔ یہ بھی مشکل کام ہے کہ ان تفصیلات کی صداقت کے بارے میں سوال نہ کیا جائے جو نبی ﷺ سے جو توقعات وابستہ ہوں اس سے متضاد ہو یا جو کسی ایسی بات کی تظہیر کرے جو نہایت شدید اور غیر معقول طرز عمل دکھائی دے۔ پھر ان سب سے بالاتر یہ کہ ایک مسلمان سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس اثبات دعویٰ کو تسلیم کر لے کہ وہ تمام احادیث جنہیں ابتدائی دور کے اور ہمعصر مسلم ماہرین کی اکثریت نے سچ مان لیا تھا وہ سچی ہیں اور محمد ﷺ کے ارشادات اور افعال کی بالکل صحیح رپورٹیں ہیں۔

اس سے بہت سے نومسلم اپنے آپ کو بڑی مشکل میں محسوس کرنے لگتے ہیں کہ پہلے تو انہیں عقل کے ذریعے کسی تاویل تک پہنچنے کی اجازت دی جائے پھر انہیں کسی مذہبی اصول کے

Marfat.com

سامنے بے چوں و چرا جھک جانے کیلئے کہا جائے اس لئے کہ وہاں سوال اٹھانے کی اجازت ہی نہیں، اس پر ایمان لانا بڑا مشکل کام ہے اور یہ اکثر مجبور کر دیتا ہے کہ کوئی شخص اپنی وابستگی اور عہد و پیان کی سچائی کے ساتھ مصالحت کر لے۔

ہم ان تمام نکات کو ایک ایک کر کے اٹھائیں گے اور آغاز اس بات سے کریں گے کہ حدیث اور بائبل کے درمیان تضادات کیا کیا ہیں۔

عہد نامہ جدید اور حدیث

بہت سے مسلم اور غیر مسلم مصنفین یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن اور بائبل ایک دوسرے سے مختلف صحیفے ہیں، خصوصاً ادبی اسلوب کے لحاظ سے، صداقت اور اس طریقے کے لحاظ سے جس کے ذریعے وہ ہمارے زمانے تک پہنچے ہیں۔ یہی بات احادیث کے مجموعوں اور عہد نامہ قدیم کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، حالانکہ اس معاملے میں بمقابلہ اول الذکر تضادات غالباً اتنے بڑے نہیں مگر مطابقت اور مماثلت کی حوصلہ شکنی کرنے کیلئے کافی بڑے ہیں۔ حالانکہ مصنفین نے احادیث کے مستند مجموعوں اور عہد نامہ جدید (۲۰) کے درمیان یکسانیت کی بات کی ہے مگر گہرا جائزہ لیا جائے تو کئی بڑے تضادات سامنے آتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مذہبی معاملات میں دونوں کا مقصد اپنے اپنے لوگوں کی رہنمائی ہے۔ اور دونوں میں وہ تعلیمات شامل ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قانون تین سو سال سے زیادہ عرصے تک ان کی اپنی اپنی ملت اور گروہوں میں نافذ ہوا تھا جو ابتدائی وحی الٰہی کی ترسیل پر انحصار کرتا ہے۔

لیکن پہلے دو فرق عام ہیں کیونکہ تقریباً تمام مقدس کتابوں میں یہ صفات یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور آخری دو کسی حد تک بڑی سطحی ہیں کیونکہ ان کی تصنیف و تالیف کے پیچھے مختلف مقاصد اور طریقے کارفرما تھے۔

احادیث کی جمع آوری کے پیچھے تین بڑے محرکات تھے۔ پہلا یہ کہ محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے مشن نے ان کے معاصرین پر اس قدر گہرا اثر کیا، بلکہ پوری تاریخ انسانی کو اتنا

متاثر کیا کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کیلئے یہ قدرتی امر تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں اور آپؐ کی انقلابی تحریک کے بارے میں جتنی معلومات مل سکتی تھیں اکٹھی کرلیں۔ دوسرا یہ کہ قرآن پاک کی تشریح وتفسیر کیلئے آپؐ کے ارشادات معلومات کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ تیسرا یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ قانونی مسائل جو مسلمان قانون دانوں اور فقیہوں کو درپیش تھے ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا اور جب حضور ﷺ کی سلطنت میں توسیع ہوئی تو ان مسائل کی پیچیدگی بھی بڑھتی گئی۔ قانون دان اپنی قانونی اور اخلاقی جبلتوں پر اعتبار کرنا چھوڑتے جارہے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ واضع، جامع ومفصل یا قیاس پر مبنی پیغمبرانہ فتاویٰ اور نظریوں کی ضرورت اور طلب بڑھ گئی تھی۔

عہد نامہ جدید کی اشاعت کے پس پردہ جو محرکات تھے وہ کچھ مختلف حالات کی پیداوار تھے۔ جیسا کہ یہ بات تمام پیغمبروں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے حضرت عیسیٰؑ نے فوری انقلاب اور تبدیلی کی تبلیغ کی۔ تاہم جہاں تک ہم بہتر سے بہتر طور پر بتا سکتے ہیں اس کا رخ اخلاقی اور روحانی تبدیلی کی طرف تھا اور اس میں وہ اصل قانون اور ضوابط شامل نہ تھے جو اس کے معاشرے میں نافذ العمل تھے وہ اصلاح وتبدیلی چاہتے تھے مگر موجودہ معاشرتی ڈھانچے کو از سر نو ڈھالنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

ہمارے لئے یہ قیاس آرائی آسان ہے کہ اگر وہ زیادہ عرصہ زندہ رہتے تو وہ کن سمتوں میں لے جاتے، لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہوگا۔ غالباً وہ ایک فرد کی اندرونی روحانیت پر ظاہری شعائر کی نسبت زیادہ زور دیتے تھے یا اپنے مشن کے اختصار کو، لیکن کسی وجہ سے ان کے اقوال و ارشادات اور افعال کا تقریباً کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے حضرت یسوع مسیح نے اپنے بعد کوئی نئی الہامی کتاب بھی نہیں چھوڑی جس کی تشریح وتصریح باقی ہو۔ ابتدائی مسیحی گرجا گھروں کی تمام تر دلچسپی ایک دشمن حکومت کی موجودگی میں اپنی تنظیم اور وجود کو برقرار رکھنے تک محدود تھی اور اس کے ساتھ ساتھ نئے مذہب کی تعلیمات کی بنیاد ایک باقاعدہ جامع نظام قوانین وضع کرنے کی جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ایک نیا گروہ بنانے کی کوشش میں ابتدائی مسیحی مصنفین نے یسوع مسیح کی اصل روایات یا ارشادات کی جانب توجہ دینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

Marfat.com

تیسری اسلامی صدی کے آغاز میں علم حدیث اس قدر اہم اور مؤثر بن چکا تھا، کم از کم دائرہ قانون میں، کہ قرآن کے بعد احادیث بڑی تیزی کے ساتھ سند میں دوسرا مقام حاصل کررہی تھیں۔ یہ قیاس سے آگے نکل کر دلیل و حجت کا مقام تھا اور آزادی کے ساتھ رائے دینے کا اختیار بھی لوگوں کو حاصل ہوگیا تھا۔(۲۱)۔ مستند احادیث کے چھ مجموعوں کے محدثین اور بہت سے دوسرے محدثین نے اس علم میں ترقی کے پیش نظر مختلف عنوانات کے تحت اپنے جمع شدہ مواد کو مرتب کرنا شروع کردیا تھا۔ اس سے قانونی تفتیش میں آسانی پیدا ہوگئی تھی اور ان رپورٹوں تک بڑی احتیاط اور چوکنا ہوکر پہنچنے سے ان کی صداقت وصحت تک پہنچا جاسکتا تھا۔ اس علم کی ترقی وترویج سے متعلق ہمارے پاس مفصل معلومات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ خصوصاً یہ بھی کہ مستند احادیث کے مجموعوں کی تشکیل کے پیچھے انتخاب احادیث کیلئے کن کن باتوں اور طریقوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا جیسا کہ نیو آکسفورڈ کی مشرح بائبل میں غیر مستند اناجیل کے بارے میں بتایا گیا ہے مگر یہی کچھ عہد نامہ جدید کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا۔

مفصل اور واضح معلومات کی عدم موجودگی میں ان سوالات کے جوابات دینا مشکل ہے کہ عہد نامہ جدید کی موجودہ کتابیں کیوں، کیسے اور کب حتمی طور پر ایک مجموعہ میں شامل کی گئی تھیں۔(۲۲)

درج بالاسطور دونوں اناجیل میں جو بنیادی فرق ہے، اسے نمایاں کرتی ہیں:

تیسری اسلامی صدی میں مستند احادیث کے لٹریچر کی ترتیب وتشکیل علمی لحاظ سے ایک باقاعدہ تنقیدی کوشش کا مقام عروج ہے جبکہ عہد نامہ جدید کی تالیف کے تقریباً پندرہ سو سال بعد تک بھی اس پر تقابلی جائزے یا ناقدانہ نظر کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ مستشرقین نے مسلم سکالرز کے پیش کردہ نتائج اور فیصلوں کی صداقت اور سچائی کو موضوع بحث بنا دیا ہے اور اس مسئلے پر ہم جلد ہی آگے چل کر بات کریں گے۔

ان دونوں مجموعوں کی ترتیب، ہیئت اور متن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ عہد نامہ جدید کو دو نمایاں ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: اناجیل اور مکتوب عہد نامہ جدید کے مکتوبات۔ کرسچین چرچ کے مختلف اساتذہ نے مذہبی گروہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی حوصلہ افزائی اور ہدایت کیلئے لکھے تھے لیکن کبھی کبھار یہ مکتوبات مختلف افراد کو بھی علیحدہ علیحدہ بھیجے گئے تھے۔

Marfat.com

ان مکتوبات کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: وہ جو پال سے منسوب ہیں اور وہ جو دوسرے لکھنے والوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہ بات اب عام طور پر مان لی گئی ہے کہ وہ مکتوبات جوان سے منسوب کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب انہوں نے کسی مذہبی رسم کے تحت نہیں لکھے تھے (۲۳) البتہ ان میں سے اکثر مکتوبات بلا شبہ انہوں نے ہی تحریر کئے تھے اور بعد کے نقل نویسوں کو اجازت دی تھی کہ وہ ان میں تبدیلیاں کرلیں۔ پال کے خطوط غالباً عہد نامہ جدید کی سب سے ابتدائی تحریروں میں سے ہیں کیونکہ ان کے خطوط اور دوسرے بہت سے خطوط پر اناجیل سے پہلی کی تاریخیں درج ہیں۔ مجموعی طور پر ان مکتوبات میں حضرت عیسیٰؑ کے تھوڑے سے اقوال شامل ہیں اور چند ایک بہت مختصر حوالے ان کی زندگی سے متعلق ملتے ہیں۔ تاہم کچھ اہم مسیحی مسائل اور نظریات جیسے حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا اور ان کا دوبارہ زندہ ہونا، ادائیگی کفارہ اور ابراہیمی معاہدے کی جگہ نئے معاہدے کو لے آنے سے متعلق باتیں ان میں موجود ہیں۔

عہد نامہ جدید کی چار اناجیل جو پہلی صدی کی آخری تہائی میں لکھی گئی تھیں وہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کے فرضی ناموں سے تحریر ہوئیں اور ان کے اصل مصنفین کا کسی کو علم نہیں۔ مرقس کی انجیل تقریباً ۷۰ بعد از مسیح میں لکھی گئی تھی اور اسے اولین انجیل تصور کیا جاتا ہے اور متی اور لوقا کی تحریر کردہ اناجیل کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر مرقس کی انجیل کو بنیاد بنا کر لکھی گئیں اور یہ ایک ایسا ماخذ ہے جو عیسیٰؑ کے اقوال (جسے کیوسورس کہا جاتا ہے) اب تک محفوظ و موجودہ ماخذ نہیں ہے (۲۴) متی، لوقا اور مرقس کی اناجیل میں اس قدر مشترک مواد و متن ہے کہ انہیں بیانات کی مماثلت والی اناجیل کہا جاتا ہے۔ یوحنا کی پراسرار انجیل جو علامات و اشارات اور پراسرار باتوں پر بہت زور دیتی ہے ان تین مماثل اناجیل سے مختلف ہے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ چاروں اناجیل میں سے سب سے زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ اناجیل کا ادبی اسلوب سوانحی رنگ لئے ہوئے ہے اور ان میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے آخری چند ماہ اور ان کی کھلے بندوں تبلیغ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس زمانے میں عہد نامہ جدید کی کتابیں عام فہم یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں جو سلطنت روما کے لوگ بولتے اور سمجھتے تھے اور یہ لوگ تھے جن تک پہلے مسیحی مشنریوں نے اپنا پیغام پہنچایا تھا۔

مستند احادیث کے مجموعوں کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے اس

Marfat.com

لئے یہ حال ہی میں دریافت ہونے والی تیمتھیس کی انجیل سے بہت ملتے جلتے ہیں اس انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کی فہرست شامل کی گئی ہے اور بہت مختصر سا تعارف دیا گیا ہے۔ (۲۵) احادیث کو سن وار ترتیب نہیں دیا گیا اور مسلم امہ کے لئے مصنفین و مرتبین کی طرف سے عملاً کوئی تشریح و تصریح یا ہدایات شامل نہیں کی گئیں۔ تاہم کئی قانونی اور مذہبی نقطہ ہائے نظر کی تحقیق ابواب کے عنوانات سے یا مواد کے انتخاب اور ترتیب سے کی جاسکتی ہے۔

مستند احادیث کے چھ مجموعوں میں بہت سی روایات مشترک ہیں اس لئے کہ راویوں نے اکثر ان احادیث کو لیا جنہیں ان سے پہلے کسی راوی نے اپنے تنقیدی معیارات کے مطابق قبول کرلیا تھا۔

دوسرا بڑا فرق زبان کا ہے جس میں ان احادیث کو قلمبند کیا گیا تھا۔ حدیث کی زبان ہمیشہ عربی ہوتی ہے جو حضرت محمد ﷺ کی زبان تھی۔ تاہم عہد نامہ جدید کی زبان کے بارے میں ہر ماہر کو اس سے اتفاق ہے کہ یہ یونانی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰؑ یہ زبان نہیں بولتے تھے۔ ان کی تعلیمات کی اصل زبان سامی تھی، جو اس زمانے میں فلسطین کی عام زبان تھی۔ (۲۶) بولی اور لکھی جانے والی زبانوں کے اس فرق کا مطلب یہ تھا کہ اناجیل اور عہد نامہ جدید کے مکتوبات لکھنے والوں کے پیش نظر ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے مقصد کو ایک دوسری زبان اور کلچر میں ترجمہ کے ذریعے پیش کریں۔

پس حدیث لٹریچر، خصوصاً مستند احادیث کے چھ مجموعے عہد نامہ جدید کی تحریروں سے بنیادی طور پر اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ انہیں مختلف طریقوں سے جمع کیا گیا، لکھا گیا، پڑھا گیا اور استعمال کیا گیا۔ جہاں معاملہ یہ ہو وہاں ان میں سے کسی ایک پر کسی دوسرے کی بنیاد پر شک وشبہ بیکار ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی فرد غیر مسلم مذہبی میراث کے ساتھ آتا ہے، خصوصاً مسیحی ورثے کے ساتھ تو ایسا مرد یا عورت اس قسم کی مخصوص توقعات ضرور رکھ سکتا ہے کہ ولی صفت اور بزرگانہ کردار کیا ہے اور کیا نہیں ہے اور حدیث و سیرت نبوی کی کتابوں میں جہاں حضور نبی کریم ﷺ کی شبیہ پیش کی گئی ہے وہاں کبھی کبھی اس سے اختلاف بھی ملے گا۔

Marfat.com

توقعات

میری نسل کیلئے ۱۹۶۰ء کی آخری دہائی اور ۱۹۷۰ء کی ابتدائی دہائی امن وسلامتی اور محبت ورواداری کا عہد تھا۔ نوجوان لمبے لمبے بال بڑھا لیتے تھے اور ان میں پھول سجاتے تھے، پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے، داڑھیاں بڑھا لیتے تھے اور ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہماری صورتیں حضرت عیسیٰؑ کی ان تصاویر سے ملتی جلتی تھیں جنہیں دیکھتے دیکھتے ہم جوان ہوئے تھے۔ وہ تصاویر جو ہم نے کتابوں، رنگ اور برش سے بنی تصویروں، مجسموں، رنگدار شیشوں والی کھڑکیوں ور فلموں میں دیکھی تھیں۔ اگر کوئی نشہ آور چیز استعمال کرتا تھا تو وہ اپنی آنکھوں میں اسی قسم کی سبزی مائل چمک کے ساتھ ایک دنیا پرست نظر آتا تھا۔ وہ لوگ جو کھلم کھلا مماثلت کا اعلان کرتے تھے انہیں ''معجزات عیسیٰؑ'' سمجھا جاتا تھا مگر زیادہ نوجوان مذہب میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

مجھے پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے پراسرار عقائد موجود تھے جو مذہب سے دور افراد کو بھی متاثر کر رہے تھے، نہ صرف اس لحاظ سے کہ نوجوان ان جیسے نظر آتے تھے بلکہ دنیا میں امن وسلامتی، محبت اور ایک نئے عالمی نظام کے طلبگار تھے۔ حضرت عیسیٰؑ انتہائی سرگرم عمل اور غیر سرگرم عمل یا بغیر مزاحمت کے برداشت کرنے والے تھے جو کمزوروں اور مظلوموں کو تحفظ دیتے (خصوصاً خواتین کو) اور مروجہ نظام کی منافقت کو ہدف تنقید بناتے تھے، اس کے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتے اور آخر میں انتقام یا بدلہ لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ اس استدلال کے تاریخی استناد کو ان دنوں بڑے چیلنج درپیش ہیں لیکن دو ہزار سال تک مسیحیوں کے لئے حضرت عیسیٰؑ ایسے ہی تھے۔ مغربی دنیا کی نظروں میں تو کم از کم ایسے ہی تھے۔ تاریخ میں یہ نہایت دلفریب اور ہمدردانہ تصویر ہے۔ اس لئے نہیں کہ یسوع مسیح ایک بہت بڑے لیڈر، سیاستدان، جنگجو یا شعلہ بیان خطیب ومقرر تھے بلکہ اس لئے کہ وہ محبت کرتے تھے اور یوں معاف فرما دیتے تھے جس طرح کوئی اور مرد یا عورت معاف نہ کر سکیں۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جو بے جوڑ لگتی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت سے اس کا کوئی واسطہ نظر نہیں آتا۔ اور مسلمانوں کے لئے اسے پرکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ حالانکہ کوششیں کی

Marfat.com

جا چکی ہیں۔ (۲۷) کیونکہ قرآن میں تو ایمان والے کہتے ہیں: ''ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے'' (۲: ۲۸۵) قرآن کا بنیادی سروکار پیغمبروں کے ساتھ نہیں بلکہ انسان کی اس ضرورت کے ساتھ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت اختیار کرلے، سرِتسلیم خم کر کے اللہ کی غلامی میں آجائے۔

اگر یہ اس پورے معاملے کا اختتام ہوتا تو آزادی کے ساتھ اسلام لانے والے (نومسلم) اسے اسلام کا ایک مثبت پہلو تصور کرتے۔ مگر یہ معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایک مرد یا عورت کو اپنے پہلے کے تصورات کے ساتھ مصالحت کرنی پڑتی ہے کہ اصل بزرگی کیا ہے اور ایسا کرتے وقت انہیں ان سوانح عمریوں اور روایات کو سامنے رکھنا ہوگا جو نبی کریم ﷺ کی تصویر کشی کرتے وقت اس بات کا ذکر بھی کرتی ہیں کہ آپؐ نے ان شعراء کو قتل کرا دیا تھا جنہوں نے اس کا تمسخر اُڑایا تھا۔ بنو قریظہ کے آدمیوں کو پھانسی دے دینے اور بچ رہنے والوں کو غلاموں کے طور پر فروخت کر دینے کی اجازت فرما دی تھی۔ آپؐ نے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی سے شادی کر لی تھی جس کا باپ آپؐ کی فوج کے ہاتھوں زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مارا گیا تھا۔ آپ خواتین کو یہ احساس دلا کر کہ وہ اپنی صنف کے لحاظ سے مردوں کے مقابلے میں ادنیٰ و کمتر ہیں، اور جہنم میں ان کی تعداد زیادہ ہوگی ان کے زیور جنگ کیلئے کی جانے والی کوششوں کے نام پر لے لیتے تھے۔ (۲۸)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان ہی کتابوں میں بہت سی قابل ستائش داستانیں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کا جائزہ پیش کرتے وقت واٹ اپنی تصنیف ''محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹس مین'' (محمد ﷺ: نبی اور سیاستدان) کے آخر میں درج ذیل استدلال پیش کرتا ہے جو مسلمانوں کے احساسات وجذبات کے بہت قریب آجاتا ہے:

آپؐ کی طبیعت کی نرمی اور رحمدلی کی ان بہت سی کہانیوں میں سے چند ایک لائق اعتماد و یقین ہیں۔ آپؐ کے چچا زاد حضرت جعفر ابن ابی طالب کی بیوہ نے خود اپنی پوتی کو بتایا کہ انہوں نے جعفر کے انتقال کی خبر کیسے سنائی۔ وہ بتاتی ہیں کہ ایک صبح وہ اپنے گھریلو کام کاج میں مصروف تھیں جس میں چالیس کھالوں کی دباغی (چمڑے کو کمانا) انہیں مسلنا اور نرم و ملائم بنانا شامل تھا، کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آواز دی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اکٹھا کیا، حضرت جعفر

Marfat.com

سے ان کے تین بچے تھے۔ ان کے منہ ہاتھ دھوئے، تیل سے تر کیا۔ حضرت محمد ﷺ اندر داخل ہوئے تو آپؐ نے حضرت جعفر کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔

وہ اپنے بچوں کو لے آئی تو محمد ﷺ نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے کر سونگھا، جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کو سونگھتی ہے۔ پھر حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؐ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ''آپ نے جعفر کے بارے میں کچھ سنا ہے؟'' اس خاتون نے پوچھا اور حضور ﷺ نے انہیں بتایا کہ وہ تو شہید ہو گئے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے آدمیوں کو حضرت جعفر کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اور کہا کہ ''یہ لوگ آج اس قدر مصروف ہیں کہ یہ اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

آپؐ بچوں سے خاص طور پر بے حد پیار کرتے تھے اور ان کے درمیان بہت خوش رہتے تھے۔ غالباً اس کی ایک وجہ ایک ایسے انسان کی آرزو اور تمنا کے سبب تھی جس نے اپنے تمام لڑکوں کو شیر خوارگی میں مرتے دیکھا تھا۔ پدری شفقت و محبت میں سے زیادہ حصہ آپؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید کو دیا تھا۔ وہ بھی اپنے چھوٹے چچا زاد علی ابن ابی طالب سے بہت محبت کرتے تھے جو کسی وقت ان کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن انہیں بلا شبہ یہ احساس ہو گیا تھا کہ حضرت علیؓ میں ایک کامیاب سیاستدان بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ کچھ عرصے تک آپ کی ایک نواسی امامہ آپ کی چہیتی تھیں۔ آپ نماز کے دوران بھی اُسے اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھتے تھے اور جب آپ جھکتے یا سجدے میں جاتے تو اسے اتار دیتے اور دوبارہ اٹھا لیتے۔ ایک موقعہ پر آپ نے اپنی بیویوں کو ایک ہار دکھا کر یہ کہہ کر پریشان کیا تھا کہ آپ یہ ہار اسے دیں گے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ جب آپؐ نے دیکھا کہ وہ کافی برہم نظر آ رہی ہیں تو آپؐ نے ان میں سے کسی کو یہ ہار دینے کی بجائے امامہ کو دے دیا تھا۔

آپؐ بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے اور بچوں میں سے بہت سے ان کے دوست تھے۔ ان بچوں کے ساتھ آپؐ کا مذاق رہتا تھا جو حبشہ سے واپس آئے تھے اور حبشہ کی زبان بولتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے ایک گھر میں ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کے ساتھ آپؐ ہنسی مذاق کر لیتے تھے۔ ایک روز حضور ﷺ نے دیکھا کہ وہ لڑکا بہت افسردہ اور مغموم نظر آ رہا ہے، آپؐ نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ اس کا پالتو بلبل مر گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے

Marfat.com

اس لڑکے کی پوری پوری دلجوئی فرمائی۔

آپؐ جانوروں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے جو محمد ﷺ کی صدی کی قابل ذکر بات تھی اور آج دنیا بھر کا حصہ بن گئی ہے۔ آپؐ کی فوج مکہ مکرمہ کی جانب بڑھ رہی تھی، فتح سے کچھ دیر پہلے سپاہی ایک کتیا کے پاس سے گزرے جس کے ساتھ اس کے بچے تھے۔ حضور ﷺ نے نہ صرف یہ حکم دیا کہ اس کتیا اور اس کے بچوں کو نہ چھیڑا جائے بلکہ ایک آدمی وہاں پہرہ پر بٹھا دیا کہ آپؐ کے احکامات کی تعمیل ہوتی دیکھ سکے۔

محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے بارے میں یہ ضمنی باتیں ہیں اور عام لوگوں کے ساتھ آپؐ کا جو حسن سلوک تھا اس سے آپؐ کی تصویر ابھرتی ہے۔ آپؐ مذہبی نقطہ نظر سے ایسے کام کرتے جن سے آپؐ کو لوگوں کی طرف سے عزت و احترام اور اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ میں اور صفات بھی تھیں، ہمت و حوصلہ، ثابت قدمی، غیر جانبداری اور ارادے کی وہ پختگی جو تندی و درشتی کی جانب مائل تھی مگر جسے آپ کی فیاضی و فراخ دلی معتدل بنا دیتی تھی۔ ان سب کے علاوہ آنحضرت ﷺ میں عادات و اطوار کی ایسی دلکشی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے انہیں لوگوں کی محبت، احترام اور جاں نثاری حاصل تھی۔ (۲۹)

لیکن یہ کہنا مشکل ہوگا کہ محمد ﷺ کی جو مجموعی شبیہ حدیث اور سیرت لٹریچر سے ابھرتی ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی اس تصویر سے زیادہ دلکش ہے جو اناجیل میں پیش کی گئی ہے۔ بے شک اللہ کی سچی تلاش دو شخصیات کے باہمی تقابل کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیئے اس لئے کہ انہیں تاریخی طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جو واقعات میں نے اوپر بیان کئے ہیں وہ ساتھ نہیں دیتے کیونکہ اس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ ان کا دفاع کرنے والے مسلمانوں نے انہیں درست ثابت کرنے اور ان کی تشریح و توضیح کیلئے کافی کوشش کی ہے۔ (۳۰) جیسا کہ ان لوگوں نے کیا تھا جنہوں نے مستشرق ولیم میور کی کتاب ''دی لائف آف محمد ﷺ'' (۳۱) کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہی کتاب ہے جس میں مصنف کے تمدنی اور مذہبی تعصبات بہت واضح طور پر سامنے آئے تھے۔

مسلم مصنفین کے دفاع نے بہت سے جائز اعتراضات کو جنم دیا اور کئی برس تک مغربی مصنفین کو ابتدائی مستشرقین کے کام کا اور نبی ﷺ کی حیات طیبہ کا از سر نو جائزہ لینے کی ترغیب

دی۔ انہوں نے یہ بات پیش کرنے کی کوشش کی کہ مستشرقین نے مسلم سکالرز کے اس کام پر زیادہ انحصار کیا جو غیر مستند سمجھا جاتا تھا۔ اور جو کچھ انہوں نے پیش کیا تھا اس میں بنیادی حقائق اور قابل توجہ تاریخی امور کو جگہ ہی نہیں دی گئی تھی اوپر ایک مثال دی جا چکی ہے، جس پر ہم نیچے ایک اور تناظر میں بحث کریں گے (۳۲)۔ اور یہ معاملہ ہے ان چھ اشخاص کے مبینہ قتل کا، جس میں آنحضرت ﷺ نے (ان کی لگائی گئی تہمت کے مطابق) ان افراد کو ہمیشہ کیلئے اپنے راستے سے ہٹانے کا حکم دیا تھا جنہوں نے اپنی شاعری میں آپؐ کے خلاف لکھا تھا۔ اس کے خلاف محمد علی یہ دلیل دیتے ہیں کہ چار بیانات ایسے ہیں جو ان روایات پر مشتمل ہیں جنہیں مسلم علماء یا تو ضعیف سمجھتے ہیں یا من گھڑت اور بقیہ دو بیانات وہ ہیں جن میں جنگ کے دوران مدینہ کی ریاست کے دو اراکین پر غداری کا الزام لگایا گیا تھا۔ (۳۳)

ایسی مثالوں کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا دفاع کرنے والے مسلمانوں نے یہ دلیل پیش کی کہ ابتدائی مستشرقین نے اسلامی ماخذ سے غلط فائدہ اٹھایا تھا، یہ جس قدر بھی کمزور یا ضعیف روایات تھیں، یہ ان کے مقاصد کیلئے مناسب تھیں اور جن معلومات کو مسلمان مستند سمجھتے تھے، انہوں نے ان کو اس لئے نظر انداز کر دیا تھا کہ یہ تو مستشرقین کے نقطہ نظر کے خلاف جاتی تھیں۔ اس رویے نے بہت سے مسلمانوں کو یوں سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مستشرقین دشمنان اسلام ہیں۔ زیادہ جدید مستشرق سکالرز نے کوشش کی ہے کہ واقعیت پسندی کا رویہ اپنا لیں مگر مسلمان پھر بھی اسلامیان مغرب کی کتابوں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ماخذ کی صداقت کے مسئلے سے ہٹ کر ایک اور مسئلہ تاریخی اور تمدنی و ثقافتی تناظر کا ہے:
ایک وقت میں ایک خاص بات جو ناقابل قبول ہے وہی ایک دوسرے مقام پر نہ صرف پوری طرح جائز ہے بلکہ مطلوب ہے اور اس کی تمنا و آرزو کی جاتی ہے۔ ہماری نظر میں ایک مقتول سردار کی بیٹی سے آنحضرت ﷺ کا شادی کیلئے خواہش کا اظہار ذہن میں آنے والی بات نہیں مگر ایسے عہد میں جب قبائل کے درمیان جھڑپیں، جیسا کہ واٹ ان کے بارے میں لکھتا ہے (۳۴) ''صحرائی زندگی کا عام جزو تھیں۔'' اور اسے عرب ایک تفریح اور دل بہلاوے کا سامان تصور کرتے تھے، آنحضرت ﷺ ایسا نہ کرتے تو یہ بہادری و جانبازی کی روایت کے برعکس ہوتا اور یہ قابل عزت و افتخار بات نہ تھی پھر یہ کہ عرب میں یہ رسم بھی پائی جاتی تھی۔ کہ دوسرے قبیلے

Marfat.com

کے ساتھ اتحاد اور امن کے مراسم بھی استوار کیے جاتے تھے۔ اس معاملے پر گولڈ زیہر نے کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ (۳۵) وہ اسلامی عہد سے پہلے کی شاعری کے گہرے مطالعے کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ساتویں صدی کے عرب اپنے دشمن کو معاف کر دینے کو ایک قبیلے کی جواب دہی سمجھتے تھے اور اس کا مطلب تھا دشمن کو مستقبل کے حملوں کی دعوت دینا اور سب سے زیادہ عزت اس سردار کی ہوتی تھی جو بدلہ لینے اور ترکی بہ ترکی جواب دینے میں سب سے زیادہ تیزی دکھاتا تھا۔ شروع کے دو موقعوں پر نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کی غداری پر صرف مدینہ سے انہیں نکال دینے تک کی سزا پر رضامندی ظاہر فرمائی مگر غزوۂ خندق کے دوران جب بنو قریظہ کی عہد شکنی سے مدینہ کی ریاست کا وجود تک خطرے میں پڑ گیا تو آپؐ نے یہ اجازت دے دی تھی کہ عہد شکنی اور غداری کرنے والوں کے مرد سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اسی کتاب میں گولڈ زیہر قبل از اسلام کے قبائلی شعراء پر طویل اور سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ (۳۶) وہ اس نمایاں کردار کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان شعراء نے جنگ کے زمانے میں ادا کیا۔ اور یہ کہ کس طرح ایک تجربہ کار شاعر بہت سے تجربہ کار سپاہیوں پر بھاری ہوتا تھا۔ اس تفصیل سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ مذکورہ شعراء کس طرح ابتدائی دور کے مسلمانوں کیلئے ایک خطرہ بن گئے تھے اور اس معاملے میں محمد علی کا پیش کردہ استدلال بھی اس حقیقت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔

امریکہ میں ہم غلامی کے دستور کو نہایت گھٹیا اور قابل نفرت سمجھتے ہیں جبکہ مسلمان قانون دانوں نے قرآن اور احادیث نبوی کی بنیاد پر ایسے قوانین نافذ کرنا چاہے جو غلاموں کے ساتھ عدل و انصاف اور رحم دلی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتے تھے۔ قرآن میں کئی مقامات پر غلاموں کو آزاد کر دینے کی ہدایت کی گئی ہے یہاں تک کہ ان کو خرید کر آزاد کرنے کیلئے لوگوں سے فنڈ زاکٹھا کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ مگر یہ غلامی کے دستور کو سرے سے ممنوع قرار نہیں دیتا، اس لئے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ نرم دلی کے سلوک کیلئے یہ ادارہ ضروری تھا۔ (۳۷)۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قرآن پاک میں آتا ہے کہ مخصوص حالات میں ایک مرد بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ جدید دور میں اس قسم کے ادارے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ عورت کو اپنا غلام اور محکوم بنا کر رکھا جائے۔ سترہویں صدی میں عرب میں مخصوص قسم کی

Marfat.com

ضروریات تھیں جنہیں پورا کیا جانا تھا: مختلف قبائل کے درمیان مسلسل جنگ و جدل کے باعث لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کی شرح اموات زیادہ تھی اور مرد نسبتاً خطرات میں زیادہ گھرے ہوئے تھے، معاشرے میں عورتیں مردوں کی نسبت تعداد میں زیادہ تھیں۔ عدم توازن سے نمٹنے کیلئے ایک سے زیادہ شادیاں وقت کی ضرورت تھی اور اسی طرح ایک قبیلے کی عورتوں کو تحفظ بھی دیا جاسکتا تھا اور زندگی گزارنے کا وسیلہ بھی مہیا کیا جاسکتا تھا۔ (۳۸)

آخر میں یہ یاد رہنا چاہئے کہ قرآن کا پیغام بڑا جامع ہے اور یہ صرف نازل ہی نہیں ہوا تھا: یہ آنحضرت ﷺ اور ابتدائی مسلمانوں کی عملی زندگی کے ذریعے مشکلات سمیت کر کے دکھایا گیا تھا۔ اس نے تکلیفوں اور پریشانیوں کے معانی سکھائے، ظلم و تعدی میں عفو و درگزر اور معاف کردینے اور صبر کی ضرورت بتائی۔ ہجرت مکّہ سے پہلے مسلم امہ نے اس سبق کا نہایت تاریخی پرجوش جواب دیا۔ اس عرصے میں نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام کو ان لوگوں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا جو اسلام سے متاثر نہیں ہوئے تھے اس لئے کہ قدرتی طور پر ہماری ہمدردی مظلوموں کے ساتھ اور ستائے ہوئے انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے غالب و فاتح کی نسبت چوٹ کھایا ہوا یا کسی کی زیادتی اور ظلم کا شکار ہونا زیادہ آسان ہے۔ بارہا ہمیں اپنے آپ کو یا دوسروں کو بچانے کیلئے اپنے عہد کے فرعونوں اور قریش سے جو دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق دینے سے انکار کر دیتے ہیں جنگ کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی ہم یہ جنگ جیت جاتے ہیں اور غلبہ حاصل کر لیتے ہیں اور اسی لئے اسلام ہماری زندگی کے اس حصے کو بھی یکساں اہمیت دیتا ہے یہ قانون، عدل و انصاف اور سزا سے لڑتے وقت ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ان معاملات میں رومانوی دلکشی کم سہی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بھی کم از کم اتنی ہی اہم ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے مشن میں یہ بات شامل تھی کہ وہ دونوں زندگیاں گزاریں اور مسلمانوں کیلئے تو اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں کہ پوری تاریخ انسانیت میں ایسی مثال اور کوئی نہیں ملتی۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کو بہت جذباتی انداز سے لیتی ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق کلمۂ شہادت کے دوسرے نصف حصے میں کئے گئے ان کے عہد و پیمان سے ہے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرنا کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں، اس کا مطلب یہ ہے

کہ کوئی مرد یا عورت آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کو اپنے لئے مثال بنا لینے کی کسوٹی سمجھتے ہیں اور یہ اس بات کی بھی تصدیق کرنے کے مترادف ہے کہ وقت اور جگہ کے امتیاز کے بغیر حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ دنیا بھر کے انسانوں کیلئے ایک معیار اور نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر مسلمان مغربی تہذیب وتمدن کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک بہتر راستہ مہیا کرتا ہے تو انہیں یا آنحضرت ﷺ کی مثال سے اپنی وابستگی کو نرم کرنا ہوگا اور اس کی شدت میں کمی کرنی ہوگی یا پھر زیادہ وقت دے کر اور کوشش کے ذریعے اس معاملے کو دلائل کے ساتھ قابل یقین بنانا ہوگا۔ پہلی صورت کا مطلب تو خودکشی کی کوشش ہوگی اور دوسری صورت مخلصانہ، سخت اور تنقیدی علم وفضل کا تقاضا کرتی ہے۔

روایات اور مغربی تنقید

جب بات تاریخی استناد تک پہنچتی ہے تو مستشرقین اور مسلم سکالرز اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ قرآن میں جو باتیں آنحضرت ﷺ نے ایسی فرمائیں جو الہام کی صورت میں نازل ہوتی تھیں وہ مستند ہیں۔ قرآن کے حوالے سے گب لکھتا ہے کہ ''یہ بات اب ثابت ہوچکی ہے کہ قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے اصل ارشادات پوری صداقت اور احتیاط کے ساتھ بلاکم وکاست محفوظ کر لئے گئے تھے'' (۳۹)

کئی برس تک مستشرقین نے حدیث کے ارتقاء کے بارے میں مسلمانوں کی روایت اور بیان کو قبول کئے رکھا۔ اس وقت تک علم حدیث کا مطالعہ نہایت تحقیق طلب تھا جب تک آنحضرت ﷺ بقید حیات تھے۔ پھر اس میں جعلسازی شروع ہوئی اور اسناد کا طریقہ واضح ہوا اور اس مسئلے سے نمٹنے کیلئے آپ ﷺ کی وفات کے چند ہی دہائیوں کے اندر اندر اسناد کو دستوری شکل دے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مستشرقین اس بات کو بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار تھے کہ یہ دستور یا ضابطہ تو بعد کے برسوں میں معرض وجود میں آیا مگر بنیادی طور پر اس میں ردوبدل کوئی نہیں ہوا (۴۰) اگر اس نقطہ نظر کو سامنے رکھا جائے تو میور کی اس رائے کو درست ماننا پڑتا ہے کہ پہلی اسلامی صدی کے دوران احادیث میں جعل سازی شروع ہوئی۔ (۴۱)

Marfat.com

گولڈن زیہر اپنی عہد آفرین تصنیف میں علم حدیث کے کلاسیکی بیان کو اور تمام جمع شدہ احادیث کی صداقت کو چیلنج کرتا ہے جن مین مستند احادیث بھی شامل ہیں (۴۲) حالانکہ ان میں کچھ مستثنیٰ بھی ہیں۔ اس موضوع پر اس کے پیش کردہ نتائج کو بعد کے مغربی مطالعہ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ ادبی اور تاریخی تحقیق نے جدید تنقیدی طریقوں کے مغربی سکالرز کو اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ

(الف) تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصے تک زیادہ تر حدیث لٹریچر زبانی کلامی منتقل ہوتا رہا اور جو احادیث کے مجموعے ہم تک پہنچے ہیں وہ حدیث کے کسی ایسے ریکارڈ کی جانب اشارہ نہیں کرتے جو ابتدائی عہد میں تیار کیا گیا ہو۔

(ب) ابتدائی مجموعوں میں یا اسلامی قانون کی کتابوں میں احادیث کی تعداد کے مقابلے میں بعد کے مرتب شدہ مجموعوں میں احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

(ج) کم عمر صحابہ کرامؓ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد معمر صحابہ کرامؓ کی بیان کردہ احادیث کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، جن کے بارے میں مغربی سکالرز کا خیال ہے کہ ان کے اسناد قابل اعتماد نہیں۔

(د) پہلی اسلامی صدی کے خاتمے پر اسناد کا نظام بلا سوچے سمجھے علم حدیث کے ساتھ چسپاں کردیا گیا تھا۔ اس لئے یہ جس روایت کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے یہ اس کی سچائی ثابت نہیں کرتا۔

(ہ) بہت سی احادیث ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔

(و) حدیث کے متن اور اسناد کے بارے میں کافی بڑے پیمانے پر جعل سازی کا ثبوت ملتا ہے۔

(ر) مسلم نقادوں نے حدیث کی تنقید میں اسے صرف اسناد تک محدود رکھا اور اس کے متن پر کبھی تنقید نہیں کی۔ (۴۳)

یہ اور ایسے ہی دوسرے انتقاد کی جانب مسلم اور مغربی سکالرز نے توجہ دی ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی گئی کتابوں میں عظمی، ایبٹ، صدیقی اور عبدالغفار کی تصانیف شامل ہیں۔ (۴۴) ان میں سے کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا دفاع بڑے قدرتی طریقے سے ہوسکتا ہے۔ مثلاً

(ب) کی احادیث کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کی روش سے منسوب کیا جا سکتا ہے: حدیث کا اصل ماخذ اسے اپنے معاصرین کو بتاتا ہے جو آئندہ نسل کے نوجوان سننے والوں تک اسے منتقل کرتا ہے اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ صحابہ کرامؓ جو آنحضرت ﷺ کے بعد زیادہ عرصے تک زندہ رہے انہیں نبیؐ کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کرنی چاہئیں تھیں بجائے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے جو آپؐ کے بعد جلد اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ پس (ج) چونکہ حدیث میں نبیؐ کے ۲۳ سالہ دور نبوت کا ریکارڈ شامل ہوتا ہے اور یہ کئی عبوری ورد دیکھ چکا ہوتا ہے اور چونکہ آپؐ کا واسطہ مختلف قسم کی شخصیات اور مسائل سے رہتا تھا اس لئے یہ کوئی خلاف عادت بات تصور نہ ہوگی اگر آپؐ کے رویے میں کوئی فرق نظر آئے۔ چنانچہ ایبٹ اور عظمی دونوں نے ''الف'' اور ''ذ'' سے متعلق پورے یقین کے ساتھ بحث کی ہے اور مسلمان راوی اس بات سے واقف تھے کہ ''الف'' چودہ سو سال تک، ان کی محبت و جانفشانی کے پس پردہ یہی سبب کارفرما تھا۔ (۴۵) حالانکہ مسلمان سکالرز نے اسناد پر زیادہ زور دیا، صدیقی اور عبدالغفار (۴۶) دستاویزی شہادت پیش کرتے ہیں کہ (ز) بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر عبدالغفار بتاتے ہیں کہ ابتدائی دور کے راوی کسی رپورٹ کو اکثر اس لئے رد کر دیتے تھے کہ راوی کے کچھ ذاتی مفادات تھے جو روایت کے متن سے ثابت ہوتے تھے۔ ایسی احادیث میں اسناد اور متن دونوں پر غور کیا جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت ان امدادی طریقوں سے اسناد کی جانچ پرکھ کرنا جو مسلم راویوں نے ایجاد کئے تھے، آج بھی کسی روایت کی صداقت کی معروضی پرکھ اور آزمائش ہوگی کیونکہ کوئی متن کو کس طرح پرکھتا ہے یہ ذاتی رغبت یا التفات تشریح اور تناظر پر منحصر ہوتا ہے۔ (ساتویں صدی کے سائنس کے طالب علم کی نسبت بیسویں صدی کا طالب علم معجزات اور پیش گوئیوں کو زیادہ شک کی نظر سے دیکھ سکتا ہے)۔ بات قابل توجہ ہے کہ اس دور میں حدیث پر کی جانے والی مغربی تنقید کا زیادہ حصہ اسناد سے متعلق ہوتا تھا۔

بہت سے اہم مسائل جن پر دونوں طرف مزید غور و فکر کی ضرورت ہے اس مختصر خلاصے سے مبہم اور غیر واضح ہو جاتے ہیں۔ مستشرقین حدیث لٹریچر کے مکمل طور پر ناقابل اعتبار ہونے کے خیال سے اکثر اس حد تک چمٹے ہوتے ہیں کہ اس کی تردید کرنے والی شہادت اور ثبوت کی

طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور یوں اس موضوع پر زیادہ قدرتی اور قابل قبول تشریحات وتصریحات پر بھی توجہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ ایک نمایاں رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ تمام متنازعہ معلومات پر ''غیر مستند'' کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور اس کی وضاحت شاید اس لئے ضروری نہیں سمجھی جاتی کہ یہ ان کے نظریات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ مسلم سکالرز کے کام کو مکمل طور پر کم تر قرار دینے کیلئے تقریباً ان تمام مسلمانوں کو جو روایات کے مطالعہ سے وابستہ ہیں اس میں ملوث کر لیا جاتا ہے اور یہ وہ تاثر ہے جو گولڈ زیہر نے دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ شاخت نے (۴۷)۔ ایسے نظریات مسلمانوں کیلئے تقریباً ناقابل قبول ہوتے ہیں اس لئے کہ مذہب سے متعلق یہ ایک ایسے رویے کو ظاہر کر دیتے ہیں جس نے ابھی تک مسلم ذہن کو زہر آلود نہیں کیا۔

کئی ''ماہرین'' جو حدیث کی صداقت اور استناد کا فیصلہ کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں، یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ درج ذیل کسوٹی مقرر کر سکتے ہیں کہ سکالرز کے تیرہ سو صدیوں پر پھیلے ہوئے کام کو یکسر نظر انداز کر دیں۔ اول تو یہ کہ اگر کسی حدیث کی تشریح وتصریح کسی مخصوص گروپ یا مدرسہ فکر کے لوگوں کے حق میں کی جاسکتی ہے تو ایسی حدیث میں زیادہ امکان ہے کہ ضرور من گھڑت مواد شامل کر دیا گیا ہوگا۔ اگر اس میں ان ظاہر پرستوں کے لئے دلیل وحجت دی گئی ہو جو روحانیت سے معاندانہ رویہ رکھتے ہیں تو ضرور ان ظاہر پرستوں نے اسے گھڑ لیا ہوگا۔ ثانیاً اس کا اسناد جس قدر مکمل ہوگا اسی قدر اس بات کا امکان موجود ہے کہ یہ نادرست اور غیر صحیح ہے ان کے خیال میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثبوت کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ اس قسم کے دلائل یقیناً طاغوتی اور ابلیسی ہیں کیونکہ اگر ان کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ہم اس استدلال تک پہنچتے ہیں: اگر آپ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں لاتے تو یہ اس لئے ہوگا کہ آپ غلط ہیں اور اگر آپ ثبوت لے آتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی آپ کو ضرورت ہے اور یوں ایک بار پھر آپ غلط ہیں۔ ان مستشرقین کو کیسے یقین دلایا جائے کہ بے شمار صاحبان علم وفضل مسلمان، وہ انسان جو اللہ کا خوف دلوں میں رکھتے تھے اور جو جہنم کے عذاب سے بھی خوفزدہ رہتے تھے؟ کیا ایسے انسان جان بوجھ کر احادیث نبوی میں جعل سازی کر سکتے تھے؟ اس سے غور وفکر کرنے والا انسان اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ عقیدے کی خرابی دنیا کی سب سے زیادہ قدرتی بات ہے، اگر یہ اتنے بڑے ''ماہرین'' نہ ہوتے تو یہ نفسیاتی تضادات

Marfat.com

کیلئے کوئی جذبہ واحساس نہ رکھتے۔(۴۸)

گب اسی انداز سے لکھتے ہوئے، مگر کچھ کم جذباتی ہوکر، اس مشکل پر اپنی نظریں مرکوز کردیتا ہے کہ کم ازکم ابتدائی چند نسلوں کے بعد من گھڑت روایات کیسے منتقل ہوتی تھیں: مغربی سکالرز کے لئے تنقید حدیث کی تکنیک جس میں استناد کی ایک طویل زنجیر کو پرکھا جاتا ہے اس سے کچھ شدید نقائص سامنے آتے ہیں۔ عام سی تنقید تو یہ کی جاتی ہے کہ استناد میں جعل سازی کرنے والوں کیلئے یہ بھی اتنا ہی آسان ہوتا ہے کہ وہ من گھڑت متن بناڈالیں۔ مگر اس میں اس مشکل کو سامنے نہیں رکھا جاتا جو جعل سازی کے لئے اسناد کے قابل قبول بنانے میں پیش آتی ہے (جہاں اس کا اپنا نام آخر میں دیا جاتا ہے) اور جسے دیانتدارانہ اور اچھی شہرت کے مالک سکالرز دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ اور یہ کہ روایات کے مسلمان نقاد عام طور پر دیانتدار اور متقی و پرہیز گار افراد ہوتے تھے، بے شک کچھ لوگوں نے اس کے برعکس بھی اپنے دعوے کو زبردستی منوانے کی کوشش کی ہوگی۔ ایک اور بنیادی بات تنقید کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ اسناد کی تکنیک تو دوسری صدی میں پوری تشریح وتصریح کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ (اور اس بیان کے بعد کچھ آگے چل کر اپنی بات کو وہ اس طرح ختم کرتا ہے)......ابتدائی روایات کے بارے میں فیصلے یا کسوٹی ومعیار، میں سے جس کو بھی ان کے طریقے کا نقص بتایا جائے کم ازکم یوں لگتا ہے جیسے اس کو پہلی صدی کی ان روایات میں سے نکال دیا گیا ہے جن کی بنیاد پروپیگنڈے پر تھی اور دوسری صدی کی وہ تمام روایات جو اہل تشیع کے اصولوں اور نظریات کی حمایت کرتی تھیں یا بنو عباس کے دعوے یا ایسی روایات جن میں مہدی کی آمد کی پیش گوئی کی گئی تھی۔(۴۹)

اصولی مسئلوں یا نظریات کو اکثر انتہائی درجے پر تشکیل دیا جاتا ہے اور پھر مخصوص تعصبات کے ذریعے انہیں متحرک کیا جاتا ہے۔ ایک محقق جو اپنی تحقیق کی بنیاد پر چند شکوک و شبہات پر رکھتا ہے اس ممکنہ مضبوط ترین قیاس سے آغاز کرتا ہے کہ ثبوت وشہادت کے اجزاء پہلے اجازت دیتے ہیں اور پھر اسے اپنے ہم مرتبہ لوگوں اور ماہرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جہاں یا تو یہ رد ہوجاتے ہیں یا انہیں تراش خراش سے ہموار کرکے سچ کے قریب لے آتے ہیں۔ اور مزید تحقیق نئے نئے نکات پیش کرتی ہے غالباً اس کا یہی طریقہ کار ہوگا۔ ابتدائی دریافت میں قدرتی طور پر کچھ کمی بھی رہ جاتی ہوگی کیونکہ اہم اور قابل توجہ مشاہدات سامنے آتے ہوں گے

Marfat.com

اوران روایات کی تشکیل میں ایسی باتیں ہوتی ہوں گی جن کے بارے میں ہمیں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ حدیث لٹریچر کی صداقت پر دور حاضر کے مسلم سکالرز کی بحث وتمحیص کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جنبل نے اپنی بعد کی تحقیق میں یہ دریافت کیا کہ اس موضوع پر مسلم اور مغربی سکالرز کے درمیان ایک وسطی مقام بنتا ہے۔ (۵۰) وہ گولڈ زیہر اور شاخت کے ان مباحث سے بھی چند اقتباسات لے کر اپنی تحریر میں شامل کر لیتا ہے جنہیں اس کی اپنی تحقیق کی حمایت حاصل ہے۔ پھر اس میں چند نئی دریافت شدہ باتیں بھی شامل کر لیتا ہے۔ جنبل کی پیشکش بہت مفصل، جامع اور مدلل و دلنشین ہوتی ہے وہ مسلم ماہرین کی اس شکایت کی جانب رخ کرتا ہے کہ مغربی نظریات کی بنیاد احادیث کے مطالعہ کے دوران اس حدیث لٹریچر پر ہے جسے صدیوں پہلے مسلم سکالرز نے جعلی قرار دے دیا تھا۔ (۵۱) جنبل اپنے نظریات پیش کرتے وقت پوری طرح ''مستند'' روایات پر انحصار کرتا ہے۔ وہ جن نتائج پر پہنچتا ہے اس کا خلاصہ نیچے پیش کیا جارہا ہے (۱) پہلی تین اسلامی صدیوں کے دوران بڑے قانونی مراکز میں ابتدائی ججوں (قاضیوں) کے کردار کا گہرا جائزہ لینے کے بعد جنبل، گولڈ زیہر اور شاخت کے ان بیانات سے اتفاق کرتا ہے کہ پہلی اسلامی صدی کے دوران، قانونی معاملات کے فیصلے، خواہ وہ حکمران کرتے تھے یا مسلم قانون دان (فقیہہ، مفتی) ان کی بنیاد آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کی اصل روح کی روشنی پر ہوتی تھی نہ کہ آپؐ کے کاموں کو باریکی کے ساتھ نقل کے ذریعے۔ اس عہد میں کسی واضح پیغمبرانہ نظیر کی ضرورت نہ تو عام طور پر محسوس کی جاتی تھی نہ اس کی تلاش ہوتی تھی۔ وہ اس بہتان کے خلاف بھی پوری قوت کے ساتھ دلائل دیتا ہے کہ دوسری صدی کے جج یا قاضی اپنی ضرورت کے مطابق روایات میں ردوبدل کر لینے کے خوگر ہوتے تھے۔ (۵۲)

(۲) شاخت کے اس دعویٰ کے حق میں بھی دلائل دیتا ہے کہ ''اسناد میں ایک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ الٹے رخ، پیچھے کے زمانے کی طرف پھیلتی ہیں'' جس کا مطلب یہ ہے کہ قانونی فیصلے ضابطے اور مسلمہ اصول جنہیں پہلے فقیہان ومفتیان طے کرتے تھے بعد میں انہیں مکمل اسناد کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ وہ مثال کے طور پر سعید بن المسیب (۹۴ق۔م) کی قانونی آراء پیش کرتے ہیں وہ بتاتا ہے کہ بہت سی روایات جو بعد کے مجموعوں میں اسناد کے ساتھ شامل تھیں اور جن میں اس شخص کا نام آتا تھا، دوسرے ماخذ میں بھی موجود

Marfat.com

ہیں اور اس کی اپنی روایات کے طور پر موجود ہیں اور جن لوگوں سے ان کا سلسلہ جوڑا گیا ہے وہ عمر میں اس سے بڑے نہیں۔ مسلم سکالرز اس قسم کے اظہار کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ المسیب کی آراء کی بنیاد ان سابقہ مثالوں پر ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ نے یا آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے قائم کیں اور اس کی حمایت میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ بہت اعلیٰ قسم کی ایسی آزاد اسناد موجود ہیں جنہیں نبی کریم ﷺ سے منسوب کیا جا سکتا ہے اور ان میں المسیب کا نام کہیں بھی نہیں آتا۔ اگر اس دلیل کو مان لیا جائے کہ المسیب کی رائے کو پیچھے لے جا کر آنحضرت ﷺ کے ساتھ منسوب کر دیا گیا تھا تو دوسری تمام سلسلہ وار کڑیوں میں شامل ان ناموں تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے جو روایات کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرتے رہے اور جو قانون کے متحارب مراکز سے تعلق رکھتے تھے اور جو ساز باز کر کے کسی غلط اور نادرست روایت کو آنحضرت ﷺ سے منسوب کر دیتے تھے ان مجرموں تک رسائی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس اہم سوال کی طرف توجہ دیئے بغیر جنبل جواباً لکھتا ہے:

اس بات کا سبب جاننے کے لیے کہ اس قانونی فیصلے پر کیوں غور کیا جائے، انہیں کیوں اہمیت دی جائے، سب سے پہلے سعید کی اپنی عدل گسترانہ بصیرت کو لیتے ہیں بجائے اس کے کہ ماضی کی کسی مثال کو تلاش کیا جائے، ان کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ بہر طور سعید کے فیصلوں کے طور پر ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ایک قانونی فیصلہ جسے ماضی میں آنحضرت ﷺ سے یا آپ کے کسی صحابی سے جا کر منسوب کر دیا جاتا ہے اسے سعید کی زبانی کہلوانے کی ضرورت نہیں رہتی، اس لئے کہ یہ بھی مؤخرالذکر کر کے استدلال کی پیداوار بنتی ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں جن میں قانونی آراء دینے کی نیک نامی کا مستحق سعید ٹھہرتا ہے صرف ایک ہی نتیجے تک ہمیں لے جاتی ہیں۔ اس نے اس مسئلے کے بارے میں سب سے پہلے اس طرح سوچا، اس سے پہلے کہ اس فیصلے کو ایک ایسی روایت میں ڈھالا گیا جسے ان مستند حضرات سے منسوب کیا گیا جو سعید سے پہلے گزرے تھے۔ اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ کس نے سعید کو محض اپنے پیش رووں کی قانونی رائے کو دہرانے پر نیک نامی کا مستحق ٹھہرایا، خواہ وہ پیش رو آنحضرت ﷺ ہوں یا آپؐ کے کوئی ایک صحابی۔ (۵۴)

جنبل اس بات کا ذکر بھی کرتا ہے کہ ابتدائی اسماء الرجال میں بھی بہت سے حوالے ایسے

ہیں جن میں کسی صحابی یا جانشین کے کسی قول کو بڑھا چڑھا کر اسے حدیث نبوی کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ ایسی باتوں کا مسلم ماہرین کو علم تھا۔ جنبل اس سلسلے میں اسماء الرجال میں شامل درجنوں دوسرے افراد کے علاوہ بہت سے مرسلین کی فہرست پیش کرتا ہے جو احادیث کے مستند مجموعوں میں آتی ہیں۔ (۵۴)

(۳) اس کے خیال میں اکثر احادیث کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے راوی انس ابن مالک ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً دو ہزار تین سو ہوگی جو مشکوک سمجھی جاتی ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اگر ان احادیث کا جن کی ابتداء مدینہ طیبہ سے ہوئی، ان احادیث کے ساتھ تقابل کیا جائے جن کا منبع بغداد تھا تو ان دونوں کی نوعیت کافی جدا جدا نظر آئے گی۔ ہم یہ توقع کریں گے کہ اس قدر قابل احترام اور کثرت نگار شخصیت جب دونوں مراکز تک سفر کرے گی تو ایک ہی جیسی رپورٹیں بیان کرے گی مگر جنبل نے دیکھا کہ دونوں مراکز سے جمع کی گئیں احادیث میں سے ایک نے دوسری کو معمولی سا ڈھانپ لیا ہے لیکن جنبل کو معلوم ہوا کہ ان دو مراکز میں اس کے نام سے جن روایات کو بیان کیا گیا ہے ان سے ایک مرکز کی روایات نے دوسرے مرکز کی روایات کو معمولی سا ڈھانپ لیا ہے۔ جنبل یہی استدلال ان احادیث کی تنقید میں استعمال کرتا ہے جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ (۵۵)

(۴) جنبل کی رائے میں ایک طریقہ جس نے من گھڑت احادیث وضع کرنے والوں کو نہایت جامع اسناد مہیا کرنے میں مدد دی وہ ''وقت کا دھوکہ'' کہلاتا ہے یا یوں کہئے کہ اسناد کو زیادہ صداقت بخشنے کی غرض سے احادیث منتقل کرنے والوں کو ناقابل یقین حد تک دور کے زمانے سے منسوب کردیں۔ مثال کے طور پر اس کا استعمال اس وقت کیا جاتا تھا جب یکے بعد دیگرے کسی اسناد میں احادیث منتقل کرنے والے دو افراد میں سو سال کا وقفہ تھا۔ ظاہراً یہ تضاد یہ بات نوٹ کر کے درست کیا جاسکتا تھا کہ ان میں زیادہ عمر رسیدہ شخص زیادہ لمبی مدت تک زندہ رہا۔ اس کے خیال میں اس تکنیک کو احادیث منتقل کرنے والے بعض اشخاص کا درجہ بلند کر کے انہیں ''صحابہ کرامؓ'' کے درجے تک لے جانے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یوں انہیں اور ان کی روایات کو زیادہ مستند بنا دیا جاتا تھا۔ جنبل لکھتا ہے کہ درج ذیل جانشینوں نے جو زیادہ

Marfat.com

اہم مرسلین نہیں تھے ناقابل یقین حد تک لمبی عمریں پائیں۔قیس بن ابی حزم (۸۴۔۹۸/ ۷۰۳۔۱۶ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی) زیاد بن علاقہ نے (وفات ۱۳۵/ ۷۵۲، تقریباً سو سال عمر پائی۔ایک اور روایت کے مطابق یہ دور جاہلیہ میں پیدا ہوا تھا) ابو امر سعد بن الیاس (وفات ۹۵۔۹۸/ ۷۱۴۔۷۱۷ ایک سو بیس سال کی عمر پائی) بن سوید (جب العماش نے اسے دیکھا تو اس کے خیال میں وہ ایک سو بیس سال کا تھا) سوید بن غفالہ (وفات ۸۰۔۸۲/ ۶۹۹۔۷۰۱ ایک سو بیس اور ایک سو تیس سال کی عمر پائی، اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی عمر نبی ﷺ کے برابر تھی) ضر بن جیش (وفات ۸۱۔۸۳/ ۷۰۰۔۷۰۲ ایک سو ستائیس برس کی عمر پائی) وغیرہ وغیرہ۔وہ تراجم (سوانح عمریوں کے) جو سو یا سو سال سے زائد عمریں پانے والوں کی سوانح عمریوں کے کیے گئے ہیں ان میں مجموعی طور پر ان کی بیان کردہ عمروں پر شک کا سایہ تک نہیں پڑتا۔اس سے اسناد میں من گھڑت مواد شامل کرنے میں ضرور کافی مدد ملی ہوگی، خواہ ایسا انہوں نے خود کیا یا یہ سب کچھ گمنام ہاتھوں سے ہوا۔مزید براں تمام مستند احادیث کے مجموعوں میں روایات مع اسناد اور ان کے ناموں کے شامل کی گئی ہیں۔(۵۶) (۵) گولڈ زیہر (۵۷) پورے وثوق سے اپنی تصنیف ''مسلم سٹڈیز'' میں لکھتا ہے کہ حدیث متواتر جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی بھی غلط اور جھوٹ بات آپؐ سے منسوب کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اسی قسم کی اور بھی احادیث وضع کر لی گئی تھیں تا کہ جعل سازی کو روکا جا سکے۔مسلم سکالرز نے اس حدیث کا حوالہ مستشرقین کے ماضی میں کیئے گئے بلا دلیل وحجت دعووں کے بارے میں بطور مثال دیا ہے، اس لئے کہ گولڈ زیہر نے اپنے دعوے کی حمایت میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔جنبل ان روایات پر کی جانے والی طویل بحث کو شامل کر لیتا ہے اور گولڈ زیہر کے حق میں ثبوت فراہم کرتا ہے وہ دلیل وحجت کی خاطر یہ مثال بھی پیش کرتا ہے کہ متواتر، کی سیرت نگاری اور بیان کسی حدیث کی صداقت وسچائی کی ضمانت تو نہیں ہو سکتے۔(۵۸)

(۶) سب سے آخر میں ہمیں اس بات کا تذکرہ بھی کرنا چاہئے کہ شاخت کے ''مشترکہ رابطے کا نظریہ'' نے بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے۔(۵۹) یہ نظریہ اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ کسی مخصوص روایت کی جعل سازی اور جعل سازی کا زمانہ دونوں معلوم کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے متضاد اسناد کسی مشترکہ درمیانی مقام پر ایک دوسرے کو منقطع

Marfat.com

کرتے ہوں، اسی کو ''مشترکہ ربط'' کا نام دیا گیا ہے۔ شاخٹ ایک ایسی حدیث کی مثال (٦٠) دیتا ہے جس کے تین مختلف سلسلہ ہائے استناد ہیں اور تینوں کا راوی تیسرے رابطے میں پہنچ کر ایک ہے اور پھر کہیں اور جا کر یہ مختلف ہو جاتا ہے اس کے نظریے کے مطابق یہ مشترکہ رابطہ یا تو خود جعل سازی ہے یا وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر یہ جعل سازی ہوئی۔

میں نے جنبل کے کام کا حوالہ اس وجہ سے دینے کا انتخاب کیا کیونکہ یہ بہت قریب زمانے کا ہے، جامع ہے اور بہت واضح ہے۔ میں نے اس کے پیش کردہ اہم نتائج کا خاکہ فراہم کیا ہے اور پھر بھی یا تو اس کے بارے میں لوگ کم جانتے ہیں یا مسلم مصنفین نے انگریزی زبان میں اسے موزوں اور مناسب طریقے سے پیش ہی نہیں کیا۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے میں اپنے ان چند تاثرات میں آپ کو شریک کرنا چاہوں گا جو فوری طور پر میرے ذہن میں آئے، آغاز کروں گا (٢) سے، جب سے یہ دریافت ہوئیں۔ (١) یہ زیادہ مخالف مسلمانوں کو اشتعال نہیں دلاتیں۔

شاخٹ کا وہ نظریہ جس میں کسی حدیث کو زیادہ سے زیادہ قدیم زمانے میں لے جا کر کسی سے منسوب کر دیا جاتا تھا، اسے صرف عظمی نے تفصیل کے ساتھ اپنی تحریر میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ عظمی، شاخٹ کی تمام مثالوں پر سیر حاصل بحث نہیں کرتا اور نہ جنبل کے اعتراض کے مفصل اور واضح اعتراف کی توقع کرتا ہے۔ اس نظریے پر اور کئی دوسرے نظریات پر منطبق ہونے والی مغربی تنقید حدیث کے خلاف وہ چند عام تدابیر ضرور اختیار کرتا ہے۔ وہ مسلسل اس نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے کہ حدیث کے مستشرق نقادوں کے نتائج اکثر: (الف) ناگزیر حد سے بھی بہت دور ہوتے ہیں۔ (ب) ان جزوی معلومات پر مشتمل ہوتے ہیں جو بہت سارے میسر ثبوتوں اور شہادتوں سے متصادم ہوتی ہیں اور (ج) ایک نہایت موزوں بات کی طرف توجہ دلاتا ہے جس کی طرف جنبل پوری طرح متوجہ نہیں ہوا تھا: مغربی نظریات قانونی لٹریچر اور حدیث لٹریچر کے تقابل پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ دونوں شعبے ہمیشہ سے اپنے اپنے علوم کے ساتھ قوانین کے پابند رہے ہیں، اس لئے کہ علم حدیث کا موضوع خالصتاً آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر اور آپؐ کے افعال پر مشتمل ہے۔ (یعنی جو آپؐ نے فرمایا اور عملاً کر کے دکھایا) جبکہ اسلامی قانون کی حتمی دلچسپی قانون کے سسٹم اور اصولوں سے ہے حالانکہ یہ اول الذکر علم کے نتائج کو

نافذ کرتا ہے۔ احادیث کے راویوں کے معیار قدرتی طور پر قانون کے سکالرز کے معیارات کی نسبت، جب وہ روایات میں آئے، زیادہ محنت طلب تھے۔ ان علوم میں سے کسی ایک کے بارے میں نتائج مرتب کرتے وقت بے حد احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ دوسرے علم کے مطالعہ پر انحصار کر کے یہ نتائج مرتب کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں ریاضی کی تحقیق کے معیارات اور ترقی پر ریاضی سے متعلقہ علم طبیعات میں ہونے والی پیش رفت اور اس میں مستعمل طریقوں پر توجہ مرکوز کر کے کوئی نظریہ استوار کرنا نامناسب ہوگا۔ عظمی کے خیال میں موجودہ مغربی محققین کی یہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ (٦١) مغربی مصنفین کسی حدیث کو بہت دور کے زمانے کی کسی شخصیت سے منسوب کرنے کے عمل کے حق میں دلائل دیتے ہیں تو اپنی اصطلاحات کو پریشان کن حد تک مبہم بنا دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح کلیدی الفاظ، مثلاً ''یکساں'' ''ایک جیسے اور'' ''مترادف'' کو متن کے حوالے سے آپس میں اکثر گڈ مڈ کر کے ایک جیسا بنا دیتے ہیں۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ اسکالرز کی آراء کو جنہیں یکساں بنا دیا جاتا ہے، ماضی میں لے جا کر اقوال نبوی ﷺ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر جب ہم دونوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو ان میں اکثر بالکل مختلف انداز بیان اور فرق فرق جملے نظر آتے ہیں۔ ان مثالوں میں سکالر کے بیان کو باآسانی گذشتہ مثالوں پر مبنی قرار دے دیا جاتا ہے یا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اس کا رواج تھا۔ اس ضمن میں اس بات کے سمجھنے میں مدد ملے گی کہ عالمانہ آراء کے سلسلہ ہائے منتقلی کو محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبیؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کے علاوہ ماضی کی کسی نامور شخصیت سے کچھ بیانات کو منسوب کرنے کیلئے اتنی زحمت کیوں اٹھائی جاتی تھی؟

قانونی حلقوں میں جن دنوں نامور شخصیات کے بیانات کو استعمال کیا جاتا تھا تو یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ روایات منتقل کرنے والوں کے سلسلے کو اصل مصنف تک لے جا کر جوڑ دیا جائے۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا کہ یہ شخصیت کون تھی، اسے تو بس ثبوت اور شہادت کے طور پر پیش کرنا ہی مقصود تھا۔

آج تو ہمیں یہ سہولت حاصل ہے کہ ہم کسی کتاب کا حوالہ دے سکتے ہیں مگر ماضی میں یہ سہولت کہاں حاصل ہوتی تھی۔ جنبل کا لہجہ بہت تیز و تند ہو جاتا ہے مگر پھر وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور

Marfat.com

اس کے جوش اور ابال میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے: قانون دان اور فقیہ ومفتیان نبیؐ کے علاوہ دوسری شخصیات کے حوالے کیوں دیتے ہیں جبکہ ان کی آراء میں شامل بیانات محمد ﷺ کے بیانات جیسے ہی ہوتے ہیں؟ اس کے جواب میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

اکثر کسی معتبر شخصیت کی رائے کا حوالہ دینا زیادہ آسان اور سہل ہوتا ہے بجائے اس کے کہ اس کے پچھلے استدلال اور ثبوت کا حوالہ دیا جائے۔ دلیل و حجت جو کسی معتبر شخصیت کی طرف سے پیش کی جائے ایک عام حکمت عملی ہے اور یہ ان بہت سے طریقوں میں سے ایک ہے جو کسی معاملے پر بحث و تمحیص کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ صورتحال کی حمایت یہ بتا کر کی جاتی ہے کہ ایک ماہر اس ثبوت پر غور وفکر کرنے کے بعد جو اسے میسر تھا ان ہی نتائج پر پہنچا تھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھے اور اکثر لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں، کہ کیا کسی شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی معاملے میں حکم عدولی پر اپنی بیوی کے منہ پر تھپڑ مارنے کا حق رکھتا ہے (قرآنی حوالہ ۲: ۳۴) تو میں یہ جواب دے سکوں گا ''نہیں، اسلام میں شوہر کو بیوی کے خلاف جسمانی طاقت کا استعمال کبھی نہیں کرنا چاہئے، البتہ نہایت انتہائی حالات میں معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے مگر پھر بھی شوہر کو یہ اجازت نہیں کہ وہ بیوی کو منہ پر مارے۔'' میرے ذہن کے کسی کونے میں بہت سی روایات ہیں، جن کی زبان و بیان اس طرح کی ہے کہ نبیؐ نے اس سورۃ پر بات کرتے وقت یہی فرمایا تھا:

تاہم میں اپنی رائے کی حمایت میں ان کا حوالہ دے بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی دے سکتا، یہ حالات اور سوال کرنے والے پر منحصر ہے۔ دراصل معاصر مسلم مقررین اکثر تیسری صدی کے ایک عالم طبری کی رائے کا حوالہ دیتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر اپنے فیصلے کی بنیاد نبی ﷺ کے بیان کردہ اقوال پر رکھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میری رائے محمد ﷺ کے کچھ اقوال سے مطابقت رکھتی ہے، خواہ میں نے اس تک آزادانہ طور پر رسائی حاصل کی اور بیان کی گئی روایت کی صداقت کے بارے میں یہ کچھ نہ بتاتی ہو، اس لئے کہ میں ایک فوری نوعیت کے، عملی اور سیرت و کردار سے متعلق مسئلے پر بحث کر رہا ہوں۔ یہ اس معاملے کی وضاحت کرسکتی ہے جب ایک سکالر کا بیان وہی مفہوم دیتا ہو جو ایک حدیث نبوی ﷺ دیتی ہو مگر ان بیانات کا کیا جائے جنہیں دور ماضی میں لے جا کر کسی ایسے سکالر سے منسوب کر دیا جائے جہاں الفاظ اور اسلوب

بیان نبیؐ کی کسی حدیث سے یکسانیت رکھتا ہو؟ حنبل کی رائے جو (۲) میں دی گئی ہے اسے یہاں آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ اکثر قانونی جملوں یا قانونی اقوال سے جنم لیتی ہے۔ بیشک ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ لوگ یہ کوشش کیوں کریں کہ کس بیان کو ماضی میں لے جا کر کسی فقیہ و مفتی یا قانون دان سے منسوب کردیں جبکہ فی الحقیقت یہ خود نبیؐ نے فرمایا ہو؟

یہ بات قابل فہم ہے کہ قانونی سکالرز ہمیشہ اس بات کی صراحت نہیں کرتے کہ وہ قانونی حوالہ جو کہیں استعمال ہوا ہے نبی کی ذات اقدس سے منسوب ہے، اس وقت بھی جب وہ یہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ایسا ہی تھا۔ جب بات سیرت و کردار کے قوانین طے کرنے کی آتی ہے تو آج تک مسلم مقررین اور مصنفین جس رواج کی تاکید و ہدایت کرتے ہیں اس کے ماخذ تک ہمیشہ نہیں پہنچتے۔ ایک نومسلم کو یہ بات بہت مایوس کن محسوس ہوسکتی ہے۔ آپ کی نماز کو کیا شے بے مقصد اور قبولیت نہ پانے والی بنا دیتی ہے؟ مذہبی لحاظ سے غسل و طہارت کب واجب ہو جاتے ہیں؟ جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو کسی مرد یا عورت کو نماز میں شامل ہونے کیلئے کیا کرنا ہوتا ہے؟ مسلمان کی جائیداد میں کون کون وارث کے طور پر حصہ دار ہوتا ہے؟ یہ وہ بہت سے اصول وضوابط ہیں جن کی ہمیں تعلیم دی جاتی ہے اور ایسا کرتے وقت نبویؐ کی کسی واضح مماثل نظیر کے بارے میں اکثر ہمیں کچھ نہیں بتایا جاتا اور اس کی سیدھی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ باتیں اس قدر عام ہیں اور لوگوں میں درجہ قبولیت حاصل کرچکی ہیں کہ کوئی مصنف یا مقرر اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا کہ یہ معلومات فراہم کرے۔ مگر ایک نومسلم مرد یا عورت اسلام قبول کرنے کے بعد جلد ہی ایک نئے فرمان الٰہی کے ماخذ کی تلاش وجستجو میں لگ جاتے ہیں جس کے بارے میں وہ سنتے ہیں کیونکہ وہ مرد یا عورت جو کچھ جانتے ہیں اس کے مطابق یہ رواج اس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا کہ یہ کسی مصنف یا مقرر کی رائے پر مبنی ہوتا ہے۔

عظمی کو بھی اس سے اتفاق نہیں کیونکہ اس کے خیال میں پہلی تین اسلامی صدیوں کا ہر مسلم مقرر شافعی مسلک نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی ہر طالب علم البخاری تھا۔ بعض طلبہ اپنے علم و فضل میں بڑی محنت کررہے تھے جبکہ دوسرے زیادہ لاپرواہ تھے۔ اسی لئے کچھ طلبہ سے یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ وہ نبیؐ کے بیانات کو دوسروں کی عالمانہ رائے کے ساتھ گڈمڈ کردیتے ہوں گے۔ ایسی باتیں آج بھی ہورہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات سننے یا پڑھنے میں آتی ہے کہ محمد ﷺ نے

Marfat.com

فرمایا: ''کام کرنے لگو تو یہ سمجھو کہ تمہیں کبھی مرنا ہی نہیں اور عبادت کرنے لگو تو یوں سمجھو کہ کل ہی تمہیں مر جانا ہے'' سبھی جانتے ہیں کہ نبیؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا تھا لیکن مقررین اور مصنفین جو نہیں جانتے اس بات کو آنحضور ﷺ سے منسوب کر دیتے ہیں اور یہ حدیث نبویؐ کے بہت قریب آ گیا ہو تو اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ سننے والے نے غلط سنا، مقررین نے یہ فرض کر لیا تھا کہ سامعین اس بیان سے واقف ہیں یا اس نے اپنے ماخذ کو دوسرے موقعوں پر واضح کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ان سب باتوں سے بالاتر، ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے، جیسا کہ مستشرقین پورے شد و مد سے اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلامی عہد کے ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں قانونی فکر کے زیادہ مراکز میں قانونی جھگڑوں میں یہ بات ضروری سمجھی جاتی تھی کہ اس بات کو پیش کیا جائے کہ ایک مخصوص مسلمہ ضابطہ نبیؐ کے عہد سے مقامی رواج کے طور پر نافذ تھا۔ دوسری اسلامی صدی کے اختتام تک ایسا نہیں تھا کہ صاف و واضح نبوی نظیرات ضروری ہو گئی ہوں۔ اس عہد تک ان کے لئے جو قانونی بحث یا جرح میں ایک کردار ادا کرتے تھے، یہ کافی تھا کہ وہ کسی قول یا اصول کو رواج دیتے وقت کسی مقامی صاحب اختیار کی مقامی سند کا حوالہ اس کے ابتدائی ماخذ کو تلاش کئے بغیر دے سکیں۔ یہ حقیقت مستشرقین کے لٹریچر میں مضبوطی سے اپنے قدم جما چکی ہے۔ علم حدیث میں بعد کی ترقی اور پیش رفت اور دوسرے عناصر قانونی معاملات پر بحث و جرح کی کسوٹی اور معیار میں تبدیلی لے آئے تھے۔ ایک بار پھر ہم عظمی کی اس احتیاط کو دہراتے ہیں کہ ایک علم کے بارے میں دوسرے علم کی ترقی و ترویج کے مطالعہ کے بعد حوالے دینے سے گریز کرنا چاہئے۔

جیسا کہ جنبل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلم روایت پرست اس حقیقت سے باخبر تھے کہ احادیث کو منتقل کرنے والے دیانتدار افراد بھی کسی بیان کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کرتے وقت غلطی کا ارتکاب کر سکتے تھے جبکہ بعد کے دور میں اسے کسی اور سے منسوب کیا جا رہا ہو۔ تاہم وہ ایسا ہمیشہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ ماضی میں بہت دور کسی سے کوئی روایت منسوب کر دی جاتی تھی اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ شخص کوئی قانون دان یا روایت پرست ہو گا جو دانستہ طور پر کسی معلومات کو غلط اور نادرست ثابت کرنے کے لئے ایک سلسلہ کو مکمل کر رہا تھا

Marfat.com

انہوں نے دیکھا کہ اس معاملے میں ممکنہ غلطیوں کو مؤثر طور پر جانچنے کا ذریعہ تھا کہ معلومات کا تقابلی جائزہ لیا جائے اور حوالہ در حوالہ کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ روایت پرستوں نے محسوس کیا کہ اسناد کی تنقید کے طریقے اس قسم کی غلطیوں سے بچنے کیلئے مؤثر محافظ ثابت ہوسکتے تھے۔

جنبل کا حضرت انس ابن مالک اور حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں فیصلہ جیسا کہ (۳) میں بیان کیا گیا ہے قائل نہیں کرتا۔ اس نے موطا میں شامل حضرت انس کی روایت کردہ تقریباً چھتیس احادیث کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مدنی الاصل احادیث اور وہ جو ان کے عراقی شاگردوں نے بیان کیں، اس کے فیصلے کے مطابق ان میں زیادہ تہ بندی نہیں ہے۔ (٦٢)

یہ بات جنبل کو متحیر کرتی ہے کیونکہ اس کی رائے میں مدینہ طیبہ میں جو معلومات انس نے مہیا کیں بصرہ میں قیام کے دوران بھی انہوں نے کہا کہ کم وبیش وہی ہونا چاہئے تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ''زیادہ تہ بندی'' کیا ہے اور کیسے وجود میں آتی ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس بات کی توقع ہی کیوں کریں کہ ایسی تہ بندی ممکن ہوسکتی ہے؟ برسوں سے ایک استاد جو کچھ اور جیسا پڑھا رہا ہے اس کا انحصار ایک فرد پر اور بہت سے دوسرے عناصر پر ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس حضرت انس کے بارے میں صحیح صحیح معلومات نہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے کام کو مستقبل کا محقق جعل سازی تصور نہیں کرے گا کیونکہ میں نے اپنے کاروبار حیات میں مختلف مراحل میں مختلف مسائل پر لیکچر دیئے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے منسوب تئیس سو روایات ہیں جبکہ جنبل ان میں سے موطا میں شامل صرف چھتیس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کر لیتا ہے۔ اتنے تھوڑے سے نمونوں کی بنیاد پر اتنی بڑی رائے قائم کرنے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جو محدود سی روایات زیر مطالعہ آئیں وہ دوسری تمام روایات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ پر جنبل کی بحث وتمحیص اور زیادہ دھندلی اور غیر واضح ہے کیونکہ وہ نہ تو زیر مطالعہ احادیث کی فیصد تعداد کا ذکر کرتا ہے نہ ان کی فیصد تعداد بتاتا ہے جو احادیث کے مستند مجموعوں میں شامل کر لی گئیں۔ (٦٣)

(۴) میں بیان کی گئی ''زمانے کے قریب'' پر مبنی جعل سازی کا نظریہ میرے علم کے

Marfat.com

مطابق اصلی اور حقیقی ہے۔ بدقسمتی سے اس کی صرف دو مثالیں دی گئی ہیں چار مزید واضح اور صاف صاف مثالیں جن کا حوالہ میری طرف سے اوپر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ ہیں۔ چونکہ اسماء الرجال میں سیرت نگاری پر مشتمل تقریباً دس ہزار کتابیں ہیں۔ (۶۴) اس لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی ایسے نظریے پر اعتماد اور بھروسہ کرلیا جائے جس کی بنیاد محض چند مثالوں پر رکھی گئی ہے۔ لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ قدیم اسلامی لٹریچر کا کوئی بھی جدید طالب علم اتنے زیادہ افراد کے ساتھ منسوب اتنی طویل عمروں کے بارے میں تشکک کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسلم مصنفین نے اس کا سبب ناپسندیدہ، عدم صحت کی حامل مبہم تحریروں کو ٹھہرایا ہے جنہیں بنیاد بنا کر مشرق وسطیٰ، خصوصاً عرب میں رہنے والوں نے اپنے کسی عزیز کی عمر یا اپنی عمروں کے اعداد وشمار پیش کئے ہیں۔

قمری سال کا استعمال اور اسلامی دنیا کے زیادہ حصے میں یوم پیدائش اور یوم وفات منانے کا رواج نہیں جس کا اس غیر معمولی معاملے میں بڑا ہاتھ ہے۔ یہ بڑی انوکھی بات ہے کہ مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والا میرا ہر دوست کسی نہ کسی خاندان کے ایک ایسے فرد کو ضرور جانتا ہے جو نصف صدی (پچاس سال) سے زیادہ عمر کا ہو کر مرا ہو! مسلم سکالرز عام طور پر سوانحی تذکروں میں دی گئیں پیدائش اور موت کی تاریخوں کو اندازے اور تخمینے پر محمول کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ صحیح تاریخیں نہیں ہوتیں۔ مزید یہ کہ روایت پرست جن بے شمار باتوں کو قابل توجہ سمجھتے ہیں یہ ان میں سے صرف ایک ہے۔ عظمی نے مختلف سوانحی تذکروں میں عمروں کے دورانیوں کے تخمینوں میں بڑا فرق دکھایا ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اکثر تو یہ تخمینے سرے سے مہیا ہی نہیں کئے جاتے اور اسے قیاس پر انحصار کرنا پڑتا ہے کہ کسی شخص کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کیا ہو سکتی ہے۔ (۶۵) سوانحی لٹریچر دعویٰ کمال کبھی نہیں کرتا کیونکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایسی معلومات پیش کردے جو ان اشخاص سے متعلق تھیں جو احادیث کو منتقل کرنے میں شامل تھے اور جو مسلم سکالرز سمجھتے تھے کہ مفید ہو سکتی ہیں۔ ''زمانے کے فریب'' پر مبنی جعل سازی اور اس حوالے سے روایات پر کی گئی زیادہ مغربی تحقیق پر جو میرا بڑا اعتراض ہے اسے میں جعل سازی کا حد سے بڑھا ہوا خوف کہتا ہوں۔ اس سے میری مراد وہ خیال اور سوچ ہے جس کی رو سے اس شعبے میں کام کرنے والے مسلم ماہرین کی جمع کردہ معلومات کے انبار کو چھننی میں سے

Marfat.com

گزارنا اور عدم مطابقت پر جعلسازی کا لیبل لگا دینا ہے، اور یہ نہ سوچنا کہ ایسا انسانی غلطی یا غلط تخمینوں کی بناء پر بھی ہو سکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا بددیانتی یا حماقت کو، جہاں کہیں ممکن ہو دیکھنے کا جبر اور دباؤ بنیادی مغربی تعصب کی ایک قسم اور تکبر کی عکاسی نہیں کرتا جس پر ایڈورڈ سعید نے اپنی تصنیف ''اورینٹلزم'' (مستشرقیت) میں بحث کی ہے۔(٦٦)

جنبل کو اس بات کا اعتراف ہے کہ دو احادیث متواتر کے استناد کے خلاف اس کا استدلال جو (۵) میں اوپر بیان ہوا ہے مؤرخین اسے عام طور پر کمزور تصور کرتے ہیں۔(٦٧)

یہاں بھی اور اس کے پورے متن میں بھی کم و بیش اس کے تمام قطعی اور فیصلہ کن استدلال خاموش ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر بہت سے سکالرز نے وہ کچھ اپنے ہی احادیث کے مجموعوں سے اخذ کر دیا ہے جسے آخر کار ایک ایسی مستند حدیث کے طور پر قبول عام کا درجہ حاصل کرنا تھا تو اس حدیث کے استدلال کے بارے میں منفی رائے پائی جائے گی۔ اس قسم کے استدلال سے مصنفین مشتعل ہوتے رہیں گے، اس لئے کہ ہر سکالر کے بارے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اپنے وقت کی تمام روایات اس نے سنیں اور جمع کی ہوں گی اس تصور میں انسانی حدود اور باہر کی رکاوٹوں یا پابندیوں کے عمل دخل کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ جنبل کے اہم اور بڑے ماخذ میں سے ایک مالک کی موطا ہے حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ مالک کا اصل مقام و مرتبہ یہ تھا کہ وہ ایک قانون دان تھے، روایت پرست نہیں تھے، ان کی کتاب موطا میں روایت کی ایک کثیر تعداد ہے لیکن یہ اس مقصد سے نہیں لکھی گئی تھی کہ یہ احادیث کے مجموعے کے طور پر کام آئے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خود جنبل کئی موقعوں پر اپنے ماخذ کی تشنگی پر زور دیتا ہے۔ اس لئے اس کے استدلال کو حتمی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

شاخت کے نظریے ''مشترکہ رابطہ'' (٦) کو روایات کے بارے میں بعد کے مغربی اور مسلم محققین کی تحقیق نے پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ایک بار پھر اس کی بنیاد برائے نام ثبوت پر ہے۔ آیئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت سی احادیث ایسی ہیں کہ جن کے متون ایک جیسے ہیں اور کسی درمیانی عرصے میں ان کا استناد بھی ایک مرسل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں شاخت دیکھتا ہے کہ ''ایک ہی مرسل کے زمانے میں اس حدیث کے وجود میں آنے کا بہت مضبوط اشارہ ملتا ہے۔(٦٨) مغربی تحریروں میں اس قسم کے ''مشترکہ

Marfat.com

رابطے'' کی چند ایک تشریحات وتوضیحات ملتی ہیں۔ ایک شاخت پیش کرتا ہے (٦٩) اور چند دوسری جنبل نے پیش کی ہیں۔(٧٠) جس کا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کا انوکھا معاملہ نسبتاً کم ملتا ہے۔ عظمی نے شاخت کی دی گئی مثال کو ناموزوں ٹھہرایا ہے۔(٧١) اور اس عجیب وانوکھے معاملے کی وضاحت شاخت اور جنبل دونوں نے ایک ہی کی ہے جو اپنی جگہ بہت واضح ہے۔ جہاں کہیں کسی روایت کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں جعل سازی ہوئی ہے۔ جیسا کہ جنبل کچھ مثالیں زیر بحث لایا ہے تو مشترکہ رابطے کا نظریہ یقیناً یہ تجویز دے گا کہ فلاں ممکنہ زمانے میں اس روایت میں کذب وجھوٹ شامل ہوا ہے۔

عموماً ''مشترکہ رابطے'' کی موجودگی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ضرور جعل سازی ہوئی ہے۔ مسلم سکالرز جو صدیوں پہلے اس عجیب وغریب حقیقت سے واقع نہیں تھے انہوں نے دوسری تشریحات وتصریحات کی اجازت بھی دے دی تھی۔ مثال کے طور پر چند سکالرز کے بار میں پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث کے تمام موجودہ ماخذ پر تحقیق کی ہے اور بعض اوقات زیر تحقیق ان احادیث میں سے کوئی بہت غیر معروف بھی ہوتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی کبھی ہمیں کوئی ایسا سکالر مل جاتا ہے جو کسی خاص وقت کے کسی خاص لمحے بہت سے ماخذ سے ایک حدیث حاصل کرتا ہے خصوصاً اس وقت جب اس کے علم کی مانگ ہوتی ہے اور وہ اسے اپنے بہت سے طلبہ تک پہنچا دیتا ہے جیسا کہ جنبل نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ مسلم روایت پرست اس امکان سے باخبر ہوں کہ ''مشترکہ رابطے'' سے جعل سازی کی جانب اشارہ مل سکتا ہے۔(٧٢) مگر شاخت کے برعکس اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنے سے پہلے ان کیلئے مزید ثبوت درکار تھا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں حدیث لٹریچر کے استدلال پر جنبل کے نقطہ نظر کو مستشرقین اور مسلمانوں کے متعین مقامات کے فاصلے کا آدھا راستہ نہیں سمجھتا۔ کم از کم میں یہ سمجھتا ہوں کہ جنبل تو گولڈ زیہر اور شاخت کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا بیشک گولڈ زیہر اور شاخت کی نسبت اس کی تشریح وتوضیع میں زیادہ محتاط، سہل اور نکھرا ہوا انداز ملتا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ جنبل کی رسائی اور دریافت بنیادی طور پر کس مقام پر ان دونوں کی فکر سے جدا ہو جاتی ہے یا ان کے نظریات کے خلاف استدلال کو اسی مؤثر طریقے سے اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

اس شعبہ میں میری رائے میں جنبل کا مطالعہ مسلمانوں اور مغربی سکالرز کے نقطہ نظر میں حائل فاصلے کو کم کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتا۔

نومسلم ہونے کی حیثیت سے میں نے جو وجوہ شروع میں بیان کی ہیں ان کی بنیاد پر، میں احادیث نبویؐ کے بارے میں بڑے شک وشبہات رکھتا تھا۔ مجھے اسلام قبول کئے چار سال ہوئے تھے کہ حدیث پر تنقید کے موضوع پر مجھے ایک مسلم مصنف کی کتاب انگریزی زبان میں پڑھنے کو ملی۔ بہت سے مسلم مصنفین مختصراً اس موضوع پر لکھتے ہیں مگر وہ اس موضوع کو پیش کرتے وقت عموماً اپنے مذہبی عقیدے کے کٹر پن کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ میں نے تو مستشرقین کی کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں جن میں زیادہ علم وفضل کی باتیں ملتی تھیں اور یہ کتابیں زیادہ دلنشین بھی تھیں اور ترغیب دہ بھی۔ حالانکہ وہ میری تشکیک پرستی کی حمایت کررہی تھیں مگر ان کے مطالعہ کے بعد دراصل مجھے اپنے شکوک وشبہات میں کمی کا یقین ہوگیا تھا۔ مستشرقین کی رائے اور ظن وقیاس دلچسپ اور جرأت مندانہ تھے مگر جو مجموعی تصویر پیش کی جاتی تھی اس میں ربط مفقود ہوتا تھا مثلاً طیطس برخارت جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے، کے ہاں یہی صورتحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ جو نتائج وہ پیش کرتا تھا وہ دوراز حقیقت بھی ہوتے تھے اور ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوگ سنکی، خشک مزاج اور نک چڑھے ہیں۔

کچھ وقت گزرا تو تلاش وجستجو سے اور خوش قسمتی سے مجھے ایسے عالم فاضل مصنفین مل گئے جو مستند اور اعلیٰ درجے کے حدیث لٹریچر کا دفاع کررہے تھے جو تفصیل انہوں نے بیان کی تھی اور جس میں اس لٹریچر میں آنے والی ترقی کا بڑی سنجیدگی سے ذکر کیا گیا تھا اس میں تضادات بہت کم تھے اور نفسیاتی جست بھی مستشرقین کی نسبت کم لگائی گئی تھی۔ نبی کریم ﷺ، آپؐ کے صحابہ کرام، مستند احادیث کا قرآن پاک کے بعد احترام، کسی بھی پیغمبر کی زندگی کے بارے میں یا دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کسی ایک کے بھی استاد پر جائزاتی اور تقابلی موضوع پر مسلمانوں کی کوششوں کو بھی میں نے بے حد سراہا۔ مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ مسلم ماہرین نے آنحضرت ﷺ کی احادیث اور کارہائے نمایاں کا نقص سے پاک ریکارڈ تیار نہیں کیا تھا بلکہ معلومات کا ایک ذخیرہ جمع کرلیا تھا اور یہ وہ معلومات تھیں جن میں سے مسلمانوں کی رہبری اور ہدایت کیلئے قوانین حاصل کئے جاتے ہیں اور قرآن کے بعد اس کا

Marfat.com

دوسرا درجہ ہے۔ ہم اس نکتے پر گفتگو کیلئے کچھ دیر بعد واپس آئیں گے۔

میں یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا کہ علم حدیث میں مغربی سکالرز کا علم وفضل بے کار یا غیر اہم ہے۔ وہ تمام مصنفین جن کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے اور جنہوں نے اس مستند اسلامی لٹریچر کی راستبازی اور صحت وسچائی کا دفاع کیا ہے وہ اس کی حمایت کرتے ہوئے ایک دوسرا جواز پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ میں ہر مغربی تنقید سے متفق نہیں ہوں مگر اس کے باوجود علم روایات کے بارے میں مغربی لٹریچر سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہ سب کچھ مجھے مسلم ماخذ سے حاصل نہ ہوسکا۔ مزید یہ کہ مغربی سکالرز نے اس شعبے میں بہت اہم تصنیفی خدمات سرانجام دیں ہیں۔ وہ مستند کلاسیکی ''رجال'' اور ''اوائل'' (ایسی رپورٹیں کہ جن میں یہ معلومات دی جائے کہ کوئی کام سب سے پہلے کس نے کیا یا مختلف دساتیر اور اصول پہلی بار کب متعارف کرائے گئے) کے تحریری کام اور امام مالک کے ''موطا'' امام شافعی کی ''الرسالہ'' اور ابن حنبل کی ''مسند'' جیسے اہم کام پر مبنی قانونی کتابوں میں دلچسپی کو ازسرنو ابھار رہے ہیں، ان کتابوں کے یورپی زبانوں میں تراجم کیے جارہے ہیں۔ ''مسلم روایت میں ربط وترتیب'' (دی کانکارڈینس اینڈ انڈسز آف مسلم ٹریڈیشن) نامی کتاب اس نصف صدی پر پھیلے ہوئے مختلف ممالک کے تقریباً چالیس سکالرز کی اجتماعی کوششوں کا ثمر ہے جس کی بے حد قدرومنزل کی جاتی ہے۔ احادیث کے چھ مستند مجموعوں کے تمام اہم اسالیب بیان اس میں شامل ہیں۔ نیز ''سنن الدارمی'' امام مالک کی ''موطا'' امام ابن حنبل کی ''مسند'' کو حروف ابجد کی رو سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان نئے تنقیدی طریقوں کو بہتر بنایا گیا ہے جو مسلم سکالرز کے لئے مفید ہوسکتے ہیں اور جنہیں ان کو پرکھنا چاہئے۔

حاجت کا سوال

ان سے کہو کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت قبول کرلو''......

(۳:۳۲، ۳:۱۳۲، ۵:۹۲، ۸:۱، ۸:۲۰، ۹:۷۱، ۲۴:۵۲، ۳۳:۵۴، ۳۳:۳۳، ۵۸:۱۳)

Marfat.com

''جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا......(۴:۱۳)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی......''(۴:۵۹، ۸:۲۰، ۴۷:۳۳)

''جو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا......''(۴:۶۹، ۲۴:۵۲، ۳۳:۳۱، ۳۳:۷۱، ۴۸:۱۷)

''......جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی......''(۴:۸۰)

''...... حالانکہ اگر یہ اسے رسول ﷺ اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں............''(۴:۸۳)۔

''......اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے......''(۳:۱۶۴)

''......اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی......''(۴:۱۱۳)

''......ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے............''(۲:۱۲۹)

''......تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے......''(۲:۱۵۱، ۶۲:۲)

''......دراصل تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ تھا......''(۳۳:۲۱)

''......جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دے وہ لے لو......''(۵۹:۷)

''...... ہمارے رسول ﷺ پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے......''(۲۴:۵۴، ۲۹:۱۸، ۶۴:۱۲)

Marfat.com

گرانٹ کے پاس دوپہر کے کھانے کیلئے صرف نصف گھنٹہ تھا۔ اسے غسل خانے جانا تھا، وضو کر کے نماز ادا کرنی تھی اور کھانا بھی کھانا تھا۔ وہ مردوں کے لئے مخصوص کمرے کی طرف گیا، اندر داخل ہوتے وقت اپنا بایاں پاؤں پہلے اندر رکھنے پر اسے اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق کچھ پڑھنا بھی تھا۔ اس نے سوچا یہ بایاں پاؤں ہوگا یا دایاں ہونا چاہئے؟ اسے اچھی طرح یاد نہ رہا تھا، لغزش یا غلطی کر بیٹھنے سے گویا گر کر مر جانے کا احتمال تھا۔ وہ غسل خانے میں جا کر پیشاب کی حاجت سے فراغت کے لئے بیٹھ گیا اور پوری کوشش کی کہ اس کے جسم اور کپڑوں پر چھینٹے نہ پڑیں۔ اسے خیال آیا کہ اس کے بحریہ کے پرانے ساتھی اسے یوں کسی عورت کی طرح غسل خانے میں جاتا دیکھ لیں گے تو وہ کیا سوچیں گے! اس نے کوشش کی کہ مذہب کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی خیال نہ آئے مگر اس قسم کی کوشش تو ایک طرح سے اپنے آپ کو شکست دینے والی بات تھی۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد اس نے ایک اور دعا پڑھی اور پھر پانی کے آب گیر (بیسن) کی جانب بڑھا۔ اس نے جلدی جلدی موزے اور جوتے اتارے اور پاؤں صاف کرنے والے تولیے پر پاؤں رکھتے وقت پوری احتیاط برتی کہ اس کا پاؤں غسل خانے کے فرش کو نہ چھوئے۔ اس نے ٹونٹی گھما کر پانی بہنے دیا اور ایک اور دعا تلاوت کی۔

اس نے وضو شروع کیا اور اپنے ہر فعل کو تین تین بار دہرانا شروع کیا۔ پہلے اپنے ہاتھ دھوئے، پھر منہ میں پانی ڈال کر غرارے کئے، پھر نتھنوں میں پانی ڈال کر انہیں صاف کیا، اب پورا چہرہ پانی سے دھویا، دائیں بازو کو کہنی تک دھویا، پھر یہی عمل بائیں بازو کے ساتھ دہرایا، اب پہلے پانی اور داہنی انگشت شہادت سے دائیں کان کا اندر کا حصہ صاف کیا پھر بائیں کان کا، پھر دوں ہتھیلیوں کو پانی سے تر کر کے سر پر پھیرا اور سب سے آخر میں دایاں پاؤں ٹخنے تک دھویا اور پھر بایاں پاؤں اسی طرح دھونے کے بعد باری باری پاؤں تولئے پر رکھے جو اسی مقصد کیلئے فرش پر ڈالا تھا۔ اب اس نے ایک اور دعا تلاوت کی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا جس کی کمی کا بھی احساس تھا اس لئے اس نے اپنے موزے اور بوٹ اٹھائے اور اس بات کی تسلی کرتے ہوئے کہ اس کے پاؤں ابھی چھوٹے تولیوں پر تھے اس نے پاؤں گھسیٹتے ہوئے دروازے تک پہنچنا شروع کیا۔

اس لمحے اس کا مینیجر غسل خانے میں داخل ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے

کھڑے تھے: گرانٹ برہنہ پاؤں تھا اور پاؤں تولیوں پر تھے، سر سے پاؤں تک پانی ٹپک رہا تھا، یہ دیکھ کر اس کے منیجر کو سخت حیرت ہوئی اور وہ ہکا بکا، آنکھیں پھاڑے گرانٹ کو دیکھ رہا تھا! اچانک گرانٹ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دائیں پاؤں کی ایڑی غسل خانے کے فرش کو چھو رہی ہے: بلا ارادہ اس کا پاؤں تولئے سے نیچے کھسک گیا تھا۔ اس نے دانت پیس لئے اور پریشان ہو کر سر جھکا لیا اس لئے کہ اسے از سر نو اب وضو کرنے کی ضرورت تھی۔

مسلمانوں میں نو مسلم اپنے مذہبی عقائد اور اعمال میں بہت راسخ العقیدہ اور کٹر ہوتے ہیں۔ وہ ایک نئی قوت و توانائی سے سرشار ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر ایک ایسی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں جسے سمجھنے اور اس میں تیزی سے آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ پہلے اور سچے ایمان والے اچھے اعمال کو سچے عقیدے کے نمونے اور اچھی مثالیں تصور کرتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنی کمزوریوں اور دنیاوی رغبتوں اور خواہشوں سے باخبر ہوتے ہیں۔ خود کو اپنے لئے قابل قبول بنانے اور اپنے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ دیانتدار ہونے کی ضرورت اکثر اوقات کئی مخالف پہلوؤں کو بیچ میں لے آتی ہے جس سے بہت سے تضادات اور کئی مصلحتیں آڑے آنے لگتی ہیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں لگتی کہ عقیدہ و ایمان کی ڈرامائی آزمائشیں اس قدر تیزی سے آتی ہوں بہت عام ردعمل تو یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک ''گتے سے تراشا ہوا مسلمان'' بن جائے اور وہ اپنے ظاہری طرز عمل کو ویسا ہی بنا لے جیسا کہ وہ اس کے بارے میں سنتا اور دیکھتا ہے۔ ایسا ریاکاری یا عدم اخلاق سے نہیں بلکہ عدم تحفظ سے ہوتا ہے۔ ایک نئی شناخت کی ضرورت سے ہوتا ہے اور اس انوکھے اور خاص مزاج پر مبنی رویے کی بڑی فراوانی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مشوروں اور نصیحتوں کو ہمدردی اور خیر خواہی سے آپس میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے اپنے عمل کے مطابق ڈھال کر اکثر و بیشتر سنت نبویؐ سے بندھا ہوا رشتہ و تعلق کمزور اور ڈھیلا کر لیا جاتا ہے۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جو ان حالات میں زندگی بسر کر چکا ہوں اس لئے میں جو بہترین مشورہ نو مسلموں کو دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی بھی نظریہ یا طرز عمل اس وقت تک اختیار نہ کریں جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ یہ آپ کے لئے ناگزیر اور بہت ہی زیادہ ضروری ہے ورنہ کوئی بھی نو مسلم مرد یا عورت اپنے آپ کو کسی ایسی مشکل میں گرفتار پائیں گے جہاں وہ اپنے طرز عمل کے بوجھ کو اتارنے کے قابل بھی نہیں رہیں گے اور

Marfat.com

مایوسی و شک و شبہات ان کو گھیر چکے ہوں گے۔ وہ دوسروں سے بھی مایوس ہوں گے اور اپنی ذات سے بھی۔ فرار کا راستہ عموماً امت مسلمہ سے دور چلے جانے میں نظر آتا ہے مگر اس سے تعلق اور دستبردار ہو جانے میں نہیں۔ پھر وہ گمنام رہ کر اس کی ثانوی حیثیت میں اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ ناکامی کے جذبات اور برہمی کا منتہا اور بریت سنت و حدیث میں ہے یا اور واضح اور صاف صاف طور پر کہا جائے تو اس اہمیت میں جو مسلمان اسے دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ایک انتہا سے دوسری انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک مسلمان مرد اور عورت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کو کیسے اپنے لئے نمونہ و مثال بناتے ہیں۔ یہ ان کا کسی حد تک ایک ذاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ ان میں سے چند ایک ہی قانون دان ہوں گے جو امہ کیلئے وسیع سطح پر طرز حیات اور عمل کے قوانین وضع کریں گے۔ عام مسلمان کیلئے سنت نبویؐ ضابطہ اخلاق اور روحانی طرز عمل میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں، ہمسایوں کے ساتھ کیسا رشتہ و تعلق استوار کرتا ہے، نماز اور دوسرے ارکان دین کی ادائیگی اور بجا آوری کیسے کرتا ہے اور تجارت میں اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ کس حد تک کامیابی سے کسی کی زندگی کا رخ متعین کرتا ہے، یہ اسے سہارا کس حد تک فراہم کرتی ہے اور اس پر بوجھ کتنا لاد دیتی ہے یہ سب ایک فرد پر منحصر ہے کہ وہ اس کی تشریح و تصریح کس طرح کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی میں نافذ کہاں تک کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کیلئے تو آنحضرت ﷺ کی ساری عملی زندگی کو جو ضبط تحریر میں آ چکی ہے اور جس کا سنت تقاضا کرتی ہے پورے کا پورا بغیر کچھ ترک کئے اپنا لینا ضروری ہے اور یہ سوچا ہی نہ جائے کہ کون سی بات کس تناظر میں کہی گئی ہے، کس کس نے کہاں کہاں بیان کی ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسے بلا کم و کاست اپنا لیا جائے۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات امریکی مسلمان عربی زبان میں دعائیں تلاوت کرتے نظر آتے ہیں اور عملاً انہیں اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں یا وہ سروں پر پگڑیاں باندھتے ہیں جسم پر قبائیں پہنتے ہیں اور ہلکے پھلکے سلیپر نما جوتے پہن کر امریکی شہروں کی سڑکوں پر پھرتے ہیں۔ ان کیلئے تو آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایک روحانی اور مذہبی رسم کی اہمیت رکھتی ہے اور حضور ﷺ کے نقش قدم پر چل کر وہ یقین و ایمان کے سرچشموں کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔ دوسروں کیلئے سنت کے مفہوم کو بڑی آزاد خیالی کے ساتھ بیان

Marfat.com

کیا جاتا ہے اور جب تک یہ ذہنوں میں پہلے سے موجود تصورات سے مطابقت نہ رکھتی ہو اس کی پرواہ نہیں کی جاتی اور اسے غیر اہم خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے تو نبیؐ ایک ذریعے سے زیادہ کچھ نہیں تھے اور عملاً تو نزول وحی کی تکمیل کے بعد انہیں اس قدر اہمیت دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جاتی تھی۔ (یہ تصور ہمارے ہاں کے نام نہاد ''دشمن روشن خیال'' اور بزعم خود ''بہت عالم فاضل'' حضرات کے اس نقطہ نظر سے ملتا جلتا ہے۔ جن کے خیال میں آنحضرت ﷺ ہمارے جیسے ایک بشر تھے اور خاکم بدہن ایک ہرکارے کی حیثیت رکھتے تھے، جن کے ذمے کلام الٰہی کو قرآن حکیم کی شکل میں انسانوں تک پہنچا دینا تھا اور بس۔ مترجم)

ان دو کے درمیان محمد ﷺ کی پیش کردہ مثال کے لاتعداد جوابات (ردعمل) ہیں مگر تقریباً پوری دنیا میں پہلی رسائی مذہبی رسومات کے اختیار کر لینے تک ہوتی ہے جزوی طور پر ایسا اس لئے ہے کہ مذہبی رسومات کی حیثیت ایک مسلمان کیلئے ایک دروازے کی سی ہے جو ان دیکھی ذات کی جانب کھلتا ہے اور ان کے ذریعے ہی اللہ سے راز و نیاز کی باتیں ہوسکتی ہیں۔ (اس تجربے کا علم ایک عام نمازی کو جو صرف عادتاً نماز ادا کرتا ہے شاید نہ ہوسکے مگر اپنے رب سے دوران نماز ہم کلام ہونے والے عارف اس سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ کاش ہمیں پوری امت مسلمہ کی حیثیت سے نماز کے اس مقام پر پہنچنے کی فکر لگ جاتی اس لئے کہ اسی صورت میں ہماری زندگیوں میں انقلاب آسکتا تھا جہاں مسجد کے اندر اور مسجد کے باہر ایک مسلمان کی زندگی ایک جیسی ہوتی ہے۔ مترجم)۔

ہم چونکہ محرم راز نہیں ہیں کہ محمد ﷺ کے لئے کن حقیقتوں اور سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا گیا تھا، جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں اس لئے ہم خصوصاً روحانی معاملات میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم آپؐ کی پیغمبرانہ بصیرت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مذہبی رسوم پوری امہ کے لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہیں، وقت، جغرافیائی مقامات، جگہ، نسل اور زبان کی قید سے آزاد اور بالاتر ہوکر یہ عمل اپنا کام کر دکھاتا ہے پوری تاریخ محمد ﷺ کے پیروکار عجز و انکساری کے ساتھ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر نماز کیلئے صف آراء ہوتے ہیں اور ہر نمازی کی نماز ایک جیسی ہوتی ہے: یہ اس مذہبی مساوات کا اعتراف ہے جس کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک اس دنیا میں وارد ہوتا ہے۔ مگر امریکی مسلمانوں کی اکثریت نے آنحضرت ﷺ کی اس

Marfat.com

مثال کے کردار کے بارے میں بھی اسے ایک تشریح طلب مسئلہ بنا دیا ہے۔

پوری امہ کی سطح پر نبی ﷺ کی سنت نے اختلافی تشریحات اور اطلاق کی حمایت کی ہے۔ چونکہ حضرت محمد ﷺ کے دور نبوت نے طرح طرح کی آزمائشیں اور ناسازگار حالات دیکھے تھے اس لئے امت مسلمہ کے لوگوں نے آپؐ کی حیات مبارکہ کی مثال کے مختلف پہلوؤں پر اپنے اپنے حالات کے مطابق زور دیا ہے۔ اس ضمن میں سنت نبویؐ میں اس قدر وسعت اور پھیلاؤ ہے کہ یہ مختلف مسلم گروہوں کی ضروریات پوری کرتی ہے۔ ظاہر پرستوں اور صوفیوں کے درمیان جس قدر عدم یکسانیت ہے اس حد تک دونوں کے نقطہ نظر پر پورا اترنے کی اس میں کافی لچک پائی جاتی ہے۔ امریکہ کے بڑے شہروں مثلاً نیویارک اور شکاگو میں واقع ان اسلامی مراکز کا ماحول جو مقامی مسلمانوں کی خدمت کیلئے قائم کئے جاتے ہیں، امریکی جامعات کے طلبہ کے قائم کردہ مراکز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ درحقیقت مسلمانوں پر سنت کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے، کیونکہ اسے سمجھنے میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کے باوجود قرآن اور سنت (اور دونوں کو اس میں شامل کیا جانے چاہئے) نے تمام مسلمانوں کے کردار اور طرز عمل پر اپنی مہر ثبت کی ہے اور زمان و مکان کے امتیاز کے بغیر ان اوصاف اور زاویہ نگاہ کا رنگ چڑھایا ہے جو باآسانی اور نمایاں طور پر اسلامی تصور ہوتے ہیں۔

ڈینی ایک چبھنے والی مثال دیتا ہے:

یہ بیس مرد عورتیں جاپانی تھے، یہ سب کے سب سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور ایک بھاری بھرکم معمر شخص کے پیچھے سیدھی قطاروں میں کھڑے تھے، جس کے بال ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس معمر شخص نے نہایت گونج دار آواز میں قرآن پاک کے پہلے پارہ سے تلاوت کی، اس کا عربی زبان کا تلفظ بلاشبہ بہت عمدہ اور نقص سے پاک تھا۔ حج کے موقع پر یہ منظر پاکستان کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کراچی کے ٹرانزٹ لاؤنج (انتظارگاہ) میں دیکھا گیا ان دنوں دنیا بھر کے ملکوں سے مسلمان سعودی شہر مکہ مکرمہ کا رخ کرتے ہیں۔ جاپانی مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروپ اپنے طویل سفر کے دوران جدہ کیلئے روانہ ہونے والی پرواز پر سوار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ شہر مکہ معظمہ میں داخلے کے لیے بحر احمر کے کنارے ایک سمندری بندرگاہ ہے۔ ہوائی اڈے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جاپانیوں نے نماز ادا کی، اس کی قریب ہی

Marfat.com

ڈیوٹی فری دکانیں بھی تھیں اور خورد و نوش کے سامان والے سٹال بھی۔

جاپان میں زیادہ مسلمان نہیں ہیں، نہ جاپانی النسل نہ کسی دوسری نسل کے۔ مگر کراچی میں جن جاپانی مسلمانوں کو میں نے نماز ادا کرتے دیکھا وہ زبان، عادات و اطوار اور جسمانی خدوخال ہر لحاظ سے جاپانی نظر آئے۔ البتہ وہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ ''کچھ اور'' طرز عمل ایک خاص نمونہ یا سٹائل ہے جو فرض شناس اور شعائر اسلامی کے پابند مسلمانوں کو دوسرے لوگوں سے جدا کرتا ہے اور اس میں نسلی و گروہی، لسانی، تمدنی اور خاندانی شناخت کا کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ (۷۳)

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ سنت نبوی کو سنگ میل کے طور پر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ اپنے اپنے تجربات اور حالات کے مطابق اسے سمجھنے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھیں گے۔ یہ بات مغربی نومسلموں کیلئے مایوس کن ہوگی کیونکہ مختلف تہذیبوں اور نسلوں پر مشتمل معاشرے کے مسلمانوں میں یہ نومسلم ایک چھوٹی سی تعداد میں ہیں۔ امت مسلمہ کے افراد خصوصاً مغرب میں، بہت سی مختلف ثقافتوں اور روایتوں کو یکجا کر لیتے ہیں اور ایسی صورت حال میں دوسروں کے نقطہ نظر کے احترام کے مسئلے پر بڑی بالغ نظری و پختگی اور نفاست وسلیقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے مشاہدات کا نچوڑ یہ ہے کہ مغربی نومسلم اکثر سب سے کم قوت برداشت کے حامل لوگوں میں سے ہوتا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ایک اصولی سوال پوچھ ہی لیا جائے جسے میں نے اب تک نظرانداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کو ضمیمے کی ضرورت کیوں ہے؟ ہم روایت پرستوں کی محنت شاقہ اور سنت کی مطابقت پذیری کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر ہماری زندگیوں کو ایک اضافی ذریعہ رہنمائی سے پیچیدہ کیوں بنایا جائے؟ کیا نزول وحی کا ایک مقصد رہنمائی کے اساسی اور بنیادی و لازمی اصول بتانا نہیں تھا اور بقیہ کو وقت کی پابند ان تبدیلیوں کیلئے چھوڑ دیا جاتا جو بہرصورت ظہور پذیر ہوتی ہیں؟ سنت کو شامل کر کے ہم قرآن کی اطلاق پذیری اور عمل و نفوذ کا دائرہ تنگ نہیں کر رہے؟ کیا خود قرآن نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ ''ہمارے رسولؐ پر صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟''

جوابات کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ کوئی فرد قرآن تک رسائی کس طرح حاصل

کرتا ہے کیونکہ یہیں سے یہ سوال جنم لیتا ہے۔ مسلم مفسرین کسی خاص وحی کی شان نزول کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی وہ تاریخی واقعات قرآنی سورتوں کا جن کی طرف روئے سخن ہے۔ تاکہ اس میں شامل پیغام کو پوری طرح سے سمجھا جاسکے۔ مگر اس سے ان کے لئے اس بات کی ممانعت نہیں ہو جاتی کہ وہ اضافی معانی (معانی کی مختلف سطحوں) کو نہ پڑھیں جو ان مواقع سے بہت آگے تک جاتے ہیں جنہوں نے ان واقعات کو جنم دیا۔ ایک مسلمان مرد یا عورت کے تجربے سے اسے تقویت ملتی ہے جن پر روزانہ تلاوت قرآن کے دوران معانی کی نئی تہیں کھلتی ہیں۔ حالانکہ وہ یہ قرآنی سورتیں پہلے بھی کئی بار تلاوت کر چکے ہوتے ہیں۔ روایتاً مسلمان کسی آیت کو حتمی معانی یا کئی ایک معانی یکجا کر کے پہنانے میں بے حد محتاط ہوتے ہیں اس لئے کہ ''اللہ سمیع و بصیر ہے'' (۴: ۱۳۴) اور ''زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جیسے سات سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے'' (۳۱: ۲۷)۔ اس سمجھ اور علم کی بنیاد پر مسلمان اس بات کی مخالفت کرتے ہیں کہ قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جو متروک ہو چکی ہیں۔ وہ بھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ آیات منسوخ ہو چکی ہیں (کہ کچھ آیات دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں) عموماً یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی موضوع پر کچھ آیات یا دوسری آیات سے مطابقت پیدا کرتی ہیں یا ان کے معانی کو محدود کر دیتی ہیں اور پھر اضافی عبارتیں، معانی اور ان سے حاصل کی جانے والی تشریحات و تصریحات کے امکان کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

یہ تصور کہ قرآن کی چند آیات متروک ہو چکی ہیں، اور بایں معنی کہ جس تاریخی واقعہ کی جانب ان میں روئے سخن ہے اس سے آگے ان کا اطلاق کہیں اور نہیں ہوتا ایک بہت پر خطر بات ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ کچھ قرآنی آیات ایسی بھی ہیں جن کا حال و مستقبل سے کوئی واسطہ نہیں تو پھر اللہ کی حکمت و دانائی اور قرآن کا ایک عالمگیر رہنمائی کا تصور دھندلا جاتا ہے یہ مان لینا کہ اللہ آخری الہامی کتاب میں متروک معلومات شامل کر دے گا اس کی طاقت و اختیار اور علم و حکمت کو لامحدود سے محدود بنا دیتا ہے پھر یہ تو ایک فرد یا کسی گروہ پر منحصر ہوگا کہ وہ وحی کے کن حصوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور کن کو قابل اطلاق تصور کرتے ہیں۔ اس طرح بنی نوع انسان قرآن کی رہنمائی کرتے ہیں بجائے اس کے قرآن انسانوں کی رہنمائی کرے۔ اس میں

Marfat.com

کوئی شک نہیں کہ اسلام میں کلیسائی درجہ بندی نہیں ہے جس سے مسلمانوں کا اتحاد خطرے میں پڑ جاتا۔ اس کے برعکس اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ قرآن کا پیغام سراسر ایک عالمگیر پیغام ہے اور مسلمانوں کی ہر نسل اور پشت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور ہدایات کی طلب کرے، تشریح کرے اور ان کا اطلاق اپنی زندگی پر کرنے کی پوری سعی و کوشش کرے۔ یہ زاویہ نگاہ مشکل ضرور ہے مگر اس میں بڑی کشش ہے۔ مگر یہ بھی پوچھ لینا چاہئے کہ کیا اس کی جانچ پرکھ کی اجازت ہے؟

قرآن پاک کی ایسی آیات بھی ہیں جو پہلی نظر میں تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی طور پر غیر مبدل اور مستحکم نظر آتی ہیں۔ مگر گہرائی میں جانے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قرآن ایک بالکل قدرتی انداز میں ہدایت و تعلیم دیتا اور رہنمائی کرتا ہے: بہت سی پختہ مثالوں پر غور و فکر سے زیادہ عام تعلیم یا درس ملتا ہے۔

> ''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کیلئے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔'' (۸:۶۰)

> ''اے نبیؐ تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہے؟ (کیا اس لئے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کیلئے اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہی علیم و حکیم ہے۔ (اور یہ معاملہ بھی قابل توجہ ہے کہ نبیؐ نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا اور اللہ نے نبی کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی) کو خبردار کیا اور کسی حد تک درگزر کیا۔ پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا

Marfat.com

آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا "مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے.....اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جن کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔"......(۶۶:۱۔۳،۶)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو لازم ہے کہ تمہارے مملوک اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لئے پردے کے وقت ہیں۔" (۲۴:۵۸)

"(ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کرو۔ (۵:۸۹)

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا" (۱۰۵:۱۔۵)

"چونکہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا" (۷۴)(۱۰۶:۱۔۴)

پہلی آیت میں مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ بیشک اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو کسی نیک اور اچھے مقصد کیلئے جدوجہد کرتے ہیں اور انہیں جنگ کے لئے بغیر تیاری کے نہیں جانا چاہئے۔ بلکہ

Marfat.com

انہیں ہتھیار حاصل کر کے انہیں استعمال کرنا چاہئے اور عسکری برتری کیلئے جنگی حکمت عملی کی جانب بھی پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے مگر امہ کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کیلئے تجربہ کار گھوڑ سوار سپاہیوں کے دستے ہونے چاہئیں تھے مقصد فتح ونصرت کے حصول سے بھی بالاتر تھا: طاقتور دشمن (جانے پہچانے یا اجنبی) کا راستہ روکنے کیلئے خوف وہراس پھیلانا ضروری تھا تاکہ ظلم اور خون ریزی کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔

آنحضرت ﷺ کی گھریلو زندگی کی مثالیں اس بات کو واضح طور پر پیش کرتی ہیں کہ ہمارے خاندان صرف ایک خدا کی عبادت کے لئے نہایت اہم اور نادر مواقع فراہم کرتے ہیں جن میں ہماری نشوونما، زوال پذیری اور نیتوں کی بہت مشکل آزمائشیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو نبیؐ سے باز پرس ہو جاتی ہے کہ آپؐ نے اپنی بیویوں سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی قسم کیوں کھائی۔ بظاہر تو جو واقعہ پیش آیا اس کیلئے یہ ایک انتہائی سخت اقدام تھا۔ اور دوسری جانب نبیؐ کی بیویوں کی سرزنش ہوئی کہ انہوں نے اپنے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور گھریلو فضاء کو مکدر بنایا۔ اس طرح کی آزمائشیں تو آتی رہتی ہیں اس لئے اللہ نے بار بار ہمیں یاد دلایا ہے کہ وہ معاف کر دینے والی ذات ہے اس کے بعد تنبیہہ آجاتی ہے۔

اگلی آیت میں ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بیشک تمام تمدنوں میں بعد دوپہر کا قیلولہ نہیں کیا جاتا مگر ہمیں اپنے کنبوں میں خلوت اور شرم وحیا کے چند اصولوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ قرآن پاک کے بہت سے احکامات اور قوانین غلامی کے خاتمے کی جانب واضح اور صاف صاف اشارے کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک امہ کے افراد کے ہمیشہ یہ خجالت رہے گی کہ غلامی کو ہی سب سے آخر میں منسوخ کیا گیا اب جبکہ غلامی مکمل طور پر ختم کر دی گئی ہے بہت سے جدید مسلمان مصنفین نے قرآن پاک کی ان سورتوں کو پڑھا ہے جن میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ ایک قرض تلے دبے ہوئے مرد یا عورت کو قرض سے نجات دلانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو غلامی سے آزاد کرانا۔ اور ایسا کرنا کسی عہد کو توڑنے کا کفارہ یا ہرجانہ ادا کرنے کے مترادف ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ سورۃ ۱۰۵ اور ۱۰۶ آج کے اس دور کے حوالے سے بہت زیادہ موزوں اور مناسب نظر نہ آئیں مگر یہ وہ سورتیں ہیں جو حجاج کرام کو بہت یاد ہوتی ہیں جو خانہ کعبہ کی سمت جانے کیلئے مکہ کی گرد آلود سڑکوں پر اترتے ہیں۔ پرہیبت اور نہایت

Marfat.com

سادہ ارضی منظر سے گھرا ہوا ہر طرح کے تصنع اور بناوٹ سے پاک، روشن روشن کعبہ یوں استادہ نظر آتا ہے جیسے پتھر کے اندر خوبصورت گوہر جڑ دیا گیا ہو جسے اللہ نے تیار کر کے یہاں محفوظ کر دیا ہو اور ایسی جگہ رکھ دیا گیا ہو جو دنیا کے کسی معروف (دنیاوی لحاظ سے) اور قابل ذکر شہر میں بھی نہ ہو اور جہاں دنیا کے کونے کونے سے حجاج کرام کھچے چلے آتے ہوں۔ یہاں آکر ہم ذاتی طور پر اور بڑی شدت کے ساتھ اس تجربے سے گزرتے ہیں کہ ہم یہ محسوس کر سکیں کہ ہم واقعی اللہ کے اس لازوال کائناتی منصوبہ کا ایک حصہ ہیں۔

مسلمان ہمیشہ سے قرآن کی تلاوت کرتے چلے آرہے ہیں نہ صرف اس لئے کہ یہ ان کی خواہش ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ قرآن کا پیغام ان کی فوری حاجتوں اور مشکلات میں نفوذ اور سرایت کر جاتا ہے چنانچہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں ساتویں صدی کے عرب مسلم شارحین و مفسرین وقتی طور پر علیحدہ ہوتے جاتے ہیں وہ اتنا ہی قرآن کی کامل سبقت اور مطلق معقولیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اگر اس نقطہ نظر سے اتفاق کر لیا جائے تو ان آیات پر کسی انسان کا کیا ردعمل ہوسکتا ہے جن سے میں نے اس حصے کا آغاز کیا تھا؟ اسلام کی پہلی نسلوں میں تعداد نسبتاً کم مگر تقویٰ اور پرہیز گاری میں بہت پرجوش مسلمانوں کیلئے یہ بات بڑی مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ تاریخ میں جو کچھ مذکور ہے اس سے کافی حد تک مختلف پر ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے یہ ہزاروں بڑی اور باریک جذباتی تفصیلات کا مجموعہ ہے جو سیرت رسول ﷺ سے متعلق ہیں۔ اس وقت جو لوگ عالمانہ اور فاضلانہ تحقیق کی جانب مائل تھے ان کیلئے یہ نہایت قدرتی اور واضح جواب تھا۔

اس ابتدائی ارتقاء اور انکشاف کی پیش بینی قرآن پاک بھی کرتا ہے اور صرف ان ہی آیات میں نہیں کرتا جن کا حوالہ میں دے چکا ہوں۔ مثال کے طور پر درج ذیل کسی حد تک متضاد معنوں والے حوالے ملاحظہ فرمایئے:

> ''نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو، اپنے گھروں میں ٹک کر

Marfat.com

رہو اور سابق اور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔''
(۳۳:۳۲۔۳۳)

''اے نبیؐ ہم نے تمہارے لئے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کئے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ چچازاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لئے ہبہ کیا ہو اگر نبیؐ اسے نکاح میں لینا چاہے یہ رعایت خالصتاً تمہارے لئے ہے، دوسرے مومنوں کیلئے نہیں ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کی ہیں۔'' (۳۳:۵۰)

ان دونوں آیات میں محمد ﷺ کی مثال کو درجہ کمال پر پیش کیا گیا ہے مگر ان میں ساتھ ہی محتاط رہنے کی تلقین بھی کی گئی ہے کہ ایسا کرتے وقت احتیاط برتو، آنحضرت ﷺ کے مقام و مرتبے کو نظر میں رکھتے ہوئے، آپ کے خاندان، صحابہ کرامؓ اور عہد کو سامنے رکھ کر سوچ سمجھ کر ایسا کرو۔ جہاں تک ان آیات کا تعلق ہے جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ''ہمارے رسول ﷺ پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔'' وہ اس تلقین اور تنبیہہ کی پیروی کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان کیلئے بہت سخت تنبیہ فرمائی گئی ہے جو اس کے برعکس کرتے ہیں۔ ''اور اگر تم پیٹھ پھیر لو گے تب بھی ہمارا رسول صاف صاف حق پہنچا دے گا۔'' اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جب حق پہنچا دیا گیا تو اب ساری کی ساری ذمہ داری ہر شخص کے اپنے کاندھوں پر ہے کہ وہ اس پر کہاں تک عمل کرتا ہے۔ ان آیات کو ان بہت سے حوالوں کی نسبت جن میں پیغمبر ﷺ کی اطاعت پر اور ان بہت سے بیانات پر زور دیا گیا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ محمد ﷺ کو معلم بنا کر مبعوث کیا گیا تھا تاکہ وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیں، زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم دینے میں صرف متن اور نفس مضمون کو ہی منتقل نہیں کرنا ہوتا اس میں کوئی اور ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے: اس میں تشریح اور تصریح اور عملی

Marfat.com

مظاہرے کی بھی ضرورت ہے۔ عام طور پر مسلمان محمد ﷺ کی تعلیمات کو آپ کا رہنما ترکہ اور میراث تصور کرتے ہیں اور اس کے مطالعے اور تفہیم کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی اہمیت ابتدائی عہد کی نسلیں دیتی تھیں۔ میری رائے میں یہ نقطہ نظر قرآن سے مکمل مطابقت رکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کو بت بنا کر ان کی پرستش سے منع کرتا ہے مگر ایک مثالی انسان کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے ابھی ایک اور موقعہ اور محل کی مناسبت سے بہت اہم سوال باقی ہے: کیا یہ واقعی سچ ہے کہ ہر حدیث جو عالمانہ اتفاق رائے سے پرکھ لی جائے مستند ہوتی ہے؟

سچ کا سوال

''مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا کہ نبیؐ نے یہ کہا۔''

''مگر میرے بھائی وہ صحیح حدیث۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے، مگر کیا تمہارے خیال میں یہ بالکل سچی ہے؟''

''یہ صحیح ہے! اگر تم کسی ایسی حدیث کو جو ''صحیح'' کی درجہ بندی میں آتی ہو تسلیم نہیں کرتے تو پھر تم مسلمان نہیں۔''

''مگر اسلام لانے سے پہلے مجھے اس کے بارے میں کسی نے کیوں نہیں بتایا؟''

جلد ہی زیادہ تر مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی ایسی روایت کے بارے میں جسے علماء کی اتفاق رائے پر مبنی حمایت حاصل ہو، شک کرنا اپنے ایمان میں رخنہ ڈالنے کے برابر ہے اس طرح سے وہ اتنے سخت اصول کی تاویل پیش کرنے پر اُکساہٹ محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے کہ صدیوں کی تحقیق کے دوران مسلم روایت پرستوں سے ایسی کوئی لغزش کبھی نہیں ہوئی ہوگی کہ ایسی کوئی غلط بات ان کی نظر میں نہ آئی ہو اور جو اپنی انسانی کوشش کی راستبازی کو نزول قرآن کے قریب تر لانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں مسلم قانون دانوں اور علماء کے عام اصول اور فعل صحیح روایات کے تصور کے خلاف جاتے ہیں۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ وہ لوگ جو اسلامی فقہ میں تخصص حاصل کرتے ہیں

Marfat.com

وہ مستند روایات کی سند یا ثبوت کوقرآن کے بعد دوسرا درجہ دیتے ہیں اور یہ لوگ بھی روایات میں جعل سازی اور کذب کی آمیزش کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی یکساں طور پر اہم ہے کہ اسلام میں ''صحیح روایات'' کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے مگر پھر بھی فارغ التحصیل اور قابل ماہرین نے اپنے اسلام کو خطرے میں ڈالے بغیر ان روایات کو چیلنج کرنے کا حق محسوس کیا ہے جو عام طور پر مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ایسا اب تک ہوتا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ابوالحسن علی الدارقطنی (وفات ۳۸۵ سن ہجری) نے اپنی کتاب ''کرٹیسزم اینڈ انویسٹی گیشن'' (تنقید و تحقیق) میں مستند احادیث کے مجموعوں میں شامل دو روایات کے قابل بھروسہ ہونے کو چیلنج کر دیا تھا۔ ''سٹینک ورسز'' (شیطانی آیات) کا واقعہ جس میں یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ مکہ کے بت پرستوں کو جس طرح گوارا اور قابل قبول تھا آنحضرت ﷺ نے اپنے پیغام کو اسی طرح پیش کرنے سے مصالحت کر لی تھی۔ اسے مسلم قدامت پرستوں نے بالکل خودساختہ اور فرضی ثابت کیا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح بخاری میں ہے۔ مشہور و معروف سکالرز مثلاً البقینی، الجوینی اور الغزالی صحیح بخاری کی ایک حدیث کو رد کر کے اسے غیر صحیح اور نادرست ٹھہراتے ہیں۔ (۷۵)

ابن الملقن (وفات ۸۰۴ ہجری) نے صحیح بخاری میں شامل ایک حدیث کے بارے میں کہا: ''یہ ایک غریب حدیث ہے اگر امام بخاری نے یہ حدیث اس مجموعے میں شامل نہ کی ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔'' (۷۶) حال ہی میں محمد علی نے صحیح بخاری ہی کی ایک حدیث کو چیلنج کیا ہے جس میں زانی اور حرام کار کو سنگسار کر دینے کا ذکر ہے۔ (۷۷) اسی ماخذ میں شامل ایک اور حدیث کی فضل الرحمٰن نے گرفت کی ہے جو عورتوں کے بارے میں ہے کہ جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی۔ (۷۸) اس سب کے باوجود سکالرز میں سے کسی نے بھی اپنی تنقید کی وجہ سے اسلام کو مسترد نہیں کیا۔

مسلم جمہور میں روایات کی سچائی ایک بہت معقول عقیدہ ہے۔ یہ دور تقلید سے باقی ہے جب فقہ میں آزاد استدلال یا دلیل و حجت کے دروازے بند تھے اور چاروں اسلامی فقہ کے مدارس کے صادر کردہ قانونی فیصلوں کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ (۷۹) جن احادیث کو ''صحیح'' کے درجے میں شامل کیا جاتا ہے ان کی مجموعی طور پر صداقت و راست بازی کو تسلیم کرتے وقت مسلم علماء نے ہمیشہ انفرادی سطح پر احادیث کی صداقت اور استناد پیش کیے جانے کو

Marfat.com

چیلنج کرنے کی آزادی دی ہے۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں اور بیشک ان کا جواز بھی بنتا ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ احادیث کے مجموعوں میں ممکنہ نقائص موجود ہیں تو کیا رہنمائی کے ایک وسیلے کی شکل میں ان کی موجودہ حیثیت میں کمی نہیں آجائے گی؟ کیا اس قسم کا عقیدہ ان غلطیوں کا راستہ نہیں کھول دیتا جو نادرست معلومات پر مبنی ہوں؟

سب سے پہلے تو ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ وحی یا کلام الٰہی کے لئے انسانی ردعمل میں اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ اس میں کوئی کمی یا نقص نہ رہ جائے اس کیلئے بحیثیت انسان کچھ بشری حدود ہوتی ہیں۔ اس سے پیوستہ ہمیں اس بات کا احساس بھی ہونا چاہئے کہ مسلم سکالرز کا زیادہ تر پرتاثیر اور زوردار کام جوامت مسلمہ کے ابتدائی عہد سے شروع ہوا تھا، وہ تھا آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کو مثال بنا کر معلومات جمع کرنا، ان کی اشاعت کرنا اور اسی مثال کی کسوٹی پر حاصل شدہ معلومات کو پرکھنا اور جانچنا، جو بے شک قرآن کے احکامات کی تعمیل کے طور پر تھا۔ خصوصاً اس فرمان خداوندی کے جواب میں کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔'' یہ کوئی منتشر انفرادی ردعمل نہیں تھا بلکہ ایک اجتماعی جواب تھا جس میں سوال و جرح، تقابل اور تنقید کو شامل کیا گیا تھا۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کی پہلی چند صدیوں کے دوران زندہ ہوتے تو یقیناً ہم میں سے کوئی بھی یہ شک نہ کرتا کہ یہ کوشش درست، معقول اور وحی خداوندی کے عین مطابق تھی۔

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو'' کے حکم کے ابتدائی جواب کو ہم یقیناً آج بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمیں متاثر کرتا ہے اس لئے کہ ہم ان کے طور طریقے آلات کار اور نتائج ورثے میں پائے ہیں اور کیونکہ کوئی بھی ایسی تشریح وتصریح سنجیدگی سے نہیں لی جائے گی جو اس پہلے ردعمل یا جواب پر غوروفکر سے پہلوتہی کرتی ہو۔ مستند اسلامی قانون درج بالا اعتراض سے آگاہ تھا اس لئے اس نے فیصلہ کرنے کے عمل تک پہنچنے کیلئے ترتیب وار طریقے وضع کئے۔ اس نے قرآن کو اولیت دی، پھر سنت رسول ﷺ کو لایا پھر ان سے حاصل شدہ مطابقت اور تمثیلات کو اور آخر میں آزادانہ رائے کو جگہ ملی۔ ان ترجیحات کے درمیان کی حدود بعض اوقات عملی زندگی میں دھندلی نظر آتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ ایک دوسری کو ڈھانپ لیتی ہیں پھر یہ بھی

Marfat.com

ہے کہ ایک نسل کے مسلمان جہاں تک اس ماڈل اور مثال کو عملاً اختیار کرنے کا تعلق ہے پہلے کی نسلوں کے مسلمانوں پر تنقید کر کے ان کے کاموں کا جائزہ لے کر نتائج سامنے لانے کی کوشش کریں گے۔ مگر ان ترتیب وار طریقوں سے وہ یہ سمجھے کہ وحی کی روح تک پہنچنے اور اس پر عمل کرنے اور ان مثالوں کو نشان راہ بنانے کیلئے ذرائع اور وسائل کی ایک درجہ بندی تھی اور ان مثالوں پر عمل گناہوں سے بچنے کیلئے بہترین ممکنہ ضمانت تھی۔ یہ تشکیل تیسری اسلامی صدی کے آغاز میں ایک معیاری اسلامی دستور بن گئی تھی۔ اور دلیل کی قوت کے سہارے اس وقت سے اب تک اپنا اثر و رسوخ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ قرآن تک ایک منطقی رسائی کی جامع شکل رکھتی تھی اور اس کے ذریعے مسلم امہ کے اس پر ردعمل کی تاریخ تک بھی پہنچنا ممکن تھا۔

محمد ﷺ کون ہیں؟

تمام مسلمانوں کیلئے اس سوال سے کیا مراد ہے، اس کا مفہوم کیا ہے اور اس سوال تک مزید نئے سوالات سے کس طرح پہنچا جا سکتا ہے اس باب میں اسی موضوع پر کچھ خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ کسی دوسرے طرز عمل اور کردار کو اپنے لئے نمونہ بنانے کیلئے ہمیں کس حد تک اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہوتا ہے کہ ہم بھی کسی حد تک اس جیسے نظر آئیں۔ اس قسم کی مطابقت ہماری اور اس شخصیت کے ساتھ اس طرح پیوستہ اور جڑی ہوئی ہے کہ اس سوال کے جوابات کا انحصار ایک مسلمان پر ہے اور اس مرد یا عورت کی زندگی کے اس حصے پر جس پر وہ پہنچ چکے ہیں۔ ایک جیسی سمجھ بوجھ اور تفہیم کی وجہ سے تمام جوابات ایک دوسرے کو منقطع کر سکتے ہیں لیکن بہت سا منفرد اور بے مثال علم و ادراک باقی رہ جائے گا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ محمد ﷺ کے بارے میں میرا وجدان بہت گہرا ہے اور آٹھ سال پہلے کی نسبت آج یہ علم و ادراک اور شعور غالباً زیادہ حقیقی ہے حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ابھی مجھے آپؐ کے بارے میں مزید بہت کچھ جاننا ہے۔

ابھی اسی وقت اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں کچھ بیان کروں تو میں جو کچھ کہوں گا وہ واٹ نے جو اوپر کہا ہے اس کے قریب تر ہوگا۔ میرا قیاس یہ ہے

کہ محمد ﷺ کو اپنے مقلدین کی طرف سے عزت واحترام اس لئے ملا کہ انہوں نے آپؐ کی ذات میں ایک عرب رہنما کی روایتی کامل ترین صورت دیکھی ہوگی: ”وہ جو اپنے عزیز واقارب کے ساتھ اچھے مراسم رکھتا ہے، غریبوں اور ناداروں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد کرتا ہے، مہمان نواز ہے اور مہمانوں کی آؤ بھگت بڑی فیاضی سے کرتا ہے اور جو لوگ کسی ناگہانی بلا میں مبتلا ہو جائیں ان کے کام آتا ہے۔“ (۸۰) جیسا کہ روایات میں بتایا گیا ہے، وہ قابل اعتماد ہوتا ہے، قوت برداشت رکھتا ہے، باہمت اور باحوصلہ ہوتا ہے، اس لئے کہ جس شخص میں اتنے سارے اوصاف نہ ہوں عرب اسے بطور رہنما قبول نہیں کرتے۔ اس کی قوت فیصلہ اور کسی کام کو کرنے کا عزم فولاد کی طرح سخت ہونا چاہئے تھا تاکہ جب کبھی وہ کسی بات کا فیصلہ کرلے تو پھر اس کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آنے پائے اور وہ اس کام کو تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لے۔ اسی سے وہ اپنے ساتھیوں کا مکمل اعتماد حاصل کرسکتا تھا۔

مگر نبی کو تو اللہ نے منتخب کیا تھا، اور اسے اپنے ماننے والوں کی محبت بلاکوشش حاصل ہوگئی تھی۔ اس نے معاشرے اور تاریخ دونوں کو بدلنا تھا وہ تو بلاشبہ عربوں کے مثالی لیڈر و رہنما سے بھی کہیں زیادہ عظیم تھا۔ اس میں دوسروں کے لئے فکرمندی، رحم و ہمدردی اور وہ روحانیت ہونی چاہئے تھی جو ہم میں اس قدر کم ہوتی ہے کہ ہم اس کا آپؐ کے ان اوصاف سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔ یقیناً آپؐ نازونعم سے نہیں پلے تھے: آپؐ اللہ کے احکام کی تعمیل تیزی سے اور غیر جانبدارانہ طور پر کراسکتے تھے۔ ایک بار آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے ایک ایسی خاتون کی وکالت کی جو چوری کی مرتکب ہوئی تھی، وہ آنحضور ﷺ سے اس کیلئے قانون میں نرمی چاہتے تھے، آپؐ نے ایسا کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا اگر ان کی نہایت چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ بھی ایسے جرم کا ارتکاب کرتیں تو حضور ﷺ ذاتی طور پر یہ چاہتے کہ بیٹی کا ہاتھ قلم کردیا جائے۔ (۸۱) دوسری طرف اگر کسی معاملے میں شک کی ذرا سی بھی گنجائش نکل آتی یا معافی کا کوئی راستہ نظر آتا تو آپؐ اس کا فائدہ مجرم کو اٹھانے کا موقع فراہم کرتے۔ اور یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مثلاً ایک بار آپؐ نے ایک زانی کو تین مواقع دیئے کہ وہ اعتراف گناہ سے پھرنا چاہے تو پھر جائے یا آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان فرمادیا تھا۔ (۸۲)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ یہ جاننے میں بھی بہت حساس تھے کہ اپنے اردگرد کے مسکینوں اور یتیموں کو اپنے سمیت کیسے اور کب بلند کرنا ہے اور ایسا کرنے میں پوری دیانتداری کا ثبوت دینا ہے۔ حنین میں فتح ونصرت کے بعد یہ بات آنحضرت ﷺ کے علم میں آئی کہ انصار جنہوں نے آپ کو پناہ دی تھی اور اس وقت مدد کی تھی جب کوئی دوسرے مدد نہیں کر رہے تھے اور جنہوں نے نہایت نازک زمانے میں آپؐ کے پیغام کا دفاع کیا تھا اس وقت بے توقیری کے نشانہ بنتے محسوس کر رہے تھے جب حضور ﷺ نے مکہ کے نومسلموں کو ان سے زیادہ اہمیت اور التفات بخشا حالانکہ یہی اہل مکہ ماضی میں مال غنیمت کی تقسیم کے وقت حضور ﷺ کے نہایت بے رحم اور سنگدل دشمن تھے۔ ان میں اس قسم کے تاثرات پھیل گئے تھے کہ اپنی آخری فتح کے بعد محمد ﷺ کی ساری توجہ اور محبت مکمل طور پر اپنے عزیز واقارب کی طرف لوٹ جائے گی۔ آنحضرت ﷺ نے ایک پرائیویٹ اجلاس بلایا جس میں انصار کو مدعو کیا گیا تھا۔ حضور ﷺ ان سے یوں مخاطب ہوئے:

''مجھے بتایا گیا ہے کہ قریش کے سرداروں کی جانب میری ظاہری جانبداری سے آپ لوگ ناراض ہیں'' ''جی ہاں'' انصار نے جواب دیا۔

''ہم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔'' انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ پھر نبیؐ نے فرمایا: ''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ میں اس وقت تم لوگوں کے درمیان آیا تھا جب تم بھٹکے ہوئے تھے؟ پھر اللہ نے تم لوگوں کو صراط مستقیم دکھایا، تم مفلس و نادار تھے اس نے تمہیں خوشحال بنایا۔ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے تمہاری تلواریں میانوں میں نہ جاتی تھیں، اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے محبت پیدا کردی۔''

خجالت وشرمندگی کی وجہ سے ان لوگوں نے سر جھکا رکھے تھے، سب نے جواب دیا کہ جو حضور ﷺ فرما رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ ''تم لوگ مختلف جواب دے سکتے تھے اور تمہیں اس کا حق حاصل تھا۔ تم کہہ سکتے تھے کہ میں اس وقت تم لوگوں کے پاس آیا تھا جب میرے اپنوں نے مجھے جھٹلا دیا تھا اور یوں مجھے رد کر دیا تھا۔ اور یہ تم لوگ تھے جنہوں نے میرا استقبال کیا میں اس وقت تم لوگوں کے پاس آیا تھا جب کوئی بھی میری مدد کرنے کو تیار نہ تھا اور تم لوگوں نے میرا ساتھ دیا تھا۔ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا گیا تھا مگر تم لوگوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ اے انصار! کیا

Marfat.com

اس بات نے تمہارے دل و دماغ میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں کہ میں نے دنیاوی مال و دولت کا ایک حصہ صلح کی خاطر دے دیا تھا اور اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ تمہارا انعام تو اسلام کی شکل میں تمہیں مل چکا تھا۔ اے انصار! کیا تم لوگ مطمئن اور خوش نہیں ہو کہ تم اپنے گھروں کو پیغمبر خدا کو لئے جا رہے ہو جبکہ دوسرے اپنے گھروں کو بکریاں اور اونٹ لئے جا رہے ہیں؟ اللہ کی قسم، جس کے قبضے میں میری روح ہے اگر تمام لوگ ایک راستہ اختیار کریں اور انصار دوسرا تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا!'' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جس لمحے آنحضرت ﷺ نے اپنا خطاب ختم کیا، سامعین میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک اٹھے۔ (۸۳)

آٹھ برس گزرنے کے بعد میرے شعور میں آج بھی محمد ﷺ کے بارے میں جمالیاتی کیفیت میری ذات کا حصہ بن چکی ہے۔ اگر حضور ﷺ کی بیویاں ایمان والوں کی ماؤں کا درجہ رکھتی ہیں تو پھر آنحضرت ﷺ بھی ان کے لئے مثل باپ کے ہیں۔

عزت واحترام کے ملے جلے جذبات کے اظہار کیلئے یہ ایک لفظی علامت ہے جسے کم از کم میں ایک نہایت موزوں لفظ سمجھتا ہوں، اس میں آپؐ کی ذات اقدس کا سارا جلال و جمال آ جاتا ہے جسے میں اپنے لئے سرمایۂ حیات تصور کرتا ہوں۔

حواشی

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی: ٹو ورڈز انڈرسٹینڈنگ اسلام۔ ترجمہ: خورشید احمد (اسلامک ٹیچنگ سینٹر ۱۹۷۷ء، محمد حمید اللہ، انٹروڈکشن ٹو اسلام، اسلامک کلچر سینٹر، ۱۹۹۶)

(۲) حنا ای کیسز: اے کنکارڈینس آف دی قرآن (برکلے: یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، ۱۹۸۳)

(۳) ہیکل: دی لائف آف محمد ﷺ، ترجمہ: اسماعیل الفاروقی ص (۲۸۵۔۹۸) ''اے نبیؐ یاد کرو جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم احسان کیا تھا کہ ''اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر، اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔'' (۳۳:۳۷)

(۴) برمحل سورتیں درج ذیل ہیں:

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا

Marfat.com

خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو؟
جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو
تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا
ہے اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے
اسے قبول کرے۔'' (۸۰:۱۔۸)

(۵) ہیکل: دی لائف آف محمد ﷺ : (۴۳۸۔۲۴) ''اے نبیؐ تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہے؟ (کیا اس لئے کہ) تم اپنی بیوی کی خوشی چاہتے ہو؟'' (۶۶:۱)

(۶) مسلم مفسرین نے زیادہ تر یہودی اور مسیحی ماخذ پر انحصار کیا ہے اور ان واقعات کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن میں اشاروں کنایوں میں بیان ہوئے ہیں میں ذاتی طور پر قرآن کے بالقصد (بظاہر) دُھندلے یا غیر واضح اسلوب کو ترجیح دیتا ہوں جس میں صرف ضروری تفاصیل شامل کی گئی ہیں جس میں غیر مفصل اظہار بیان کو اپناتے ہوئے نہایت اہم پند و نصائح کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

(۷) ہم بعد میں دیکھیں گے کہ قرآن ایک ایسے انسان کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے جو مثالی ہو اور جس کا اسوہ حسنہ قابل تقلید بن سکے۔ تاہم اسلام اس ضرورت کو اس لحاظ سے بھی خوب جانتا ہے کہ اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو یہ بت پرستی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پورے قران میں ان دو کے درمیان تناؤ برقرار رکھا گیا ہے۔

(۸) بہت اہم استثنات کم ہیں: بسیا ایبٹ، سٹڈیز ان عریبک لٹریری پاپیری جلد اول ''ہسٹارک ٹیکٹس'' (شکاگو ۱۹۵۷) اور جلد دوم: قرآنک کمنٹری اینڈ ٹریڈیشن (شکاگو ۱۹۶۷) صہیب اتچ عبدالغفار، کرٹسزم آف حدیث امنگ، مسلم ود ریفرنس ٹو سنن ابن ماجہ (آئی ایف ۱۹۸۴) محمد ایم عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر: ۱۹۲۷) محمد زبیڈ صدیقی، حدیث لٹریچر (کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۶۱ء)

(۹) محمد اسد، صحیح البخاری ارلی ایرز (جبرالٹر: دارالاندلس پبلشرز، ۱۹۸۱) ص ۲۳

(۱۰) جے شاخت: اورجنز آف محمڈن جوریسپروڈنس (آکسفورش: ۱۹۵۳ء) ۴۱۔۵۷ (۱۱)

(۱۱) عبدالغفار، کرٹسزم آف حدیث امنگ مسلم ۳۲۔۴۸

(۱۲) علم حدیث پر تنقید کے سلسلے میں مغربی ماہرین کا نقطہ نظر مختلف رہا ہے۔ ان کے خیال میں مطالعہ حدیث معیار بند نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اسناد کا نظام دوسری اسلامی صدی کے دوران اتنا ترقی یافتہ تھا جتنا آج ہے۔ عظمی روایتی مسلم نقطہ نظر کے دفاع میں لکھتے ہیں اور اس قدر مہارت اور دستاویزی ثبوت دے کر کہتے ہیں کہ مجھے یہ بیان دینا پڑا حالانکہ جنبل کا حالیہ کام شائع ہو چکا ہے۔ دیکھئے

عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر ۱۹۶۸، جی ایچ اے جنبل، مسلم ٹریڈیشن (کیمبرج: یونیورسٹی پریس ۱۹۸۳)

(۱۳) عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر ۳۰۱

(۱۴) ایضاً ۳۰۵

(۱۵) صدیقی، حدیث لٹریچر: ۱۲۶۔۱۲۷

(۱۶) ایضاً ص ۱۷۰

(۱۷) جی ایچ جنبل دی اتھنٹسٹی آف دی ٹریڈیشن لٹریچر: ڈسکشنز ان ماڈرن ایجپٹ (لیڈن: اے جے برل، ۱۹۶۹ء) ۹۶۔۱۲۹ یہاں وہ اس نظریے کو چیلنج کرتا ہے۔

(۱۸) شاخت، دی اورجنز آف محمڈن جیورسپروڈنس، ۱۱۔۲۰

(۱۹) صدیقی، حدیث لٹریچر ۱۳۹

(۲۰) کینتھ کریگ، جیسیز اینڈ دی مسلمز (لندن: جارج ایلن اینڈ یونون ۱۹۸۵ء) ۹۱

(۲۱) شاخت: دی اورجنز آف محمڈن جیورسپروڈنیس ۹۸۔۱۳۷

(۲۲) ہربرٹ جی مے اینڈ بروس، دی نیو آکسفورڈ اینویسٹڈ بائبل ...... (آکسفورڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۷۷ء) ۱۱۶۹

(۲۳) ایضاً ۱۱۶۷

(۲۳) ایضاً دیکھئے ۱ اور ۲ کے تعارف تھیسنکیون اور ططس

(۲۴) ایضاً ص ۱۱۶۷

(۲۵) جین ڈورے، دی سیکرٹ بکس آف دی ایجنیز ناسٹکس (نیویارک: وکنگ پریس ۱۹۶۰ء)

(۲۶) مے اینلمینز جردی نیو آکسفورڈ اینویسٹڈ بائبل، ۱۴۴۲)

(۲۷) سلیمان ایس ندوی، محمد دی آئیڈیل پرافٹ (محمدؐ: مثالی پیغمبر) ترجمہ: محی الدین احمد (لکھنو انڈیا، اسلامک ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء)

(۲۸) صحیح بخاری، ترجمہ: محمد محسن خان، جلد دوئم، ص، ۳۱۳، ۳۱۴

(۲۹) ڈبلیو منٹگری واٹ، محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹس مین (لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۷۸ء) ۲۲۹۔۲۳۱

(۳۰) مثال کے طور پر دیکھئے، محمد علی، محمدؐ دی پرافٹ (لاہور: ۱۹۸۴ء) ہیکل: دی لائف آف محمدؐ ترجمہ:۔ اسماعیل الفاروقی۔

(۳۱) ولیم میور، لائف آف محمد ﷺ، دوسرا ایڈیشن ۱۸۹۴ء)

(۳۲) دیکھئے باب چہارم، ارتداد پر بحث۔

Marfat.com

(۳۳) علی محمد، محمد ﷺ دی پرافٹ (لاہور۱۹۸۴ء) ۳۲۵-۴۴

(۳۴) واٹ، محمد ﷺ ۱۰۴

(۳۵) گولڈز یہر، مسلم سٹڈیز (لندن، جارج ایلن اینڈ یونون لمیٹڈ ۱۹۶۷ء)

(۳۶) ایضاً ۴۵-۵۴

(۳۷) محمد قطب، اسلام: دی مس انڈرسٹڈ ریلیجن (کویت آئی آئی ایف ایس او ۱۹۸۴ء)

(۳۸) دیکھئے مرد اور عورتوں کے فرائض منصبی کا کردار پر بحث باب چہارم میں۔

(۳۹) گب، محمڈنزم، ۵۰۔

(۴۰) محمد زبیر صدیقی: حدیث لٹریچر (کلکتہ۔کلکتہ یونیورسٹی، ۱۹۶۱) ص ۱۳۴ جہاں ان بہت سے مغربی سکالرز کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس نقطہ نظر سے متفق ہیں۔ لیون کیطانی، جے ہوروِز اینڈ جے رابسن۔

(۴۱) میور، لائف آف محمد ﷺ، دیباچہ صفحہ۔(xxx-vii)

(۴۲) گولڈز یہر، مسلم سٹڈیز ii (لندن: جارج ایلن اینڈ یونون لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء)

(۴۳) صدیقی، حدیث لٹریچر ص xxi - xxviii دیباچہ

(۴۴) ایبٹ، سٹڈیز ان عریبک لٹریری پیپری جلد اول، دوئم۔ عبدالغفار، کرٹسزم آف حدیث امنگ مسلمز، عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر ۱۹۶۸ء صدیقی، حدیث لٹریچر۔

(۴۵) دیکھئے ایبٹ، سٹڈیز ان عریبک لٹریری جلد اول اور دوئم۔ عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر، ۲۸-۱۰۶ جہاں مصنفین تفصیلی دستاویزی ثبوت قبل از کلاسیکی حدیث لٹریچر کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ مغربی ناقدین نے مسلم سکالرز پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ابتدائی اسلامی عہد کی بہت سی احادیث کی صداقت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں ناتجربہ کار ہیں جسے انہوں نے علم حدیث کے ارتقاء کے حوالے سے سہارا دیا ہے۔ مگر ان کی طرف سے اس قسم کی تنقید میں دوہرے معیار کا عجیب وغریب وجود ملتا ہے۔ مستشرقین کے استدلال میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ضرورت کے تحت ایسا کہہ رہے ہوں اور یہ سب انہوں نے ابتدائی مسلم سکالرز کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا ہو۔ چنانچہ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے سامعین سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس متن اور اس کی تشریح وتصریح کو تسلیم کرلیں گے، جوان کے نظریات کو تقویت بخشتی ہوں۔ تاہم اس بات کا ضرور احساس ہونا چاہئے کہ جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ مسلمانوں کی ذہنی استعداد سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں بہ نسبت ان معلومات کے جو مغربی سکالرز کے توسط سے ہم تک پہنچی ہوں۔ بے شک ہم ابتدائی چار اسلامی صدیوں کے دوران کے مسلم مصنفین کے فراہم کردہ متون کو ان میں بے شمار من گھڑت باتوں کی ملاوٹ کی وجہ سے رد کر سکتے ہیں، یہ وہ متن ہیں جنہیں متضاد زاویہ ہائے نگاہ کا تعاون بھی حاصل ہے۔ یہ انسانی سطح پر ممکن نہیں نہ ہی یہ انسانی فطرت سے

Marfat.com

مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کا اخراج یا موقوفی مغربی سکالرز کو اس موضوع پر کئے جانے والے "صحیح اور درستی" کے دعوے سے محروم کردے گی۔

(۴۶) صدیقی، حدیث لٹریچر، (۱۹۹-۲۰۴)، عبدالغفار، کرٹسزم آف حدیث امنگ مسلمز (۳۰-۵۰)

(۴۷) گولڈ زیہر، مسلم سٹڈیز II، شاخت، دی اوریجنز آف محمڈن جیورسپروڈنس۔

(۴۸) طیطس بورک ہارٹ، این انٹروڈکشن ٹو صوفی ڈاکٹرائن، ترجمہ ڈی ایم میھن (ولنگ برو، یو کے تھارسنز پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء)

(۴۹) ایچ اے آر گب، محمڈنزم لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء) ۸۲-۸۵

(۵۰) جنبل، مسلم ٹریڈیشن۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے جنبل کی حیثیت ایک درمیانے آدمی کی نہیں سمجھی۔ مجھے یہ قابل ذکر کوشش نظر آئی کہ میں گولڈ زیہر اور شاخت کے خاص خاص فیصلوں کا دفاع اور تحفظ کروں اور ایسا کرتے وقت عظمیٰ اور ایبٹ کے کام کو پیش نظر رکھوں۔

(۵۱) جنبل، دی اتھنٹیسٹی آف دی ٹریڈیشن لٹریچر۔ جبکہ اس اعتراض کے صحیح ہونے کا ایک خاص جواز موجود ہے۔ اس طریقہ کار میں شامل مفروضے کلی طور پر ناقص اور بے دلیل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار یہ تسلیم کرلیا جائے کہ روایات کی ایک بڑی قسم بندی مشکوک ہے، جیسے وہ روایات جو مہدیؒ کی آمد کے بارے میں ہیں۔ تو اسی قسم کی دوسری روایات کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے کا ہمیں جواز مل جاتا ہے۔ حالانکہ تمام بڑے راوی اس حقیقت سے باخبر تھے کہ احادیث میں جعل سازی کے امکانات موجود ہیں جیسا کہ مستند احادیث کے مجموعوں میں ایسی روایات کی کمی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کوشش کر کے کسی سقم کی تلاش ہوسکتی ہے جو یا تو نظرانداز ہوگیا یا ناکافی اور غیرضروری سمجھا گیا۔ اس کے برعکس اگر روایات کی ایک بڑی تعداد ایک مخصوص قسم کی روایات میں مسلم ماہرین کے معیار پر پورا نہیں اُترتی ہیں تو خود بخود یہ فرض نہیں کرلینا چاہئے کہ اس خاص قسم بندی میں شامل روایات من گھڑت ہیں۔ پھر اگر ہم صداقت و استناد کی بات کو پس پشت ڈال دیں تو کئی روایات میں شامل من گھڑت مواد ہمیں بتا دے گا کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ذہنی میلان کیا تھے۔

(۵۲) ایضاً ۷۷-۹۵

(۵۳) ایضاً ۱۵-۶۱

(۵۴) ایضاً ۳۱-۳۲

(۵۵) ایضاً ۶۲-۶۴، ۱۰۴

(۵۶) ایضاً ۴۶-۴۸، ۶۱-۶۲

(۵۷) گولڈ زیہر مسلم سٹڈیز II، ۱۳۱

(۵۸) جنبل، مسلم ٹریڈیشن، ۹۶-۱۲۹

(۵۹) ایضاً ۲۰۶-۲۱۷

(۶۰) شاخت، دی اورجنز آف محمڈن جیورسپروڈینس، شاخت کے خیال میں یہ تو وہی بات ہے جو اس نے اپنی تحقیق کے دوران ص ۲۲۸ پر لکھی ہے۔

(۶۱) عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر، ۲۲۱

(۶۲) جنبل، مسلم ٹریڈیشن ۶۷-۶۸

(۶۳) ایضاً-۲۰۴

(۶۴) صدیقی، حدیث لٹریچر، ۱۶۵-۱۸۸

(۶۵) عظمی، سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر ۳۲-۳۳

(۶۶) ایڈورڈ سعید، اورینٹلزم (نیویارک، پنتھیان بکس، ۱۹۷۸ء)

(۶۷) جنبل، مسلم ٹریڈیشن ۹۸

(۶۸) شاخت، دی اورجنز آف محمڈن جیورسپروڈنس، ۱۷۲

(۶۹) ایضاً-۱۷۱-۱۷۵

(۷۰) جنبل، مسلم ٹریڈیشن، ۲۰۶-۲۱۷

(۷۱) عظمی-سٹڈیز ان ارلی حدیث لٹریچر، ۲۳۲-۲۳۶

(۷۲) جنبل، مسلم ٹریڈیشن ۲۱۴-۲۱۶ جنبل روایت پرستوں کی طرف سے منفی ثبوت کی تصدیق وتوثیق کی ضرورت کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اسے اس کی ایسی کوشش تصور کیا جانا چاہئے جس میں وہ تمام میسر آنے والے دلائل اور معلومہ صورتحال پر غور وفکر کرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔

(۷۳) فریڈرک ڈینی، اسلام اینڈ دی مسلم کمیونٹی (سان فرانسسکو: ہارپر اینڈ رو ۱۹۸۷ء) ۵-۶

(۷۴) دیکھئے اسد، دی میسج، ۲۲-۲۳ جس میں نظریہ تنسیخ آیات پر بحث کی گئی ہے علی بھی دیکھئے، دی ریلیجن آف اسلام، ۳۱-۴۵، جان برٹن، دی کولیکشن آف دی قرآن (لندن، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء) ۲۳۴-۲۴۰

(۷۵) القسطلانی، VII، ص ۱۷۳

(۷۶) ایضاً VIII ص ۴۰

(۷۷) علی، دی ریلیجن آف اسلام، ۷۵۶-۷۵۸

(۷۸) فضل الرحمٰن، ہیلتھ اینڈ میڈیسن ان دی اسلامک ٹریڈیشن (نیویارک: کراس روڈ، پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) ص ۱۰۵-۱۰۶

(۷۹) ایضاً-ص ۱۱۵-۱۱۶

Marfat.com

(۸۰) اسد، صحیح بخاری، ۲۰۷ یہاں ہم حضرت ابوبکرؓ کے ذکر میں ابن الداغنہ کی تحریر ان الفاظ میں پڑھتے ہیں پہلی وحی کے نزول کے بعد نبیؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو بے حد آرام پہنچایا۔ بظاہر یہ اسلامی عہد سے قبل ایک راست باز اور سچے انسان کی معروف تعریف تھی۔

(۸۱) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان، جلد پنجم ص ۴۱۶

(۸۲) علی، دی ریلیجن آف اسلام، ۲۱۴۔۲۲۱

(۸۳) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان جلد پنجم ص ۴۳۲۔۴۳۷ علی، دی ریلیجن آف اسلام ص ۲۲۷۔۲۲۸

Marfat.com

چوتھا باب

اُمّہ

''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا'' (۳:۱۰۳)

موسم گرما ختم ہونے کو تھا اور میں پہلی بار جلد کالج جانے والا تھا۔ میں سکول کے احاطے میں باڑ کے قریب بیٹھا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ میری ٹیم جو ایک جاری کھیل میں فاتح تھی کھیل کا آغاز کب کرتی ہے۔ عام طور پر کسی رات ہماری اطالوی باشندوں پر مشتمل ہمسائیگی سے پچاس کے قریب لڑکے شیریڈن سکول میں منڈلاتے رہتے تھے۔ مگر آج خلاف معمول صرف دس تھے۔ ایک کالا نوجوان لڑکا اپنے بائیسکل پر سوار میرے پاس آیا۔ ''جیف بہتر ہے تم گھر چلے جاؤ آج رات یہاں ہنگامہ ہونے والا ہے'' اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ تھی کہ تین ہی روز پہلے بہت سے نوجوانوں نے جو ہمارے ہمسائے تھے، بیرڈ سلے ٹیرس کے ایک کالے نوخیز (۱۳ اور ۱۹ سال کی درمیانی عمر کے) پر حملہ کر دیا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک ہمارے ساتھی پر حملہ کر کے اس کی ناک توڑ دی گئی

Marfat.com

تھی اور یوں مشتعل ہوکر، یہ جوابی حملہ کیا جا رہا تھا۔ اب ہم سے بدلہ لینے کیلئے فریق مخالف کی باری تھی۔ پھر جواباً ان کی باری آئے گی۔ پھر ہماری...... اور ایک بار پھر ان کی اور یوں یہ سلسلہ آگے پیچھے چلتا رہنا تھا۔ اس سب سے بچنے کیلئے مجھے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہئے تھا!

شاید ہماری شہری آبادیاں ہمیشہ معاشرے کے سنگدل اور بے رحم لوگوں کے لالچ اور غفلت کی پیداوار کا سارا کوڑا کرکٹ اپنی زمین پر ڈھیر ہوتے دیکھنے کیلئے مخصوص ہوتی ہیں، کیونکہ وہ گندگی جو شہری بچوں کے ڈر، ظلم اور غیض وغضب میں جل کر راکھ ہوتی ہے، ہماری قوم اس کی اصلاح نہیں کرتی بلکہ اسے علیحدہ کر دیتی ہے اور اس کا سبب اقتصادی و معاشی مسائل ہوتے ہیں۔

میں نے بار بار یہ بات لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ نوعمر لڑکے کہلانے کے مستحق نہیں یہ تو جرائم پیشہ ہیں، مجرم ہیں۔ مگر ہم ممکنہ طور پر ان سے اور کیا توقع رکھ سکتے تھے؟ کیونکہ اگر ان سے ان کا بچپن نہ چھین لیا گیا ہوتا، ان کی معصومیت ان سے زبردستی چھین نہ لی گئی ہوتی، ہماری تاہی اور غفلت اس کا سبب نہ بنی ہوتی تو پھر کیا صورتحال ہوتی؟ کسی نے تو قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ قرآن پاک کتنی بار ہمیں مسکینوں اور یتیموں کی احتیاج یاد دلاتا ہے، حیران و پریشان بچوں اور بے یارومددگار بچوں کے بارے میں ہمیں آگاہ کرتا ہے؟

چلنے سے پہلے میں نے اپنی ٹیم کے ایک ساتھی کو بتانا چاہا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی! سکول کے احاطے کے چاروں طرف دیوارں اور باڑوں پر نوجوان کالے جنگجو لڑکے جن کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ تھی مورچے سنبھال چکے تھے۔ اس قسم کی لڑائیوں میں فریق مخالف کو پوری طاقت وقوت سے مرعوب کرنا مقصود ہوتا ہے اور انہیں اپنی حفاظت سے غافل حالت میں جالیا جاتا ہے۔ آج شب ہم سے بھول چوک ہو گئی تھی۔ کھیل کے میدان کے بالکل سامنے والی باڑ کے قریب بہت سی گاڑیوں نے بریک لگائی۔ کاروں کے دروازے اور ڈگیاں کھلیں رات کی تاریکی میں شور بلند ہوا "ہمارے پاس اسلحہ ہے اور ہم اسے استعمال کرنا جانتے ہیں!!"

گھبرائے ہوئے ہاتھوں میں بندوقوں کو جنبش ہوئی، ان کی نالیاں نیچے سڑک کی روشنیوں میں چمک رہی تھیں۔ ایسے لمحات میں لفظ خوف یا ڈر صحیح لفظ نہیں ہوتا۔ بے حسی اور صدمہ زیادہ قریبی اور اصلی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ آپ اس وقت زخمی ہو جانے کے بارے میں

نہیں سوچ رہے ہوتے کیونکہ اب نہ آپ اپنی اندرونی تحریک اور فطری صلاحیت و مہارت پر بھروسہ کر رہے ہوتے ہیں۔ ابھی بھاگ جانے کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے کہ وقت سے پہلے بھاگنے سے ایک ایسا اعصابی ردعمل پیدا ہوسکتا ہے جو بہت مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ہم باسکٹ بال کے جال کے گرد کھڑے تھے۔ جلد ہی جو ہونا تھا وہ ختم ہوسکتا تھا۔

فرمن جیکسن جو گذشتہ ہفتے کے حملے کا شکار ہوا تھا سرکش و بے باک، سکول کے احاطے کی جانب بڑھا۔ وہ ایک ایک کر کے ان لوگوں کی نشاندہی کر رہا تھا جنہوں نے اس پر دھاوا بولا تھا۔

اس کا اندازہ بالکل صحیح اور درست تھا۔ شہری تشدد عام طور پر مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ نئے دشمن اور خاندانی دشمن پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ کس قدر وحشیانہ فعل تھا! مجھے یاد تھا کہ ان ہی نوخیز لڑکوں نے جو اپنا فیصلہ سننے ہی والے تھے ہمارے پڑوس میں چند ماہ قبل ایک نئے یہودی کو خوب مارا تھا، وہ اسے پاؤں سے ٹھوکریں مارتے ہوئے برف پر پڑے پڑے چیختے چلاتے چھوڑ گئے تھے، مضروب جان بخشی کی التجائیں کر رہا تھا اور یہ اس سے بے نیاز اس کا تمسخر اڑا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔

فرمن میری طرف پلٹا، میں اسے چوتھے گریڈ سے جانتا تھا اور وہ اس وقت بھی دوسروں کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی وجہ سے مشہور تھا۔ بچے قدرتی طور پر ایک دوسرے کیلئے قربت محسوس کرتے ہیں مگر چوتھے گریڈ ہی میں ہم دونوں نے اپنی موروثی رکاوٹوں کی وجہ سے محسوس کر لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔ کسی طور میں نے اس کے چہرے میں ایک گیارہ برس کے لڑکے کو دیکھا جسے جاننے میں، میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا میں حیران ہوں کہ اس نے مجھ میں کیا دیکھا تھا۔

''یہ ہر لحاظ سے صحیح اور مناسب رہے گا!'' میں نے سوچا۔

میں آہستہ آہستہ قدم پیچھے کھینچتے ہوئے باہر جانے والے واحد راستے کی جانب بڑھا۔ ڈینس جو ایک اور ستایا ہوا لڑکا تھا میرے پیچھے پیچھے بہت ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ مجمع بکھر گیا تھا اور ہمارے لئے نکل جانے کا موقعہ پیدا ہو چکا تھا۔ کوئی بھی وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا! اس طرح کی صورتحال میں ہمیں اپنے جذبات اور ہر طرح کی قوت مدافعت پر قابو پانا ہوتا ہے۔ ہمیں ظلم و

Marfat.com

تعدی میں ایک بار پھر گہرائی تک اترنا ہوتا ہے! یہ نظر تو آسان آتا ہے مگر اس میں کافی مشق درکار ہوتی ہے۔

گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہجوم حرکت میں تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رقص کا سا سماں ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے لمبی لمبی گھاس میں سے ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اور وہ پوزیشنیں سنبھالنے کیلئے راستہ ہموار کر رہے تھے۔ پھر تالیوں کی آواز صاف سنائی دی اور پلک جھپکتے ہی غم و غصے کا ایک طوفان چلا جس کے نتیجے میں گرم تارکول والے احاطہ سکول میں بہت سی لاشیں تڑپتی نظر آئیں۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی مانند بھاگ رہا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا اور پولیس کے خوف سے منتشر مجمع میں شامل تھا۔ اور درد کے مارے میرا برا حال تھا اور آنے والے نامعلوم لمحے کے خوف و ہراس سے بہت پریشان تھا۔ ہم سب بھاگ رہے تھے!

یہ شب اور ایسی ہی دوسری راتیں اور دن میری زندگی میں اس وقت تک لوٹ کر آتے رہے جب تک میں نے سان فرانسسکو یونیورسٹی میں عبدالعالم موسیٰ کا مسلم طلبہ سے خطاب نہ سنا تھا۔ پریشان کن جذبات اور ذہنی ردعمل تھا کہ مقرر کے بارے میں میرے تاثرات سے برابر ٹکرا رہا تھا۔ مقرر ایک دراز قامت، مضبوط اور اپنی شخصیت کا مرعوب کن پہلو لئے ہوئے، ایک کالے امریکی تھے۔ جو ذہین اور ذکی تھے۔ میں ان سے دس سال پہلے ملا ہوتا تو وہ میرے لئے ایک خطرناک مخالف ہوتے۔ مجھے کسی نے ان کے بارے میں بتایا کہ وہ کسی زمانے میں بلیک پینتھر (سیاہ فام تشدد پسندوں کی تنظیم جو امریکہ میں اپنے حقوق کیلئے لڑ رہی تھی) کے رکن تھے اور اسی وجہ سے جیل بھی جا چکے تھے۔ یہ شخص جو اپنی ذات کی حد تک اور دوسروں کے لئے اس قدر پرامن تھا اس کے اندر تشدد بھی ہوسکتا تھا، مجھے یقین نہ آتا تھا۔

لیکچر کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا سوال تھا:

''آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ کیا اسلام آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوا ہے؟''

اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے، شاید اس لئے کہ وہ اس سوال پر حیران یا مضطرب تھا بالکل اسی طرح جیسے میری اس وقت حالت ہوجاتی ہے جب میں کسی طالب علم کو دسویں بار کوئی بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

Marfat.com

''لوگوں کو اس کا بالکل احساس نہیں ہوتا...... وہ دراصل اسلام کی قوت' پر یقین نہیں کرسکتے'' اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے گرانٹ کی طرف اور میری طرف اشارہ کر کے اس بات کا اعلانیہ اظہار کیا ''ان جیسے سفید فام انسانوں کو تم لوگ ہم جیسے سیاہ فام لوگوں کے ساتھ بیٹھا دیکھتے ہو، جو اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔'' (وہ ان مسلم امریکیوں کا حوالہ دے رہے تھے جو اوکلینڈ سے ان کے ساتھ آئے تھے)

''ہم سب بھائیوں کی طرح ایک جگہ بیٹھے ہیں جبکہ آج سے دس سال قبل ہم سڑکوں پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قتل و غارت پر اتر آتے تھے!۔ اسی سے آپ کو معلوم ہوسکتا ہے کہ کسی زندگی پر اسلام کا اثر کہاں تک ہوسکتا ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے دل و دماغ پر کندہ تحریر پڑھ رہا ہے۔ پروگرام ختم ہونے پر عبدالعالم میرے پاس چل کر آئے اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ آخری بار میں نے کب کسی کالے آدمی سے ہاتھ ملایا تھا۔ ہاتھ ملانے سے مراد محبت و بھائی چارے کی گرمجوشی سے مصافحہ کرنا تھا۔ میں نے سوچا کیا ایسا کبھی میری زندگی میں ہوا تھا؟ مجھے روح کی گہرائی تک رنج پہنچا، اس لئے کہ جب اس قسم کے زخم لگتے ہیں تو درد باہر آنے کی راہیں پاتا ہے۔ پہلے تو ہم اپنے ان دردوں کو نکال باہر کرتے ہیں اور پھر دوبارہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ درد جن کے ہم عادی ہوجاتے ہیں وہ درد جن پر ہم بھروسہ کرنے لگتے ہیں۔ جنہیں زندگی سے خارج کردینا یا بھول جانا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ اس زمانے میں مجھے مسلمان ہوئے صرف ایک ماہ گزرا تھا اور آئندہ پانچ برس جو میں نے سان فرانسسکو میں گزارے ان برسوں میں، عبدالعالم سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ البتہ ان سے جو بہت پکا اور دلنشین سبق میں نے سیکھا وہ تھا انسان کا انسان کو بھائی سمجھنا۔

جب کوئی نیا مسلمان ہوتا ہے تو مسلم برادری اس خبر پر خوشیاں مناتی ہے بالکل اسی طرح جیسے نومولود کی پیدائش پر کوئی خاندان خوشیاں مناتا ہے۔ اس تقابل کی صورت بھی اس وقت بہت حسین لگتی ہے جب کسی نومسلم مرد یا عورت کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے اس کے ماضی کے گناہ پیچھے ماضی میں رہ گئے، اس کی روح تو اب برف کی مانند صاف و شفاف ہے اور وہ اسی طرح پاک و صاف اور معصوم ہے جس طرح ایک نومولود بچہ۔ میرا ایک مسلمان دوست مجھے بتایا کرتا

Marfat.com

تھا کہ میں کس قدر خوش قسمت تھا اور وہ تو اس معاملے میں تھوڑا سا مجھ سے حسد بھی کرتا تھا۔ بعض اوقات محبت و اخلاص چشمے کی مانند انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے مثلاً اس وقت جب مسلم برادری آپ کے اسلام قبول کرنے کے بعد عبوری عرصے میں آپ کی پوری پوری مدد کا یقین دلاتی ہے۔

بالکل ایک بچے کی مانند نو مسلم پر مشوروں اور نصیحتوں کی بمباری کردی جاتی ہے اس مرد یا عورت نے تو اسلام اختیار کیا ہوتا ہے مگر اسے نہ صرف ایک خاندان اپنا لیتا ہے بلکہ دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے مسلمانوں کے وہ بھائی اور بہن بن جاتے ہیں۔ وہ بھائی بہنیں جو مختلف تہذیب و تمدن سے تعلق رکھتے ہیں، سعودی عرب، پاکستان، ملائیشیا اور امریکہ کے دشمن ممالک سے مثلاً ایران، عراق، لیبیا اور فلسطین سے اور غیر معروف جگہوں سے مثلاً مالی، تنزانیہ، یمن اور نیپال سے۔ اور وہ مرد یا عورت اپنے ان بہن بھائیوں کی کامیابیوں و کامرانیوں، مشکلات و پریشانیوں اور خوابوں کی تعبیر میں ان کے شریک بن جاتے ہیں۔ ایک بار نبیؐ نے فرمایا تھا کہ تمام مسلمان ایک جسد واحد کی مانند ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک حصہ بیمار پڑ جائے تو سارا جسم اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ (۱) اسی لئے جب کبھی ایک فلسطینی کا گھر مسمار کیا جاتا ہے، یا ایران میں زلزلے سے ہزاروں انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں یا افغانستان میں لڑتے ہوئے مسلمان مارے جاتے ہیں تو مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی بستے ہیں اسے اپنی بے حرمتی اور اپنا درد محسوس کرتے ہیں کیونکہ مومن بے شک ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے محافظ ہوتے ہیں۔ باہمی احساس ذمہ داری کے اس تصور کو آنحضرت ﷺ کی ان احادیث سے بڑی تقویت ملتی ہے:

> ''تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہوئے۔''
> (۲) وہ مومن نہیں ہوسکتا جو خود پیٹ بھر کر کھا لیتا ہے جب کہ اس کا ہمسایہ بھوکا رہتا ہے'' (۳) ''اور تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ اس پر ظلم و زیادتی ہوئی ہو یا اس نے ظلم کیا ہو۔ اگر اس پر ظلم ہو رہا ہو تو اس کی مدد

Marfat.com

کرو اور اگر وہ ظلم کر رہا ہو تو اسے روک لو۔" (۴)

اسلام مدت سے عقیدہ مساوات انسانی کے لئے مشہور ہے اور بہت سے مغربی سکالرز کا خیال ہے کہ آج افریقہ میں پرامن طور پر اسلام کی اشاعت کا باعث یہی عقیدہ ہے۔ امہ میں شامل ہونے کے بعد ایک فرد کو پتہ چلتا ہے کہ سب کیلئے یکساں معیارات ہیں اور اس سے بھی آگے بڑھیں تو پوری انسانیت پر ایک جیسے معیار لاگو ہوتے ہیں۔

> "لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ (درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔" (۴۹: ۱۳)

یہ آیت قرآن کی آفاقیت کو بڑے جامع اور مختصر طور پر پیش کرتی ہے اس کا آغاز، جیسا کہ قرآن میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، پوری انسانیت کو مخاطب کرنے سے ہوتا ہے۔ یہ بلاوا "اے بنی نوع انسان" قرآن میں تقریباً پچیس بار آیا ہے اور اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ بلاوا سب کیلئے ہے دوسرے جملے میں تمام لوگوں، بلا امتیاز مرد و زن، کی بنیادی صفت بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے خاندانوں اور قرابت داروں میں ذاتی اور روحانی نشوونما کیلئے بڑے نازک اور اہم مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ یہ آیت اس تصور کو احاطے میں لے کر ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی عدم مشابہت اور تنوع ہمارے لئے اہم ٹیسٹ بھی مہیا کرتے ہیں کیونکہ جب ہم انہیں ان پر نافذ العمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو عدل و انصاف، محبت اور رحم و ہمدردی ایک دوسری جہت پر نشوونما پاتے ہیں۔ یہ نظریہ قرآن میں بھی (۳۰: ۲۲) دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ وہ نظریات تھے جو حضرت محمد ﷺ کے ہم عصران بت پرستوں اور کفار کو ایک بہت بڑا چیلنج پیش کرتے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ شرافت و نجابت صرف کسی قبیلے سے متعلق ہونے تک محدود تھی۔ اسلامی عہد سے قبل عرب میں سالانہ حج کے موقعہ پر شاعری کے مقابلے بھی منعقد ہوتے تھے تاکہ مقابلے کے شرکاء کو اپنے خاندان اور قبیلے اور اپنے بزرگوں کی عظمت و بڑائی پر

Marfat.com

فخر کرنے کا موقعہ مل سکے۔ یہ ہر چند کہ اس بات پر زور کم ڈالتی تھی لیکن پھر بھی عرب معاشرے میں کسی شخص کے مقام و مرتبے کے تعین میں مدد دیتی تھی۔ دوسری طرف قرآن (۲: ۲۰۰) میں تاکید فرمائی گئی ہے کہ اپنے سالانہ اجلاسوں میں مومنین کو چاہئے کہ اللہ کی تعریف کریں اور اسی کو یاد کرلیا کریں۔ یہ تصور کہ شرافت کا انحصار تقویٰ و پرہیز گاری، پر تھا اور قبائلی، قومی، نسلی اور لسانی امتیازات کو یکسر نظر انداز کیا جانا چاہئے۔ (۳۰: ۲۲) یہ ایک ایسا تصور تھا جو یقیناً اسلامی عہد سے قبل پورے معاشرتی ڈھانچے کو تلپٹ کرنے والا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب اس تصور کو عملی شکل میں پیش کرنے والے باہمت افراد کی تعداد زیادہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کی ہجرت مدینہ اور بعد ازاں مدینہ کو ایک مثالی ریاست بنانے کی کوشش پورے بت پرست عرب کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ زیرک اور تیز فہم ذہنوں پر یہ بات واضح ہوجانی چاہئے تھی کہ یہ دو نظام۔ قبائلی اور انسانی مساوات پر مبنی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ بارہ برس تک مکہ مکرمہ میں یہ بنیادی طور پر قول و فعل کا تصادم تھا۔ محمد ﷺ اور آپ کے مقلدین کو ستایا جاتا تھا ان پر ظلم ڈھائے جاتے تھے اور ان کے عزیز و اقرباء نے ان سے میل جول ترک کردیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے ایک سال بعد متضاد نظاموں کے نمائندے جب بدر کے میدان میں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوئے تو بیٹے باپوں کے خلاف، بھتیجے چچاؤں کے، چچازاد بھائی چچازاد بھائیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا قبائلی نظام پر استوار معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور مسلمانوں نے اس جنگ میں اپنے سے تین گناہ زیادہ فوج کو پسپا کردیا تھا۔ اب پورے عرب کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ انقلاب لانے والی ہوائیں پہنچ چکی تھیں۔

مسلمانوں کے لئے ایمان والوں کی برادری ایسا مقام ہے جہاں مساوات کے اصولوں کو عملاً پیش کیا جاسکتا ہے جہاں دنیاوی نقطہ نظر کے حامل لوگوں کو شریک ہونا ہوتا ہے۔ عقیدہ کو ایمان کے ذریعے، حکومت اور قانون کے ذریعے اور ان اصولوں کو ایک معاشی و سیاسی نظام کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا تعلق صرف اپنے ماننے والوں تک محدود نہیں ہے اس لئے کہ یہ تو پوری انسانیت کیلئے آیا ہے۔ اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ جب قرآن غریب کو صدقہ و خیرات دینے پر زور دیتا ہے، عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کرتا ہے،

مظلوموں کی مدد کی تاکید کرتا ہے، یتیموں کی دیکھ بھال کا درس دیتا ہے، مسافر کی مدد کیلئے کہتا ہے تو مصیبت زدہ کے مذہب کی کوئی شرط عائد نہیں کرتا۔ مومنوں کو قرآن اللہ کی مخلوق میں سے سب سے بہترین لوگ کہتا ہے کیا بہترین اس لئے کہ یہ لوگ ایک خدائے واحد کی اطاعت کرتے ہیں؟۔ اس کی عبادت و پرستش کرتے ہیں؟ یا صحیح مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں؟ نہیں۔ وہ بہترین لوگ اس لئے ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کیلئے پیدا کئے گئے ہیں: جو حق کا دفاع کرتے ہیں، بدی کی مخالفت کرتے ہیں اور ظلم واستبداد کے خلاف لڑتے ہیں۔

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو۔''(3:110)

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر لڑو جو کمزور پاکر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔''(۴:۷۵)

قرآن پاک کی کئی آیات میں ذکر آیا ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ (وائسرائے، نائب) ہے۔ اور اس کے ذمے حالات کے ستائے ہوئے، مظلوم انسانوں کا خیال رکھنا ہے۔

دین اسلام کے پانچ ستون ہیں جن پر نظریہ اسلام کی مذہبی رسومات کا مجموعہ کھڑا ہے، جو بنی نوانسان کے ذمے اللہ کے فریضے کو اور ایک فرد کو انسانیت کیلئے کیا کچھ کرنا ہے نمایاں طور پر متحد اور یکجا کرتے ہیں اور اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ کلمہ شہادت جو ایمان وعقیدہ کی تصدیق وتوثیق کرتا ہے، اسے ہر مرد اور عورت کیلئے اسلام قبول کرتے وقت، مسلمان ہونے کا اعلان کرنے سے قبل دہرانا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے ہمیشہ سے مسلمانوں کیلئے ایک عقیدہ کے بیان سے کہیں زیادہ بات کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ایک معاشی وسیاسی عہد و پیمان بھی ہوتا ہے اور اسی لئے مسلم برادری کے کم از کم دو افراد کی گواہی بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ ایک انسان کے اس اعتراف کو بھی پیش کرتی ہے کہ اس نے ایک مقدس امانت قبول کی ہے اور وہ ہے زمین پر

Marfat.com

خدا کے نائب اور خلیفہ کے طور پر کام کرنے کی امانت۔ زکوٰۃ جسے عام طور سے ترجمہ کرتے وقت غرباء و مساکین کے لئے ایک ٹیکس کا نام دیا جاتا ہے اور جو ایک مسلمان کے مال و دولت پر ایک مقررہ شرح کے حساب سے ادا کی جاتی ہے اور ہر سال ضرورت مندوں اور مستحقین میں ضرور تقسیم کی جانی چاہئے۔ اس کے پیچھے انسانیت کی فلاح و بہبود کا جو نقطہ نظر ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ پورے ایک ماہ کے رمضان کے روزے جن میں مسلمان طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور شہوانی خواہشات سے پرہیز کرتے ہیں، ایمان والوں میں یکجہتی کے شدید جذبات و احساسات پیدا کرتے ہیں لیکن اس کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے: ہر مسلمان میں دنیا بھر کے غریبوں اور فاقہ زدوں کے لئے گہری ہمدردی کا احساس پیدا کرنا اور پھر اس جذبہ ہمدردی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ان لوگوں کیلئے کچھ کرنا۔ اس بات کو واضح کرنے کیلئے دو مثالیں ہی کافی ہوں گی۔

گذشتہ رمضان المبارک کے مہینے میں، سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے، میں جب باہر پھر رہا تھا تو مجھے پاس سے گزرتی ایک کار میں سے آواز سنائی دی۔ ''ارے جیف! روزہ کیسے گزر رہا ہے؟'' یہ ایک اور امریکی مسلمان تھا اور سچ اور ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس روز روزہ بالکل اچھا نہیں گزر رہا تھا! بہت گرم دن تھا اور پیاس کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''بہت مشکل میں ہوں'' جاتے جاتے اس نے کار سے ہاتھ باہر نکال کر انگوٹھا بلند کیا اور مجھے ہمت دلائی۔ اس سے مجھے جذباتی حوصلہ ملا اور میں نے اپنے آپ کو نہ صرف اس انسان کے بلکہ تمام مسلمانوں کے بہت قریب محسوس کیا، کیونکہ مجھے اس سے یہ یاد آیا کہ اس روز تو دنیا بھر میں لاکھوں مسلمان اسی حالت میں تھے۔

ایک اور ماہ رمضان میں ایک رات میں معمول سے ہٹ کر زیادہ سویا اور یوں سحری نہ کھا سکا۔ گویا اس روز مجھے بلا کھائے پیئے چوبیس گھنٹے گزارنے تھے۔ اس سے کوئی قیامت تو نہیں آ جاتی مگر یہ اتنی آسان بات بھی نہیں خصوصاً کام والے دن، جیسا کہ اس روز تھا۔ اس روز جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پیاس اور تھکن بڑھتی جا رہی تھی، پھر پانچ بجے میرے پیٹ میں گرانی اور سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب سورج غروب ہونے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے میرا روزہ مکروہ ہونے والا تھا، میرا سر چکرا رہا تھا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں، مجھے ایسا لگا

جیسے کسی نے انہیں ان کے خانوں میں بند کردیا ہو۔ میں لیٹ گیا اور افطاری میں بقیہ ایک گھنٹے تک ستانے کی کوشش کی مگر مجھے ایک پل چین نہ آتا تھا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا تو درد محسوس ہوتا اور نیند ویسے ہی نہیں آرہی تھی۔ میں آخری نصف گھنٹے ایک ایک منٹ شمار کررہا تھا۔ آخر 9 بج کر پندرہ منٹ پر افطاری کا وقت ہوا مگر میں اس وقت بھی کچھ کھا نہ سکتا تھا، میرا جی متلا رہا تھا۔

میری اہلیہ نے مجھے ایک چھوٹا سا کپ ہلکی یخنی کا دیا۔ میں نے تھوڑی تھوڑی کر کے یخنی پینا شروع کی۔ میرا سر درد کم ہورہا تھا، میرا پیٹ اب نارمل تھا۔ آنکھوں کی جلن ختم ہوچکی تھی۔ منٹوں میں، میں اپنے آپ کو بالکل تندرست محسوس کررہا تھا ہم کھانا بھی کھا رہے تھے اور ٹی وی پر خبریں بھی آرہی تھیں کہ اسی اثناء میں ایتھوپیا اور صومالیہ میں بھوک اور فاقے پر ایک رپورٹ سامنے آئی۔

نہایت دبلے پتلے، مریل انسانوں کی تصاویر دیکھ کر جو قریب المرگ تھے مجھے کسی زلزلے، جنگ یا سیلاب جیسی آفت پر دکھائی جانے والی فلمیں یاد آ گئیں۔ میں نے سوچا، میرے لئے اپنے کرب سے نجات کا حصول کتنا آسان تھا جبکہ میری عمر کے ان مردوں اور عورتوں کو مسلسل ایک ایسے عذاب سے گزرنا تھا جس میں دور دور تک کوئی نجات نظر نہ آتی تھی۔ یہ لوگ بے بس کھڑے تھے اور ان کے بچے السر زدہ ننگے پیٹ لئے ان کے سامنے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ اس لمحے مجھے یہ خیال گزرنا چاہئے تھا کہ مجھ پر تو اللہ کا بڑا کرم ہے مگر انہیں اس ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں ایک امتحان میں ناکام ہوگیا ہوں۔

حج کیلئے مکہ جانے والے بہت سے مسلمانوں کی زندگی میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ غالباً وہ دن بڑا ہی ڈرامائی ہوتا ہے جب حجاج کرام ٹولیاں بنا کر میدان عرفات کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں وہ جمع ہوتے ہیں تو احرام باندھے ہوئے، ایک یکساں اور نمایاں لباس میں ہزاروں زبانیں بولتے ہوئے اکثر شدید گرمی کے دنوں میں وہ اپنے دین اور انسانیت کے ساتھ ایک نیا عہد کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے یوم حشر کی یاد دلاتا ہے جب تمام انسان ایک وسیع و عریض میدان میں اکٹھے کردیئے جائیں گے اور اس دنیا کی زندگی میں ہم جو کچھ کرتے رہے اس کا ہمیں حساب پیش کرنا ہوگا۔ مالکم ایکس کے نزدیک یہ ایک بہت بڑے فیصلہ کن موڑ کو پیش کررہا تھا۔

Marfat.com

آخری ہفتے میں جب میں نے اپنے چاروں طرف تمام رنگوں اور نسلوں کے لوگوں کو دیکھا تو ان کی شفقت و مہربانی نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا، میری زبان سے بات نہ نکلتی تھی۔ میرے ان الفاظ سے آپ کو صدمہ ہوگا۔ مگر اس حج کے موقع پر جو کچھ میں نے دیکھا اور جو تجربہ مجھے ہوا اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنے خیالات کو پہلے کی نسبت جدا طریقے سے ترتیب دوں اور چند فیصلے جو میں پہلے کر چکا تھا انہیں نکال باہر پھینکوں۔ غالباً اگر امریکی سفید فام باشندے ایک خدائے واحد کے تصور کو قبول کر سکتے تو پھر وہ یقیناً یہ تسلیم کر لیتے کہ ملت واحدہ انسانیہ کیا ہے اور پھر رنگ و نسل کے فرق کی بنیاد پر دوسروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنا چھوڑ دیتے اور دوسروں کو تکلیفیں بھی نہ پہنچاتے۔

حجاز مقدس میں قیام کے دوران مجھے جو روحانی بصیرت حاصل ہو رہی ہے اور جس میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا ہے اس کی مدد سے امریکہ میں سیاہ فام اور سفید فام انسانوں کے درمیان جو کچھ ہو رہا ہے اسے میں صاف صاف دیکھ سکتا ہوں۔ (۵)

ایک رکن کا تذکرہ ابھی باقی ہے اور وہ ہے نماز (صلوٰۃ)۔ نماز کی ادائیگی کی انفرادی طور پر بھی اسلام میں اجازت ہے اور اس کی ایک خاص اہمیت بھی ہے مگر زیادہ افضل باجماعت نماز کی ادائیگی ہے۔ بیشک بائبل میں حضرت عیسیٰؑ نے گروہی عبادت کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ یہ عبادت اتنے ہی اہتمام سے دکھاوے کے لئے کی جانی چاہئے جتنی حقیقی تقویٰ و پرہیز گاری کیلئے۔ (٦) قرآن اس قسم کی منافقت اور ریا سے منع فرماتا ہے۔ (۴: ۱۴۲، ۱۰۷: ۱۔۷) نبیؐ نے اپنے مقلدین سے فرمایا کہ باجماعت نماز کا ثواب اور قدر و قیمت تنہا نماز ادا کرنے کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ایک بار اور ملت و برادری کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ (۷)

باجماعت نماز کے لئے کندھے سے کندھا اور پاؤں سے پاؤں ملا کر صفیں ترتیب دی جاتی ہیں ہر نماز میں کئی رکعتیں ہوتی ہیں جن کی ادائیگی کے دوران کھڑا ہونے، جُھکنے، بیٹھنے اور زمین بوس ہو کر سجدہ دینے کا عمل دہرایا جاتا ہے۔ فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں امام صاحب پہلی دو رکعتوں میں قرآن پاک کی تلاوت بہ آواز بلند کرتے ہیں جبکہ بقیہ دو رکعتوں میں (فجر کی نماز کی) تو ہوتی ہی دو رکعت نماز فرض ہے جو امام کے پیچھے ادا کرنی ہوتی ہے،

Marfat.com

مغرب کے تین فرض اور عشاء کے چار فرض) مبتدی دل ہی دل میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ پہلی رکعت میں نماز کے دوران حرکات وسکنات کی روانی میں ذرا سا فرق نظر آتا ہے مگر بعد کی رکعتوں میں وقت میں ایسی روانی اور یکسانیت آجاتی ہے جو آخر تک برقرار رہتی ہے اور آخری رکعت میں تو نمازی لاشعوری طور پر اپنے نمازی ساتھیوں کی حرکات وسکنات کا پہلے سے اس حد تک اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اب تمام صفوں میں کھڑے نمازی (فوجی سپاہیوں کی مانند) بیک وقت رکوع میں جاتے ہیں اور ایک ساتھ سجدے میں جاتے ہیں۔ یہ تجربہ بڑا مسحور کن ہے اور ہپناٹزم کے قریب تر لگتا ہے۔ نماز ختم ہوتی ہے تو نمازی اپنے دائیں اور بائیں کھڑے ساتھیوں پر سلامتی بھیجتے ہیں۔ پس اسلامی نماز ایک خوش منظر عمل ہے جس میں اللہ کی حمد وثناء کی جاتی ہے، باہمی نشوونما کے لئے یہ مقام سنگم ہے جس میں تلاوت قرآن پاک بھی شامل ہوتی ہے، ہدایت بھی ہے، حرکت وتوازن بھی ہے اور یہ ایک مذہبی رسم بھی ہے جو پہلے تو ایک مومن کو اس کی برادری سے باہر لے جاتی ہے اور پھر اسے اپنے پروردگار سے ہمکلام ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اور ایک بار پھر باہر لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور اس عمل سے پہلے نماز ختم ہونے پر وہ مومن اپنے بھائیوں پر سلامتی بھیج چکا ہوتا ہے۔ دراصل پوری نماز میں اللہ سے راز و نیاز کا جو آہنگ قائم ہوتا ہے اور مسلم برادری کی آزادی اور یکجہتی کا جو مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ بیک وقت ادا ہونے والی حرکات وسکنات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

میں سان فرانسسکو میں ایک ایسے طالب علم کو جانتا ہوں جس کے لئے اسلامی نماز اور عبادت کا یہ پہلو پریشان کن تھا: ''ہم اس قدر قریب قریب کھڑے ہو کر نماز کیوں ادا کرتے ہیں، ہم اس قدر ایک دوسرے کے پاس پاس اور متصل کیوں ہوتے ہیں؟ میں تو دوران نماز اپنے رب سے رابطہ کرنے پر ساری توجہ مرکوز کرنے میں مصروف ہوتا ہوں اور مجھے یہ خیال بھی برابر رہتا ہے کہ کسی دوسرے کا جسم میرے دائیں بائیں سے میرے جسم سے چھو رہا ہے، جس کی وجہ سے یکسوئی حاصل نہیں ہو پاتی!''

میں نے اسے بتایا کہ میرے خیال میں وہ ایک ایسے مشاہداتی مقام پر پہنچ چکا تھا جو اسلام کے بنیادی اور اساسی دستور اور فرمان الٰہی سے پردہ اٹھاتا ہے: کہ اس وقت بھی جب تم عبادت خداوندی میں منہمک ہو تو تمہیں اپنے دائیں اور بائیں کے بھائی کو فراموش نہیں کرنا، یا

Marfat.com

دائیں بائیں کی اپنی بہن کو نہیں بھلانا۔ گویا دوسرے لفظوں میں تمہاری ذاتی اور روحانی فلاح و بہبود اور نجات تمہارے اس عمل سے یوں باہم پیوست ہے کہ اسے تم نہ اس لمحے نہ کسی اور وقت جدا کر سکو اور وہ عمل یہ ہے کہ تم دوسرے انسانوں کی بھلائی کیلئے کیا کرتے ہو۔

بالکل جدید اسلامی نشاۃ ثانیہ پر مغرب میں حال ہی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس لٹریچر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے اساسی اسباب کیا ہیں۔ جدت، استعماریت اور جدید استعماریت کے اثرات، سلطنت عثمانیہ کی شکست و ریخت اور مسلمانوں کو تیسری دنیا کے باشندوں کی دی گئی حیثیت اور مایوسی کا حوالہ و ذکر بار بار کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ ان سب نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے مگر دنیا بھر میں اسلامی سرگرمیوں کی تجدید نو کا کام نوجوان کر رہے ہیں، جن کیلئے مذکورہ بالا تجربات ماضی بعید کا حصہ ہیں۔ اتحاد اسلامی اور اسلامی ریاستوں کیلئے موجودہ دعوت کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں امریکہ اور یورپ کے ان اسلامی مراکز اور مسلم طلبہ کے زیر انتظام قائم شدہ مساجد میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اگر ہم نماز جمعہ کے اجتماعات کے وعظ اور تقاریر سنیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان خواہشات کی تہ میں قرآن پاک کا تصور اتحاد واحدہ انسانیہ کارفرما ہے جسے ایک خدائے واحد کے تصور تلے قائم ہونا ہے۔
مغرب کی ان مسلم برادریوں میں مختلف ممالک اور متنوع تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو ایک اسلامی طرز زندگی کی تعمیر و تشکیل کرنی ہے۔ اس سلسلے میں لائحہ عمل پر عدم اتفاق رائے سے ایک کھچاؤ سا تو ضرور پیدا ہوتا ہے اور پرانے تعصّبات اور بدگمانیاں اکثر و بیشتر ابھر کر سامنے آتی ہیں مگر ایک ہی دین کے ماننے والے متحدہ رہتے ہیں اس لئے کہ اسلامی اخوت و بھائی چارے کا تصور نسلی اور تہذیبی رکاوٹوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ اور اس کے ذریعے مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آ چکی ہے کہ اسلامی تصور اور خواب ایک حقیقت بن کر سامنے آ سکتے ہیں اور اس اتحاد و یکجہتی کا موقعہ جو آج مل رہا ہے وہ صدیوں پہلے میسر نہ تھا۔

"(اور وہ ان لوگوں کیلئے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کیلئے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔" (۱۰:۵۹)

سوالات

بہت بڑے آڈیٹوریم میں اس کی جواں آواز لاؤڈ سپیکر سے نکل کر فضاء میں گونجی:

''بہت سی مسلم خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ آج جیسی کانفرنسوں میں عورت کو مردوں سے الگ رکھنا مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ہماری بہنوں کو یہاں اوپر ایک بالکونی میں بند کر دیا جاتا ہے، جو سٹیج سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے جبکہ مردوں کو نیچے اصل فرش پر بیٹھنے کو جگہ مل جاتی ہے اس لئے ہم عورتوں کی مقررین تک رسائی غیر مساوی سلوک کی بات ٹھہرتی ہے۔ اور ہمیں اپنے سوالات مقررین تک پہنچانے اور ان کو متوجہ کرنے اور شنوائی کیلئے لڑنا پڑتا ہے مقرر کوئی مرد ہو یا عورت صورتحال دونوں صورتوں میں یکساں ہوتی ہے! اس سے ہمارے اندر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کمتر سمجھ کر دوسرا درجہ دیا جاتا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک مقرر سے میرا سوال یہ ہے: ''کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ آج کے دور میں عورتوں اور مردوں کو جداگانہ خانوں میں بانٹنا اور ان کے لئے علیحدہ علیحدہ نشستوں کا انتظام کرنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور یہ کہ کیا اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش موجود ہے کہ آج کے اجلاس کی طرح کے اجتماعات میں مردوں، عورتوں کو ایک ہی فرش پر اکٹھا بٹھا دیا جائے اور ان سے یہ توقع کی جائے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں گے؟''

نوجوانوں کیلئے مخصوص اجلاس میں سامعین میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پائی جاتی تھی یہاں تک کے مائیکروفون میں نظارت کے فرائض سرانجام دینے والے کے سانس کی آواز بھی آپ سن سکتے تھے۔ سٹیج پر میز کے پیچھے تین امریکی مرد مقررین بیٹھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان میں سے کون اس سوال کا جواب دے گا۔ میز

Marfat.com

کے دونوں کناروں پر بیٹھے ہوئے دو مقررین نے تو نفی میں سر ہلا دیئے تھے اور یوں یہ بوجھ نظارت کی ذمہ داری سنبھالنے والے کے کندھوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے گلا صاف کر کے آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط کے ساتھ جواب دینا شروع کیا تھا۔

''یہ تو ایک ایسا سوال ہے جس کیلئے آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اپنی مقامی مسجد میں اس کا فیصلہ کر لیتے اور اس سلسلے میں کسی عالم دین سے مدد لیتے! مجھے یاد ہے کہ ایک کانفرنس کے دوران ایسے ہی ایک اجلاس کا اہتمام ہم نے بھی کیا تھا جس میں مردوں میں سے چند ایک کے رویے کی وجہ سے کچھ بہنیں واقعی ناراض ہوگئی تھیں! کوئی اور سوال''

میرا خیال تھا کہ نوجوان کے لئے منعقدہ کانفرنسوں کا مقصد سوالات کا موقع فراہم کرنا اور بحث و تمحیص کی کھلی اجازت دینا تھا۔ (اوپر سے کسی کی پھر وہی آواز سنائی دی) ہم اپنے مسائل کے جوابات کیسے حاصل کریں گے اگر ہم باہم ان پر تبادلہ خیالات نہیں کرتے اور پھر یہ سوال مقامی مساجد اور ان کے علماء تک کیوں محدود کیا جائے جبکہ اس کا تعلق قومی سطح کے اجتماعات سے ہے؟ میں یہ کہنے کی کوشش......''

''میری بہن! مجھے افسوس ہے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور فرشی سامعین میں سے کسی اور کا سوال ہمارے جواب کا منتظر ہے!''

بہت سی اسلامی کانفرنسوں میں جو سال بھر منعقد ہوتی رہتی ہیں، نوجوانوں کے اجلاسوں کے پروگراموں میں زیادہ دلچسپی اور جذباتی ماحول پایا جاتا ہے۔ مغرب میں اسلام کے مستقبل پر بنیادی اہمیت کے سوالات بڑی جرأت اور بے باکی سے پوچھے جاتے ہیں اور سولات پوچھنے والوں میں اکثر خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا شاید اس لئے ہے کہ مسلم امہ کا مستقبل ان دو قوتوں کے میل اور یکجا ہونے پر منحصر ہے: خواتین اور بچے۔ جبکہ مسلم مردوں کا اولین فرض یہ بنتا ہے کہ وہ نظام کی حفاظت کریں اور اسے برقرار رکھیں، آنے والے کل کے اسلامی معاشرے کی شکل کیا ہوگی اس کا آخر کار سارا دارومدار مسلمان ماں اور بچے پر ہے۔ میں نوجوانوں کے اجلاسوں سے ہمیشہ ایک نئی توانائی لے کر واپس آتا ہوں اور یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے

Marfat.com

بچے، جن مسائل کو اٹھانے کی ضرورت ہے وہ بلا خوف وخطر انہیں اٹھاتے ہیں مگر میں اس حقیقت سے بھی باخبر ہوں کہ یہ امید غیر موزوں اور بے جواز ہوگی کیونکہ جرأت وشجاعت تو نوعمری اور نوجوانی کے دور حیات سے تعلق رکھتی ہے اور اس عمر سے گزرنے کے بعد اس میں فرق آجاتا ہے جیسا کہ یہ واقعہ بھی اس کی ایک مثال پیش کر رہا ہے کہ اپنی پوزیشن بچانے کیلئے نازک اور حساس مسائل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یوں معاملات کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے۔

اس باب کے تحریر کرنے کا مقصد اور ارادہ اس لئے ہوا کہ امریکی مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں انہیں سامنے لایا جائے۔ موضوعات کا انتخاب تحریر اور گفتگو کے ذرائع ابلاغ پر مبنی ہے جس میں مطالعہ کتب اور زبانی بات چیت شامل ہے۔ وہ بات چیت جو امریکی مسلمانوں اور میرے درمیان ہوئی، میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے آپ کو صرف ان ہی مسائل ومعاملات تک محدود رکھوں جو اکثر وبیشتر ہمیں پیش آتے ہیں مگر کم وبیش ان کی کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی گئی۔ دو مسائل ایسے تھے جن پر مجھے بے حد کرب سے گزرنا پڑا۔ پہلے تو میں یہ سوچتا رہا کہ کیا مجھے ان مسائل میں سے چند ایک پر بحث کرنی بھی چاہئے یا نہیں، اس لئے کہ جو نتائج یا فیصلے سامنے آئیں گے ان سے قارئین کی بڑی تعداد ضرور پریشان ہوگی۔ اس کا دوسرا سرا قدرتی طور پر میرے دوسرے مسئلے سے جا ملتا تھا: یعنی یہ کہ کیا مجھے ان نتائج یا فیصلوں کو پیش بھی کرنا چاہئے یا نہیں؟ میں نے سوچا کیا یہی کافی نہ ہوگا کہ میں صرف ایک متنازعہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کر دوں اور ذاتی رائے ہی نہ دوں؟

نوجوانوں کی کانفرنس پر میں نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں میرا فیصلہ شامل ہے۔ کسی بھی درپیش مسئلے پر بحث وتمحیص سے ہم زیادہ دیر تک اغماض نہیں برت سکتے، اسے نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے اس عمل سے مسلم برادری اس مسئلے کے آسان حل ڈھونڈنا شروع کر دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ حل اسلامی تناظر میں تشکیل ہی نہ پاتے۔ پھر ہمیں اپنے سکالرز اور مفکرین میں دو متضاد رجحانات ملتے: مذہبی بنیادوں پر مضبوطی سے تشکیل شدہ یا قائم اعمال کی آزادانہ تشریح کرتے ہوئے انہیں جائز اور مباح ٹھہرانا اور ایسے ''مثالی'' اسلامی حل وضع کرنا جو عام مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ کسی حد

Marfat.com

تک ایسا ہونا ایک یقینی امر ہے اور ماضی میں ایسا اکثر ہوا ہے کیونکہ مذہب میں ایک خاص قسم کی لچک ہوتی ہے جو مختلف کلچرز کو اپنا لینے کی اجازت دیتی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ذہن میں ایک مثالی تصور ضرور ہوتا ہے جس کی اجتماعی طور پر لوگ تمنا کرتے ہیں۔ البتہ اس میں ایک خطرہ بھی رہتا ہے کہ ان رجحانات کو لوگ بہت دور لے جاتے ہیں اور تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی اور اسی وقت حساس مسائل کو زیر بحث لائیں گے خصوصاً اس مرحلے میں جبکہ اسلام مغربی دنیا میں جڑ پکڑ رہا ہے اسی وجہ سے میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے مؤقف پر قائم رہنے اور اس کا دفاع کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اس کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر تنقید ہو مگر مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کا یہ سب سے مؤثر اور دیانتدارانہ طریقہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہیں فیصلہ دینے کا اختیار حاصل ہے اور اس حقیقت سے ہم جس قدر زیادہ واقف ہوں گے اسی قدر اتفاق رائے کے اسلامی اصولوں کے ذریعے ہم زیادہ آسودہ اور خوشحال ہوں گے اس لئے کہ اس طرح سے ہم باہمی مشاورت کے ذریعے (شوریٰ و اجماع) اپنے اجتماعی مسائل حل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں اپنے قاری کو یاد دلانا چاہوں گا کہ میں (بطور مصنف کتاب) اسلام کا سکالر نہیں ہوں اور میں امید کرتا ہوں ہوں کہ میری آراء کو آزادانہ اور ناقدانہ طور پر چیلنج کیا جائے گا۔

خاندان

تم میں سے سب سے زیادہ فضیلت اسے حاصل ہے جو اپنے خاندان کیلئے سب سے بہتر ہے اور تم سب میں سے میں اپنے خاندان کیلئے سب سے بہتر ہوں۔ (۸)

ایمان والوں میں سب سے کامل وہ ہیں جو اپنے چال چلن اور طور اطوار میں سب سے بہتر ہیں اور تم میں سے سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہترین حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ (۹)

''ماں! ہم آپ کو بھوکا نہیں رہنے دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ کینسا س کوئی

Marfat.com

جنت ارضی نہیں ہے مگر آپ جب چاہیں ہمارے پاس آ کر رہ سکتی ہیں۔''

فون پر میں نے اپنی ماں کو تسلی دینا بہت غیر مناسب سمجھا۔ یہ ہمیشہ اس کا کردار رہا تھا اس نے اپنے شوہر اور پانچ بیٹوں کے ساتھ بہت کٹھن اور مشکل دن دیکھے تھے۔ اس نے بار ہا بڑی ہمت و دلیری، رحمدلی و ہمدردی اور جان نثاری کے ساتھ ہماری پریشانیوں اور ناکامیوں کو سہارا دیا تھا۔ اکثر ایک بار ایسا ضرور ہوا کہ یوں لگتا تھا جیسے رات کی رات اس جوان اور لرزاں خاتون کو ساٹھ برس کی عمر نے اچانک آ لیا ہو۔ آج پہلا موقع تھا جب میں نے اس کی آواز میں بے خانماں یا بے گھر ہونے کے خیال کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

''ماں، ہم تم سے پیار کرتے ہیں! خدارا میری بات پر یقین کرو!''

فون پر دوسری جانب سے خاموشی کے وقفے میرے لئے جان لیوا ثابت ہو رہے تھے میری آرزو تھی کہ ماں جواب میں کچھ تو کہے۔

''ہم تمہارے بیٹے ہیں! اب ان حالات میں تمہارا خیال رکھنا ہم سب کا فرض بنتا ہے بلکہ ہم پر اس سے بھی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ تو اللہ کا انعام ہوتا ہے کہ ہم جن لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں ان کی مدد کا ہمیں موقع میسر آ جائے۔''

اب مجھے اپنی ماں کی آواز تو آ رہی تھی۔ مگر بہت دھیمی ۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ جس چیخ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اس کی خاموشی میرے لئے سزا بن گئی تھی۔ ایسی چیخوں کو دبا لیا جائے تو بھنچے ہوئے ہونٹوں پر گرنے والے آنسوؤں کی رم جھم سنائی دینے لگتی ہے۔

''بیٹے، مجھے اب جانا ہے''، ''ماں مجھے تم سے بے حد پیار ہے۔''

''میں جانتی ہوں تم مجھے بہت چاہتے ہو۔''

میری ماں کے ذہن پر یہ بات مسلط ہے کہ وہ اپنے پانچ بیٹوں کی دست نگر نہ بنے، یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو کبھی یہ اجازت بھی نہیں دی کہ وہ ان میں سے کسی کے سامنے

روئے۔ وہ اس لمحے کے تصور سے خائف رہتی ہے جب وہ اپنے بیٹوں پر بوجھ بن جائے۔ ''اب تم سب کے اپنے بیوی بچے ہیں'' وہ یہی الفاظ دہراتی رہتی ہے۔ ''کیا پانچ بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنا کسی اجر کا تقاضا نہیں کرتا، یہ کسی گنتی و شمار میں نہیں؟'' میں اپنی ماں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ مالی لحاظ سے ہم پر انحصار کرے تو اس کا حق بنتا ہے، حالانکہ ماں کے حصے میں اولاد کی طرف سے صرف چند سکوں کا آ جانا ایک بہت پریشان کن تصور ہے۔ اس لئے کہ یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ والدین کو ضرورت پڑے تو اب وہ مکمل طور پر ہماری مدد کے مستحق ہیں میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اب میری ماں کا شمار معمر لوگوں میں ہوتا ہے اور یہ وہ لفظ ہے جو کمزوری و ناتوانی، بے توقیری، مکمل طور پر دست نگری اور تنہائی کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ معمر لوگ وہ ہوتے ہیں جو زندگی کے اس دور میں ضرور داخل ہوتے ہیں اور جو اس مرحلے میں بہت سست رو اور سست ادراک ہو جاتے ہیں۔

میری ماں ان لوگوں کی حالت زار کو بہت سوں سے بہتر جانتی ہے۔ وہ بیس برس تک ۳۰۳۰ پارک ایوانیو میں واقع معمر لوگوں کیلئے یا سینئر شہریوں کے لئے رہائش گاہ میں بطور نرس کام کرتی رہی ہیں۔ (ایسے معمر لوگوں کیلئے ہمیں کوئی مناسب لفظ نہیں مل رہا جس میں سے مثبت معانی نکلتے ہوں) ایسے لوگوں کو جو یہاں رہائش پذیر ہوتے ہیں صاحب ثروت اور متمول لوگوں کی توجہ حاصل ہوتی ہے اور اس علاقے میں یہ ریٹائرڈ لوگوں کی بہترین رہائش گاہ ہے۔ البتہ جب یہاں مقیم ریٹائرڈ افراد زندگی کے آخری ایام میں ہسپتالوں میں منتقل ہو جاتے ہیں تو ان کے شب و روز کو زیادہ خوشگوار بنانا ممکن نہیں رہتا۔ نرسیں یقیناً پوری کوشش کرتی ہیں کہ انہیں خوش رکھ سکیں مگر سر پر منڈلاتی موت کے تصور کو ان کے ذہنوں سے نہیں نکال سکتیں اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ نرسیں ہسپتالوں میں منتقل ہونے والے افراد کے خاندان تو نہیں بن سکتیں جو اپنے بزرگوں کو دیکھنے ہسپتال کبھی نہیں آتے۔ میری ماں ہمیں اپنے مریضوں کی تنہائی کے بارے میں اکثر بتایا کرتی تھیں اور یہ ذکر ضرور کرتی تھیں کہ ان مریضوں کو موت کا سامنا خود ہی کرنا ہوتا تھا، اس وقت جب کوئی بھی پاس نہ ہوتا تھا۔ میری ماں اپنے لئے دعا کیا کرتی تھیں کہ وہ اسی طرح مرے جس طرح اس کے پاپا (میرے نانا) مرے تھے: دم رخصت وہ کام کرتے تھے اور خود کفیل تھے کسی کے محتاج اور دست نگر نہیں تھے۔ مگر میری ماں کی صحت اچانک زیادہ خراب ہو گئی

Marfat.com

ہے اور ڈاکٹروں کو شبہ ہے کہ وہ شاید ہی کبھی کام پر واپس آسکے گی۔ میرے پاپا ریٹائرمنٹ پر مجبور کردیئے گئے تھے اب میرے والدین سوشل سیکورٹی (محکمہ سماجی تحفظ) پر انحصار کرتے ہیں۔ جو کچھ یہاں سے ملتا ہے اس کا تیسرا حصہ پراپرٹی ٹیکس کے طور پر نکل جاتا ہے اور بیٹوں کی طرف سے مالی مدد بھی یقینی نہیں ہوتی۔ جس گھر میں میرے پاپا اور میری ماں تقریباً چالیس برس مقیم رہے تھے، میرے پاپا نے اسے بیچ دینے کا خیال ظاہر کیا ہے، مگر میری ماں کو ڈراؤنا خواب نظر آتا ہے کیونکہ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اس کی زندگی میں یہ گھر بک جائے۔ زندگی کے ''سنہرے دن'' اب سمٹ کر زندہ رہنے کے لئے روزانہ یک نئی کشمکش اور تگ ودو میں سما گئے ہیں۔ میرے والدین کو یہ احساس بھی پریشان کئے ہوئے ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی بیمار پڑ گیا اور علاج معالجے کا عرصہ طویل ہو گیا تو جو تھوڑا بہت آڑے وقت کیلئے بچا رکھا ہے وہ سب کچھ خرچ ہو جائے گا۔

ہمارے کلچرز سے زیادہ غریب کلچرز میں بھی اپنے معمر افراد کو ہم سے زیادہ عزت وآبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا حوصلہ دیا جاتا ہے، ان کی خدمت ہوتی ہے، بے شک معاشی واقتصادی امور بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر روایتی تہذیب وتمدن میں خاندانی رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں جہاں ایک دوسرے کے خیال کو اپنی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ خاندانی اکائی کی مرکزیت کا تصور جو مغرب میں شروع ہوا تھا اور اب دنیا بھر میں ایک حقیقت کا روپ دھار چکا ہے وہ ناگزیر معاشرتی تبدیلیوں سے عمل میں آیا تھا: مثال کے طور پر صنعتی کارخانوں کے قیام نے اہم کردار ادا کیا۔ لیکن معاشرتی تانے بانے میں قدرتی اور ضروری تبدیلیوں سے ہمارے معاشرے کے بوڑھے افراد کی پریشان کن صورتحال میں تو اس سے کوئی تبدیلی نہیں آتی نہ ہی مغرب میں خاندانی ٹوٹ پھوٹ کو اس سے بچایا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرانے فیشن کی ایک خودغرضی اور لالچ کو اس معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

امریکی نومسلموں کے والدین اپنے بچوں کے قبول اسلام سے متعلق بہت سے تحفظات رکھتے ہیں، کئی باتیں اخفا میں رکھتے ہیں مگر ایک بات بڑی خوش آئند ہے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد ان کے اور ان کے نومسلم بچوں کے درمیان رشتہ وتعلق اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ قبول اسلام کے بعد مجھے اپنے مسلمان بھائیوں نے بار بار یاد دلایا کہ والدین کے کیا حقوق ہیں اور

Marfat.com

بیٹے کی حیثیت سے مذہبی لحاظ سے میری کیا ذمہ داریاں بنتی ہیں۔ان میں صرف تہذیبی یا تمدنی تناظر میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہی شامل نہیں تھا کیونکہ جیسا کہ اسلام میں کئی جگہ اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ اپنے خاندان والوں اورعزیز واقارب کے ساتھ ہمیں اپنے تعلقات بہتر رکھنے ہیں۔خاندانی اکائی کو ایک اعلیٰ وارفع مقام دیا گیا ہے۔جس میں دادا، نانا،، دادی، نانی، چچا، ماموں، چچی، ممانی، خالہ، پھوپھی اور خالہ زاد، ماموں زاد سبھی شامل ہیں۔اسلامی قوانین میں خاندانوں کے آپس کے تعلقات اور مراسم پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جس سے اسلامی معاشرے کی تشکیل کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم ممالک میں حکومتوں نے اکثر مستند اسلامی قوانین کو نظر انداز کیا اس لئے عموماً عائلی قوانین کو نافذ کیا گیا۔(۱۰)

جدید معاشرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نوجوانوں کا معاشرہ ہے، اس لئے کہ اس کے فیشن، خوراک، موسیقی، فن، اشتہارات اور بہت سی دوسری چیزیں نوجوانوں کے حسب خواہش ہوتے ہیں۔یہ معاشرہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ نوجوانوں کے تازہ رجحانات کیا ہیں جن سے وہ خاطر خواہ توانائی، ہردم رواں اور جوشیلے رہنے کی صلاحیت اور قوت و جوش حیات حاصل کرتے ہیں۔یہ یقیناً ان کلچرز کو گراں گزرے گا جو اپنی روایات پر انحصار کرتے ہیں خصوصاً اسلامی کلچر، جس کے بارے میں یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ یہ نوجوانوں کا کلچر ہے کم از کم اس طرح سے، یا ان معنوں میں جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔

اس میں شک وشبہ نہیں کہ محمد ﷺ کے ابتدائی ماننے والوں اور پیروکاروں میں ایسے نوجوان مرد اور عورتیں شامل تھے جو عمر کے لحاظ سے بیس کی پہلی دہائی میں تھے (۱۱) اور قرآن ان کے بارے میں بتاتا ہے کہ یہ

> ''جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔'' (۲: ۱۷۰۔۵: ۱۰۴)
> (۷: ۲۸۔۲۱۔۵۳، ۳۱۔۲۱)

مگر آنحضرت ﷺ کی دانائی اور تجربہ اور آپؐ کے معمر ساتھیوں کی دانائی اور تجربہ جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ شامل ہیں۔ان کا وجود تحریک کی

Marfat.com

کامیابی کیلئے بہت ضروری تھا۔ مزید یہ کہ قرآن دانائی سے بھرپور ان صحیح احادیث کو بڑی اہمیت دیتا ہے کیونکہ ان کے پیغام کا لب لباب تاریخ کے ذریعے نبیؐ سے پہلے گزرنے والے تمام انبیاء تک پہنچا تھا۔ اسلام نے بہت سی بگڑی ہوئی مروجہ رسوم کو معاشرتی زندگی سے نکال باہر کیا مثلاً نوزائیدہ بچیوں کا قتل، سود، شراب نوشی لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری کئی رسموں کو اسلام نے نئی اور بہتر شکل دی (مثلاً حج، تعداد ازواج، طلاق، وراثت) اور مزید کئی رسوم کو جاری رکھنے کی اجازت دیدی۔ آخری قسم میں اپنے بڑوں کا ادب شامل تھا، خصوصاً والدین کا۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت میں یہ بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ والدین کا ادب کیا جائے اور ان سے ذرا سی بھی جھنجھلاہٹ اور بے صبری یا ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرنے کی ممانعت کردی گئی:

> ''اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آؤ'' (۴:۳۶) ''تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ''پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا'' (۱۷: ۲۳۔۲۴)

> ''(اسی لئے ہم نے اسے نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان، دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ'' (۳۱: ۱۴۔۱۵)

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مسلم امہ میں شمولیت کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ میرے اپنے والدین کے ساتھ مراسم پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اس موضوع پر یہ چند ایسی احادیث

Marfat.com

نبوی ہیں جو فوری طور پر میری توجہ کا مرکز بنیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خاک آلود ہو ناک اس کی، پھر خاک آلود ہو ناک اس کی پھر خاک آلود ہو ناک اس کی جو اپنے والدین میں سے ایک یا دونوں کو زندہ پائے، وہ بڑھاپے کو پہنچ رہے ہوں اور وہ ان کی خدمت کر کے جنت میں نہ داخل ہو۔ (صحیح مسلم) ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور جنگ میں حصہ لینے کیلئے آپؐ کی اجازت طلب کی۔ نبیؐ نے اس سے پوچھا: ''کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟'' اس شخص نے جواب دیا: ''جی حضور ﷺ وہ زندہ ہیں۔'' آپؐ نے پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''پھر تم ان کی خدمت کر کے یہ سمجھو کہ تم جنگ میں حصہ لے رہے ہو'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم) جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ اللہ کو انسان کا کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے تو حضور نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: ''وقت پر نماز ادا کرنا۔'' پھر پوچھا گیا اس کے بعد، تو آپؐ نے جواب دیا: ''والدین سے حسن سلوک کرنا'' ایک بار اور پوچھا گیا کہ اس کے بعد تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا'' (۱۲) صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اسلامی عہد سے پہلے عربوں میں ماں کی تعظیم و تکریم کتنی کی جاتی تھی۔ جو شواہد ملتے ہیں ان سے صحیح صحیح اندازہ تو ہم نہیں لگا سکتے مگر اس بات کا ہمیں یقین ہے کہ ایک عرب ماں کو والدین کے ادب و احترام میں سے اس کا حصہ ملتا تھا۔ حج کے بارے میں اور نوزائیدہ بچوں کی نسبت بچیوں کو زندہ مار ڈالنے کے رواج کے بارے میں آیت (۲: ۲۰۰) میں ذکر ہو چکا ہے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی روشنی پھیلنے سے قبل عرب کلچر میں، دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن کی طرح مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل تھی اور باپ کو ماں کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہودی، عیسائی اور عجمی تحریروں سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے۔ (۱۳): اگر صورتحال یہ ہو تو پھر اسلام تو نہ صرف والدین کے احترام پر زور دیتا ہے اور اولاد کے لئے اسے ایک ذمہ داری کے طور پر رواج دیتا ہے بلکہ تعظیم و تکریم میں ماں کا حصہ باپ کی نسبت زیادہ ٹھہراتا ہے۔

''ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت

Marfat.com

اٹھا کر اس کو جنا'' (۴۶: ۱۵) ''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہنچانے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔'' (۳۱: ۱۴)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور پوچھا: ''میرے حسن سلوک اور اچھی رفاقت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟'' آپؐ نے جواب دیا: ''تمہاری ماں'' اس شخص نے اصرار کرتے ہوئے پھر پوچھا: ''اس کے بعد؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری ماں اور اس کے بعد تمہارا باپ۔'' (۱۴) (صحیح بخاری، مسلم)

صحیح معنوں میں ایک دینی معاشرہ روایت پر بہت انحصار کرتا ہے اور والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ روایات اور تعلیمات کو آنے والی نسل کو منتقل کر دے۔ ایسے نظام میں والدین اور عمر میں بڑوں کیلئے عزت واحترام ایک قدرتی ضرورت ہے اور اسلام میں یہ موجود ہے۔ ہم اسلامی نظام سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اس میں وہی سریع الحرکتی کیفیت ہوگی جیسی آج کے مغربی کلچر میں ہے جسے مسلمان سماجی عدم استحکام کا نام دینے کا میلان رکھتے ہیں بجائے اس کے کہ اس کو کوئی مثبت شے سمجھیں۔ اسلامی معاشرہ اپنے ماضی کے ساتھ اور اس شے کے ساتھ جو مستقل اور غیر متغیر ہو تسلسل اور ہم آہنگی تلاش کرتا ہے۔ اس کے ماضی و مستقبل کے درمیان والدین اپنے بچوں سمیت ایک پل کا کام دیتے ہیں اور یوں ان کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے۔ انہیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ اپنے بڑوں کیلئے تعظیم وتکریم کو عام کرنے اور دیرپا رہنما اصولوں کو نوجوان نسل تک منتقل کرنے میں کامیاب رہیں۔ ان سے اس بات کا تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں کی زندگیوں کا پورا پورا خیال رکھیں اور ''پہلے میں'' کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ میں پہلے ہی مسمانوں کے والدین کے ساتھ تعلق ورشتہ کے موضوع پر کافی بحث کر چکا ہوں، اب میں مختصراً باپ اور ماں کے اپنے بچوں کیلئے فرض کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔

بچوں کے ساتھ والدین کا سلوک کیا ہونا چاہئے اس بارے میں قرآن میں براہ راست چند واضح اعلانات موجود تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ایسی ذمہ داریوں کا ذکر اس وعظ ونصیحت کے

Marfat.com

اندر موجود ہے جو عام طور پر عزیز و اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور رویے کے بارے میں کی گئی ہے۔ قرآن میں تمام مومنین کو بار بار تاکید و تنبیہہ کی جارہی ہے کہ مساکین اور یتامیٰ کی ضرورتوں کو نظر انداز مت کرو قرآن مثال کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں میں یہ دلنشین جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ مرد یا عورت اپنے بچوں کے مستقبل کی اہمیت کو سمجھے۔ جب حضرت مریم کی ماں (۳: ۳۵) حضرت زکریاؑ (۳: ۳۸) یا حضرت ابراہیمؑ ۱۴: ۳۵، ۱۴: ۴۱) اللہ سے بیٹے کی درخواست کرتے ہیں یا اولاد کی دعا کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ عرض کرتے ہیں کہ اولاد صالح ہو اور اللہ سے ڈرنے والی ہو۔ قرآن میں ایسی بے شمار مثالیں دی گئی ہیں جہاں والدین اپنے بچوں سے اس شوق اور لگن کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے خدا سے عہد کریں اور یہ والدین اپنے بچوں سے اخلاقیات اور دستور حیات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ (۲: ۱۳۲، ۱۱: ۴۳، ۱۲: ۱۲، ۱۸: ۶۴۔ ۶۷: ۱۲: ۹۸) اس کی ایک بڑی نازک سی مثال حضرت لقمان اور ان کے بیٹے کی پیش کی گئی ہے۔

> ”یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: ”بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے ......(اور لقمان نے کہا تھا کہ) بیٹا کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمان میں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے، اس پر صبر کر، یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔“
> (۳۱: ۱۳۔۱۹)

قرآن میں آیا ہے کہ وہ والدین جو ایمان لے آئے ہوں، ان والدین کے مقابلے میں

Marfat.com

جو ایمان نہ لائے ہوں جیسے حضرت ابراہیمؑ کے والد، اپنے بچوں کے ساتھ درشت اور سخت لہجے میں بات نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں تو قوت برداشت، صبر وتحمل، بچوں کی فکر اور دینی معاملات میں بچوں کی ترقی اور زیادہ دلچسپی کا ہمیشہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ والدین کی اپنے بچوں کیلئے شفقت ومحبت اور فکرمندی والی مذہبی صفت قرآن کے ایک مسلم قاری میں بھی اپنے بچوں کیلئے احساس ذمہ داری پیدا کرتی ہے، جسے ایک قرآنی تنبیہہ میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ (٦٦:٦)۔

اس بات کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے کہ محمد ﷺ بچوں سے مثالی پیار کرتے تھے۔ ایک بار کسی بدو نے لاف زنی کرتے ہوئے حضور ﷺ کو بتایا کہ اس کے قبیلے کے لوگ اس قدر کھردرے مزاج کے ہیں کہ اپنے بچوں تک کو بوسہ نہیں دیتے۔ نبیؐ نے فرمایا: ''اگر اللہ نے تمہارے دلوں سے رحم نکال دیا ہے تو کیا میں تم پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکتا ہوں؟''

قرآن میں دیئے گئے بہت سے حوالہ جات سے ہمیں ایک ملا جلا پیغام ملتا ہے کہ اسلام سے پہلے معاشرے میں والدین کے کردار کو کس طرح لیا جاتا تھا۔ قرآن میں ایسی آیات شامل ہیں جن میں والدین کے جذبات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ تمام زمانوں کے لوگوں کی مانند یہ لوگ بھی اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ قرآن میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ محمدؐ کے معاصرین میں کسی خاندان کے افراد کی تعداد کسی مرد کی شجاعت و بہادری اور کامیابی ماپنے کا آلہ سمجھی جاتی تھی۔ (٣: ١٠، ١٤، ٩: ٥٥، ١٨: ٤٦، ١٩: ٧٧، ٢٦: ٨٨، ٣٤: ٣٥)

ایسا لگتا ہے کہ اس فخر یا ناز کی بنیاد صرف بیٹوں کی تعداد پر ہوتی تھی بیٹیوں کی تعداد پر نہیں، اس لئے کہ بہت سی آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچیوں کی پیدائش کو تو ایک ذمہ داری تصور کیا جاتا تھا۔ اگلے دو حوالے اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں: پہلے حوالے میں کفار کے اس عقیدے پر طنز کی گئی ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں تھے جبکہ کفار خود بچی کی پیدائش کو اپنے لئے باعث ہتک سمجھتے تھے اور دوسرے حوالے میں اس رویے کی مذمت کی گئی ہے اور اس کے تاریک ترین پہلو کو رد کیا گیا ہے اور وہ ہے بیٹیوں کو زندہ درگور کر دینے کا فعل۔

Marfat.com

''کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔'' (۴۳:۱۶۔۱۷)

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں۔'' (۱۶:۵۸۔۵۹)

یہ ناانصافی حضور ﷺ کی بہت سی احادیث کا موضوع ہے۔ گو آج بھی کئی مسلم کلچرز میں بیٹی کی نسبت بیٹے کی پیدائش پر زیادہ خوشی منائی جاتی ہے مگر اس صدی میں مسلمانوں کی مذہبی بیداری سے بیٹے کو زیادہ اہمیت دینے کے آثار ختم ہو رہے ہیں اور کم از کم تعلیم یافتہ طبقے میں تو ایسا شروع ہو چکا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

جس کسی کو بھی دو بیٹیاں عطا ہوئی ہیں یا جو دو بہنوں کی پرورش کر رہا ہے اور وہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے تو ایسا شخص اور میں، ہم دونوں جنت میں اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے ...... اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہا۔ (۱۶)

اور جس شخص کی کوئی بیٹی ہو اور وہ اس کی تحقیر نہ کرتا ہو اور نہ ہی بیٹے کو اس پر فوقیت دیتا ہو تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (امام حنبل) (۱۷)

میرے مسلمان بھائیوں نے اس آیت کا حوالہ دے کر مجھے بے شمار موقعوں پر یاد دلایا

Marfat.com

ہے کہ میں کس قدر خوش قسمت ہوں جس کی تین بیٹیاں ہیں۔

اسلام میں ایک خاندان کے مختلف افراد کے درمیان رشتہ وتعلق کو جو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ اس امر کا قدرتی نتیجہ ہے کہ ایمان وعقیدے پر عمل معاشرے کے اندر رہ کر ہوتا ہے جہاں یہ ارتقائی عمل سے گزر کر تکمیل تک پہنچتا ہے۔ خاندان چونکہ ہم سے ہمارے جذباتی اور مادی سرمایے کے زیادہ سے زیادہ حصے کا مطالبہ کرتا ہے اس لئے اس سرمایہ کاری سے سیکھنے، سکھانے، عدل وانصاف اور نیکی واچھائی کے عمل کا ایک معیار تشکیل پا جاتا ہے۔ اس بات پر حیرت کے اظہار کی ضرورت بہت کم رہ جاتی ہے جب ہم آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنتے ہیں کہ شادی ''ایمان کا نصف حصہ) ہوتی ہے۔ (۱۸) اور قرآن پاک بھی مومنوں کو شادی کی تاکید کرتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے بلکہ مثالی معلوم ہوتا ہے مگر یہ بات اپنے ہمعصر جدید معاشرے اور خصوصاً مغربی معاشرے کے خلاف کیسے جاتی ہے؟ کیا یہ بات عملی طور پر ممکن ہے کہ بالغ نوجوان اپنے بچوں اور والدین پر خرچ کریں؟ یہ انہیں کہاں پہنچا دے گا؟ انہیں اس عمل سے کیا حاصل ہوگا؟ ان دنوں بہت سے میاں بیوی یہ محسوس کرتے ہیں کہ گھر چلانے کیلئے دونوں کو نوکری کر لینی چاہئے۔ اس ضمن میں تہ تک پہنچ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''ہم کن تبدیلیوں یا قربانیوں کی جانب بڑھ رہے ہیں؟''

مختلف تناظر

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں مردوں اور عورتوں کے لئے کوئی بڑی آزمائش نہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔'' (۱۹) (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

ہمارے نقطہ ہائے نظر خلاء میں تو جنم نہیں لیتے، یہ کسی شخص کے ماحول، پس منظر، تجربے اور شخصیت سے مل کر ترکیب پاتے ہیں۔ یہ کسی انسانی کوشش میں منعکس ہوتے ہیں، اس کوشش میں جو معاشرے کے لئے جامع رہنما اصول حاصل کرنے کے لئے کی جائے۔ اس لئے کہ قابل اطلاق اور موزوں نتائج ہمیشہ ایک خاص وقت اور مقام تک محدود ہوتے ہیں۔ وحی کا ایک معجزہ ہے کہ اس کا ابلاغ اور خبر رسانی ایک خاص امہ کے ذریعے اور وسیلے سے دوسروں تک ہوتا

Marfat.com

ہے، ایک ایسے پیغام کا ابلاغ جو بالکل مختلف قسم کے لوگوں کیلئے موزوں اور مفید مطلب ہے۔ اس میں ہمارا حصہ صرف یہ سیکھنے یا جاننے تک محدود نہیں ہے کہ ابتدائی عہد کے گروہوں اور برادریوں نے وحی کو کیسے سمجھا تھا۔ اس لئے ہم سے تو یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ہم تو اسے دوسروں تک پہنچاتے وقت خود اس پر عمل کر کے دکھائیں۔ اس دور میں اس سے کم کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کی عالمگیر حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور آئندہ آنے والی نسلوں کو وحی کی دوامی مطابقت سے دور کر رہے ہیں۔

مجھے اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہے کہ مسلم معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے کردار پر میرے نظریات، بلکہ ان تمام موضوعات پر جنہیں میں زیر بحث لایا ہوں میرے نظریات، میرے مخصوص حالات سے کافی حد تک متاثر ہیں اور کسی اور کے بارے میں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی لئے یہ سچ ہے کہ تبصرے اور تشریح و تصریح کے عمل کو کبھی رکنا نہیں چاہئے۔ دراصل تمام مجددین خواہ وہ روایت پرست ہوں یا جدت پسند اس بات پر متفق ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ بہت سی غیر ضروری تکلیف دہ اور ثقافتی اضافی باتیں مسلم افکار و عمل میں در آئی ہیں اور یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ''اصلی اور سچے'' اسلام کو رواج دیں۔ ان میں سے بہت سے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں قرآن اور احادیث نبویؐ کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاہم اس میں چونکہ تشریح و تصریح بھی قابل توجہ امر ہے اس لئے ان کے مطالعہ میں ہمارے درمیان اختلاف رائے کا پایا جانا لازمی بات ہے۔ چنانچہ سوچنے کی بات یہ آ جاتی ہے کہ صحیح اور درست تشریح کو غلط یا نادرست تشریح سے کیسے جدا کیا جائے۔ قابل قبول و ناقبول اور مسلمہ معیار پر پوری اترنے والی اور نہ اترنے والی حدیث کا فیصلہ کیسے کیا جائے؟ وہ حضرات جن کا تعلق روایت پرست مسلم معاشروں سے ہے انہیں نہایت اہم کردار ادا کرنا ہے کیونکہ انہوں نے آلودگی کے اثرات کو اندر سے کمزور بناتے وقت دیکھا ہے اور قبول اسلام کے تجربے سے خود گزرے ہیں، خواہ معاشرتی سطح پر ان کا یہ تجربہ مسلمہ طور پر ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ مگر مسلم دنیا سے تعلق ہو تو اس کے کئی نقصانات بھی ہیں کیونکہ وہ ایک حد تک اس معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں جسے وہ پاک و صاف بنانے کی کوشش میں ہوتے ہیں، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو واقعیت کو مشکل بنا دیتی ہے۔ باہر کے لوگوں کی تنقید ایک خاص قدر و قیمت

Marfat.com

کی حامل ہے۔ (اس وقت میرے ذہن میں اسلامیان مغرب کا کام ہے) مگر یہ لوگ اکثر متعصب بہت ہوتے ہیں، اگر کم متعصب بھی ہوں تو اسلام کو سمجھنے یا اس کی تفہیم کے لئے ان میں لازمی عنصر اور صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے: یہ اس کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں رکھتے، کیونکہ اسلام تو ایک طرز حیات کا نام ہے، اسے بسر کرنے کیلئے اسے صحیح صحیح سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک نومسلم داخل ہوتا ہے اور اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر داخل ہوا ہے، کیونکہ ایسا انسان ایمان و یقین اور تشکیک پرستی کو یکجا کر لیتا ہے جو کبھی اسے اہم اور الہامی بصیرت تک لے جاتا ہے۔ نومسلم مذہبی روایات میں مضبوط اور مستحکم بنیاد نہیں رکھتے اور ان سے یہ بھی توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ بنیادی، ایک جیسے نظریات بھی لائے ہوں گے جنہیں مسلم برادری کی اکثریت جانچتی پرکھتی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کے کسی پہلو میں روایتی اور جدید تصورات کے درمیان پایا جانے والا تناؤ اس قدر واضح نہیں ہوتا جتنا مردوں اور عورتوں کے کردار کی ادائیگی میں ہوتا ہے۔ بہت سے شارحین جب محمد ﷺ کی اس حدیث پر بحث کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں مردوں کی نسبت عورتوں کیلئے زیادہ بڑی آزمائش چھوڑے جارہا ہوں'' تو ان کا اشارہ شہوانی خواہش کی طرف ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ بہت محدود ہو۔ بہت سے دور حاضر کے مسلم مفکرین اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ طاقتور تہذیبی اور ثقافتی قوتیں خواتین کے حقوق کے راستے میں رکاوٹیں بن جاتی ہیں اگر یہ حقیقت ہے تو غالباً آنحضرت ﷺ کے ذہن میں یہ بات بھی ضرور رہی ہوگی کیونکہ شک کے بغیر آج اسلام اور مغربی دنیا میں اس کی قبولیت کے درمیان جو سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی ہے۔ وہ ہے اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ۔ مزید یہ کہ جب تک یہ معاملہ تسلی بخش طریقے سے ان کے اطمینان کے مطابق حل نہیں ہو جاتا بہت سے مغربی نومسلم امہ کا حصہ نہیں بن سکیں گے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے میں نے چند ایک قومی سطح کی خواتین کی تحریکوں کی بادل نخواستہ حمایت کی تھی مگر اپنے معاصرین کی طرح زیادہ تر میں بھی مرد و زن کے کردار معاصر خیالات کا بددلی سے ساتھ دے رہا تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ یہ رول جیسا کسی زمانے میں تھا اب ویسا نہیں رہا، اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ مگر عملاً میرے پاس واضح طور پر ان کے لئے

کوئی نعم البدل موجود نہیں تھے کہ اپنی اپنی جگہ ان کا رول کیا ہونا چاہیے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں عورتوں کی تحریک بھی آہستہ آہستہ اسی راستے پر چل پڑی جس پر اس زمانے کی دوسری تحریکیں چل رہی تھیں۔ ابتداً تو اس نے لوگوں کے ذوق وشوق کو بڑا ابھارا اور چند ایک اہم اور مثبت نتائج بھی پیدا کئے مگر پھر ہر کوئی اس سے بیزار ہو گیا اور یہ ختم ہو گئی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بہت شدومد سے شروع ہوئی تھی اور اس میں انتہاء پسندی پائی جاتی تھی۔ اس میں نہ صرف مساوی حقوق کی وکالت کی گئی تھی بلکہ کاملاً مساوات یا مساوی درجے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بہت سے نظریات وضع ہوئے جن میں اس بات کی تفصیل بیان کی گئی تھی کہ مرد اور عورت میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں حالانکہ روزمرہ تجربہ اس کے برعکس بتا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے خواتین کی تحریک اپنا پیغام مؤثر طور پر نہ پہنچا سکی ہو یا اس بات پر اجماع اور اتفاق رائے نہ ہو کہ پیغام تھا کیا۔ یہ ایک قسم کے جنسی تعلق کا مطالبہ تھا۔ جبراً مردوں اور عورتوں کو ہم جنس بنانے کے عمل کا مطالبہ جس میں عورتوں کا مردوں جیسا بن جانا زیادہ شامل تھا اور اس کے برعکس مردوں کا عورتوں جیسا بننا کم۔ حالانکہ عورتوں کی یہ تحریک کوئی سمت دینے میں ناکام ہو گئی تھی مگر پورے یقین کے ساتھ یہ ضرور باور کرا گئی تھی کہ معاشرہ عورتوں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور ۱۹۸۲ء میں جب میں مسلمان ہوا تو میں اس صورتحال سے پوری طرح اتفاق کرتا تھا۔

اسلام لانے سے قبل مجھے مسلم مردوں اور عورتوں کے تعلق ورشتے کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں۔ میں ایک سے زائد ازواج، پردے اور خواتین اور مردوں کے غیر مخلوط اجتماعات کے بارے میں جانتا تھا لیکن ان سے ظلم و زیادتی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ مثال کے طور پر غیر مخلوط اجتماعات کو لے لیجئے ہر دور میں سے ہر ایک صنف کی رائے میں مخلوط اجتماعات پر پابندی لگنی چاہئے۔ اگر عورتوں کو مردوں کی تقریبات میں شامل ہونے سے روکا جاتا ہے تو مردوں کی بھی عورتوں کی تقریبات میں شرکت پر پابندی لگنی چاہئے۔ اس کے علاوہ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ان باتوں کا تعلق کلچر سے تھا مذہب سے نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ مسلم خواتین دنیا بھر میں سب سے زیادہ مردوں کے تسلط میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ معاصر مغربی فکر میں اس بات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ماضی میں لکھے جانے والے ناولوں کی کہانیوں میں جہاں مسلم ممالک کا معاشرہ پیش کیا جاتا تھا ان میں اسی بات کا

Marfat.com

چرچا ہوتا تھا اور آج کل فلموں اور ٹیلی ویژن پر پیش کی جانے والی کہانیوں میں بھی اسی تصور کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ حال ہی کی ایک فلم کا منظر کچھ یوں ہے کہ ایک خاتون گولڈی ہان جو آزادی ورہائی پانے والی امریکی عورت کی نمائندگی کرتی ہے، آہو چشم، نقاب پوش، حسین وجمیل (بیشک حسین!) مشرق وسطیٰ کی عورتوں کے ایک گروپ کو ملکی دارالحکومت کی سیر کیلئے لے جاتی ہے، پس منظر میں الہامی اور وجدانی لے لئے موسیقی کی موجودگی میں وہ انہیں کچھ پڑھ کر سنا رہی ہے جو انہیں اس موسیقی کی ہیئت کے متعلق بام عروج تک پہنچا رہی ہو۔ یہ منظر مشرق وسطیٰ کی خواتین کی بالکل غلط اور جھوٹی تصویر پیش کرتا ہے مگر یہ اوسط امریکی ذہن کی بالکل صحیح عکاسی کرتا ہے۔

اب اگر آپ شعوری طور پر چوکنے بھی رہیں کہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے پھر بھی اس کا آپ پر اثر ضرور ہوگا۔ پھر چونکہ اس کے برعکس دوسرا متبادل منظر آپ کو دکھایا ہی نہیں جا رہا آپ لامحالہ طور پر یہ یقین کر لیں گے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا ہے اس میں کسی قدر سچائی اور حقیقت تو ضرور ہوگی۔ میں جب مسلم امہ میں داخل ہوا تو اس بنیاد پر مجھے ہر لحاظ سے توقعات کم تھیں۔

مسلمانوں سے آٹھ برس تک کی مسلسل رفاقت اور ان کے درمیان موجودگی کے بعد اور مشرق وسطیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آنے کے بعد میں دوسری معلومات کے تناظر پر بھی توجہ دینے پر مجبور ہوں۔ مسلم عورتوں کے پردے کو امریکی یہ رنگ دیتے ہیں کہ مسلمان عورت مرد کے زیر تسلط زندگی بسر کرتی ہے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ میں عورتوں کا لباس بہت تشہیری اور استحصالی ہے۔ بہت سی مسلمان عورتیں چونکہ گھریلو خواتین بننے کو ترجیح دیتی ہیں اس لئے ان پر زیادتی ہوتی ہے انہیں مظلوم بننا پڑتا ہے چونکہ بہت سی امریکی عورتیں کل وقتی ملازمتیں کرتی ہیں اس لئے وہ غیر محفوظ ہیں۔ اسلامی دنیا میں نوجوانوں کی شادی کے سلسلے میں خاندانوں کی مرضی بہت حد تک شامل ہوتی ہے جبکہ امریکی خاندان اپنے بچوں کی شادیوں کے سلسلے میں بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک فریق جسے محکومی کا نام دیتا ہے دوسرا اسے عین آزادی تصور کرتا ہے۔ یہ بات کوئی اتنی مشکل بھی نہیں کہ سمجھ میں نہ آ سکتی ہو مگر اس وقت جبکہ آپ کلچرز کی گرفت میں آ گئے ہوں اس وقت کیا بنے گا؟

Marfat.com

اسلامی مرکز کا رُخ

اسلام قبول کرنے کے چند ہفتوں بعد میں نے پہلی بار اسلامی مرکز جانے کا فیصلہ کیا تا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ مل کر جو میری دانست میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف تھے اپنے نئے عقیدہ و ایمان کو ایک مذہبی رسم کے طور پر مناسکوں۔ میں نے بڑا تردد کر کے اسلامی لحاظ رکھتے ہوئے نیا لباس سلوایا اور شہر سے اپنی گاڑی میں روانہ ہوتے وقت قرآن حکیم کے پہلے پارے کی تلاوت کی ریہرسل کی۔ مجھے جلد ہی گاڑی پارک کرنے کیلئے بہت ہی مصروف پارکنگ میں جگہ مل گئی تھی اسلامی مرکز کے ایک بڑے کمرے کے عقب میں صدر دروازہ کھلتا تھا، جسے نماز کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ فرش پر کم از کم سوا ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر تازہ تازہ سفید رنگ کیا گیا تھا، یہ دیواریں تقریباً چالیس فٹ بلند ہو کر سفید گنبد نما چھت کو چھو رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار میں ایک منبر بنا ہوا تھا جس پر تزئین کیلئے خطاطی کی گئی تھی۔ میں نے اپنے تصورات میں اس جگہ کو ہمیشہ ایسا ہی دیکھا تھا۔

جو لوگ مجھے دیکھنے کو مڑے وہ بہت حیران دکھائی دیتے تھے۔ مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں، چنانچہ میں نے اپنے قدم روک لئے، مزید آگے نہیں بڑھا۔ میں ان سے بیس فٹ پیچھے بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا میں انہیں پہل کرنے کا موقع دوں گا مگر ان میں سے کسی نے پہل نہیں کی، کوئی میری جانب متوجہ نہیں ہوا۔ نہ کسی نے مجھ سے اپنا تعارف کرایا، نہ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی اور نہ ہی کسی نے ''السلام علیکم'' کہا۔ میں حیران ہو کر سوچ رہا تھا کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ نماز میں صرف مرد شامل تھے سب لوگ ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کر رہے تھے کچھ باتوں میں مشغول تھے مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی محض ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بے گانگی کے سوا مجھے کچھ نہ دیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں کوئی جذام یا کوڑھ کا مریض ہوں جس سے اس قدر اغماض برتا جا رہا ہے۔ جسے ملنے سے یوں پرہیز ہو رہی ہے۔

اذان ہوئی، ہم نے نماز ادا کی مگر میں جہاں بیٹھا تھا میں وہاں تنہا تھا نماز سے فارغ ہو کر میں کمرے کے سامنے والے حصے کی جانب بڑھا تا کہ باہر جانے کیلئے بغلی دروازہ استعمال

Marfat.com

کرسکوں۔ میں نے وہاں موجود اپنے ''بھائیوں'' میں سے کئی ایک کے ساتھ آنکھ ملانے کی کوشش بھی کی تاکہ جواباً کوئی بھائی مجھے بھی خلوص و محبت بھری نظر سے دیکھے۔ مگر انہوں نے اپنے سر دوسری طرف موڑ لئے تھے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ان کا یہ طرزِ عمل بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے اس سرد مہری کو اخوت و بھائی چارے کی گرمی سے پگھلانے میں زیادہ وقت درکار ہو۔ میں تو سب سے الگ تھلگ ایک اجنبی نظر آرہا تھا۔ میں دو بار اور بھی اس مرکز گیا مگر ہر بار مجھے یہی سلوک ملا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی وہاں نہیں جاؤں گا۔

یہ محض میرا، ایک فردِ واحد کا تجربہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ اس تجربے میں ایک ۴۵ سالہ امریکی مطلقہ خاتون بھی شامل تھی جس کے ساتھ اس کے دو جوان عیسائی بیٹے بھی تھے۔ میں بارہا دوسری امریکی خواتین سے اسی قسم کی کہانیاں سن چکا ہوں۔ مگر نکی نے جو داستان بیان کی اس میں شامل بہت سی باتیں معمول سے ہٹ کر تھیں بہت سے نو مسلم اسلام اس لئے قبول کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگیوں میں ناخوش اور غیر مطمئن ہوتے ہیں اور اسلام میں انہیں کسی ایسی شے کی تلاش ہوتی ہے جو انہیں طمانیت و سکون بخش سکے اور قبولِ اسلام کا عمل ایک بہت بڑا جذباتی فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر نکی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی زندگی میں ناخوش نہیں تھی۔ اس کا بہترین کیریئر تھا سنیتا باربرا میں اپنا گھر تھا اور اپنی دو بیٹیوں سے بڑی گہری دوستی تھی۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی اور عمر کے اس حصے میں اب کسی مرد ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ سنیتا باربرا میں اس نے ایک عرب عورت کے ساتھ دوستی کرلی تھی اور اس گہری دوستی کے دوران وہ اپنی دوست کے دین کو پسند کرنے لگی تھی۔ پھر خوشی خوشی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی اور بڑی توقعات وابستہ کرکے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اسلامی مرکز میں اس کی مشکلات نے اس کے مسلمان ہونے کے جذبے اور خوشی کو ماند نہیں کیا نہ ہی اس نے حوصلہ شکنی محسوس کی ہے۔ اسے اب تک کئی امریکی مسلمان بھی ملے ہیں اور کچھ کم قدامت پسند مشرقِ وسطیٰ کے دوست بھی اور ان سب نے مل کر ایک چھوٹی سی اسلامی برادری تشکیل کرلی ہے: ان کے باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں، وہ روزے رکھتے ہیں اور انہوں نے باجماعت نماز کا اہتمام کرلیا ہے۔

نماز کے جس اجتماع میں نکی شریک ہوئی تھی وہ بھی کچھ کمتر نہیں تھا۔ ایسی صورت حال میں جس طرح کے ردِ عمل کے اظہار کی انہیں ہمیشہ تربیت دی گئی تھی بالکل اس کے مطابق وہ

Marfat.com

ردعمل ظاہر کر رہے تھے انہیں سکھایا گیا تھا کہ جب کوئی باپردہ خاتون مسجد میں آتی ہے، اسے گھور کر مت دیکھو نہ اس کے قریب جاؤ۔ گویا دوسرے لفظوں میں اسے نظر انداز کرو۔ شمالی امریکہ کے ہر نماز کے اجتماع میں ایسے رویے کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اس اجتماع میں شامل مسلمانوں کی جڑیں امریکی کلچر میں کس قدر گہری ہیں۔ مگر کم وبیش مجھ تک جو امریکی مسلمان عورتوں (نومسلم یا دوسری) کا تاثر پہنچا وہ یہی تھا کہ مسجد میں ان کے آنے کو پسند نہیں کیا جاتا۔

میری اپنی بیٹی نے جو اس وقت صرف چار برس کی ہے یہی تاثر قبول کرلیا ہے۔ ہمارے پڑوسی جو عیسائی ہیں ان کی ایک بیٹی تقریباً ہماری بیٹی جمیلہ کی ہم عمر ہے اور یہ دونوں سہیلیاں ہیں۔ جمیلہ کی سہیلی اسے بتاتی ہے کہ وہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کس طرح چرچ اکٹھے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے ابوامی کے ساتھ بیٹھتی ہے، مذہبی گیت گاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ایک روز میری بیٹی کو معصومیت کے ساتھ اتوار کی عبادت کے موقع پر چرچ ساتھ چلنے کی دعوت دے دی تھی جب اس موضوع پر جمیلہ اور میں نے تبادلہ خیالات کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا:

''پاپا عورتوں کو ہماری مسجدوں میں جانے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ انہیں اجازت ہے مگر اسے یہ سمجھانے میں کافی دیر لگی کہ پھر وہ آتی کیوں نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کب سے اور کیوں کر مساجد کے اندر موجودہ ماحول پیدا ہوا جس نے عورت کے وجود کو برداشت کرنا ختم کردیا تھا، یقیناً کسی اور زمانے میں اور کسی مختلف تہذیبی وثقافتی تناظر میں ایسا ہوا ہوگا دوسرے کلچرز مسلم خواتین کے ایمان کو مضبوط تر بنانے کی دوسری راہیں تلاش کرتے ہیں، تاہم مغرب میں اگر عورتوں کو مسجد کی جگہ کوئی دوسری متبادل جگہ فراہم کردی جائے مثلاً خواتین کا کوئی ہفتہ وار اجتماع رکھ دیا جائے تو اس کے معنی یہ سمجھے جائیں گے کہ اس کلچر میں عورتوں کو مذہبی عبادات کے حوالے سے مردوں کے مقابلے میں دوسرا درجہ دیا جارہا ہے۔ اگر ہم مردوں کے مساوی درجے پر عورتوں کی اپنے اجلاسوں میں شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے تو پھر مساجد کا موجودہ ماحول آہستہ آہستہ بدل سکتا ہے اور یوں ہمیں یقین ہے کہ ہم سے ہمارے بہت سے بچے چھن جائیں گے۔ میں عبادات کی شکل یا ہیئت کو بدل ڈالنے کی وکالت

ہرگز نہیں کر رہا؟ میں تو اس بات کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں کہ ہمیں اپنے خاندان کی خواتین اور بچوں کو اپنے گروہی اجلاسوں میں آنے کی دعوت دینی چاہئے اور اس سلسلے میں نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے بلکہ ان کیلئے سہولتیں بھی فراہم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

قرآن حکیم میں خواتین کا ذکر

''جواب میں ان کے رب نے فرمایا'' میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو'' (۳:۱۹۵)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔'' (۹:۷۱)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے (اور آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔'' (۱۶:۹۷)

''بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے ان کیلئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔'' (۳۳:۳۵)

عورتوں کے متعلق بائبل کے لہجے کو شروع ہی سے پہلے مرد اور عورت کے تمثیلی قصے کو بنیاد بنا کر اختیار کیا گیا ہے۔ حوا جسے ایک دل لبھانے والی عورت کے طور پر پیش کیا گیا، آدم کی نسبت زیادہ جواب دہ دکھائی گئی ہے۔ اسی لئے وہ بچے کی پیدائش کی اذیت برداشت کرتی ہے۔ ابلیس کے بہکاوے میں پہلے وہی آئی اور پھر آدم کو ورغلانے میں ابلیس کی مدد کی۔ اس اتحاد کی کوئی اور مثال نہیں ملتی، آدم کو اس سے یہ تلخ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مرد کو ہمیشہ عورت پر حاکمانہ تسلط رکھنا چاہئے اور اس کے مکر و فریب سے بچنے کیلئے چوکس اور خبردار رہنا چاہئے۔ (۲۰)

عورت اور مرد کے تعلق کی عکاسی وہ قدیم علامت کرتی ہے جس میں مرد کا تعصب اور جھکاؤ برتری کی جانب ظاہر کیا جاتا ہے اور مذہبی دستور بھی مرد کی ہی برتری ظاہر کرتے ہیں اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی مردوں اور عورتوں کے باہمی رشتہ و تعلق کی حیثیتوں کو دنیا کے بہت سے معاشروں میں اسی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ماضی میں مسلم سکالرز نے جو تفاسیر لکھیں ان میں بھی مردوں کے اس تعصب اور جھکاؤ کو جگہ دی گئی ہے اور قرآن میں بھی بائبل کے متوازی اس تمثیلی قصے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جو یہودیت اور عیسائیت کے گہرے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ (۲۱) بیسویں صدی کو جو فوقیت حاصل ہے، اس میں ہم بالکل اس قابل ہیں کہ مردوں اور عورتوں میں جو فرق ہے اس بارے میں قرآنی تصور اور نقطہ نظر تک پہنچ سکیں اور یہ جان سکیں کہ ماضی کے مفسرین نے اس بارے میں کیا سمجھا تھا۔ مگر ماضی قریب میں مستشرقین نے اس موضوع کو اکثر الجھا دیا ہے۔ ان کے پہلے سے فرض کر لئے گئے تصورات میں سے کشید ہو کر حقیقت سامنے آتی ہے تو وہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عورتوں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے کہ عورت پست اور گھٹیا ہے۔ مگر خوش قسمتی سے یہ تصور اب تبدیل ہو رہا ہے مثلاً اینی مری شمل مارگریٹ سمتھ کی کتاب رابعہ دی مسٹک (رابعہ۔ ایک عارفہ) کے تعارف میں لکھتی ہیں:

مغربی قاری جو مارگریٹ سمتھ کی تصنیف کے ص ۱۲۷ کی تحریر کو بغیر کسی تنقید کے قبول کر لینے کا میلان رکھتا ہے کہ ''مسلم خواتین کی ذلت و پستی کا ذمہ دار خود اسلام ہے۔'' اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا ذمہ دار اسلام نہیں بلکہ اس کی زیادہ ذمہ داری سماجی اور معاشرتی قوتیں تھیں جنہوں نے عورت کو ذلت و پستی میں دھکیلا۔ قرآن میں تو بار بار مسلمون و مسلمات،

Marfat.com

مومنون و مومنات کا ذکر آتا ہے۔ ''مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں۔'' اور جب نماز، روزہ اور حج وغیرہ کی بات ہوتی ہے تب بھی مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے یکساں احکام اور ہدایات ہوتی ہیں۔ اکثر دہرایا جانے والا یہ دعویٰ کہ اسلام میں عورت کو ارفع و اعلیٰ جذبات و احساسات سے عاری دکھایا گیا ہے، قرآن سے ثابت نہیں ہوتا نہ ہی احادیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (۲۲) قرآن میں پہلے مرد اور عورت کا قصہ جس طرح بیان کیا گیا ہے۔ (۲:۳۵۔۳۹، ۷: ۱۹۔۲۵) وہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بھی اسی قدر بائبل میں بیان کردہ قصے سے ممیز ہو جاتا ہے جس قدر اس سے جس کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ قرآن میں کہیں بھی اس بات کا ذکر موجود نہیں کہ اماں حوا نے حضرت آدم علیہ السلام کو ورغلایا تھا، یا یہ کہ بچے کی پیدائش عورت کیلئے کوئی سزا ہے یا یہ واقعہ مرد کی عورت پر ''بالادستی'' اور ''حکمرانی'' کی بنیاد بنتا ہے یا یہ کہ عورت کو مرد کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ قرآن میں یوں لگتا ہے جیسے قصداً اس مسئلے کو چھیڑا ہی نہیں گیا کہ پہلے کسے تخلیق کیا گیا تھا۔ قرآن میں یہ ذکر ضرور ہے کہ آدمؑ اور ان کی شریک حیات دونوں بہکاوے میں آ گئے تھے، ان سے خطا ہوئی اور وہ اللہ کے حکم کی پیروی سے ہٹ گئے تھے، پھر دونوں نے توبہ کی اور معاف کر دیئے گئے۔ اس تفصیل پر جزواً بنیاد رکھ کر اور ان آیات کی روشنی میں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت اور مرد روحانی طور پر یکساں ہیں اور معاصر مسلم مصنفین نے بھی بڑے دلائل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے کہ جہاں تک نیکی اور پارسائی اور تقویٰ و پرہیز گاری کا تعلق ہے اسلام میں مرد یا عورت کے درمیان اس حوالے سے کوئی فرق نہیں، دونوں برابر طور پر روحانی مراتب کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے دو پریشان کن تصورات ایسے ہیں جنہیں یا تو غلط معنی پہنائے جاتے ہیں یا نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ پہلا تو یہ ہے کہ مسلم سکالرز نے اس مساوات کو ہمیشہ قائم رکھا۔ (۲۳) آج بھی ایسے مسلمان موجود ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ عورتیں پیدائشی طور پر کمزور طبیعت ہوتی ہیں اسی لئے وہ گناہ کی طرف جلد اور بہ آسانی جھک جاتی ہیں۔ اس تصور کو قرآن کی صاف اور واضح تصدیق کے ذریعے رد کیا جا سکتا ہے اور یہ یوں رد ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنی تصور سے ٹکراتا ہے۔ اس کو حمایت صرف اس وقت حاصل ہو سکتی ہے اگر عملی طور پر قانونی نوعیت کی ان آیات کا

Marfat.com

حوالہ دیا جائے جن میں صنف نازک کی روحانیت کا منفی پہلو پیش کیا گیا ہو اور ایسی کوئی آیات نہیں۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ مستند احادیث نبویؐ کی بہت مختصر سی تعداد ایسی ہے جن میں متضاد تصویر پیش کی گئی ہو۔ ان میں سے میں ایک سب سے زیادہ پرتاثیر حدیث پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔

ایک بار نبی کریم ﷺ کا گزر چند خواتین کے قریب سے ہوا، آپؐ نے فرمایا:

> ''خواتین! تمہیں بہت زیادہ اچھا ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ تمہاری اکثریت کو میں نے جہنم میں دیکھا ہے۔ مجھے تمام مخلوقات میں سے تم ہی ایسی نظر آئی ہو جو استدلال کو سب سے کم سمجھتی ہو اور دینی شعائر کی پابندی بھی سب سے کم کرتی ہو اس کے باوجود تم مضبوط استدلال والے مرد کی عقل کو ماؤف کر دیتی ہو۔''

> خواتین کے اس گروپ میں سے ایک عورت نے پوچھا: ''حضور ﷺ ہم دینی شعائر کی پابندی میں کیسے اوروں سے پیچھے ہیں؟'' اسے آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: ''کیا یہ حقیقت نہیں کہ جن دنوں تم ایام حیض سے گزر رہی ہوتی ہو تو تمہیں نہ نماز ادا کرنے کی اجازت ہوتی ہے نہ روزہ رکھنے کی؟'' اس عورت نے کہا: ''جی حضور ﷺ، یہ سچ ہے۔'' ''مگر ہم میں استدلال کی کمی کیسے ہوتی ہے؟'' ۔''مرد کے مقابلے میں کیا تمہاری شہادت نصف نہیں تصور ہوتی؟'' (۲۴) ''جی حضور ﷺ......'' اس نے جواب دیا۔

احادیث نبویؐ میں سے یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے بارے میں امریکی مسلمان مجھ سے زیادہ سے زیادہ سوال کرتے ہیں۔ ایک نومسلم نے مجھے بتایا کہ اس حدیث نے اسے کافی دکھ دیا اور اس کے عقیدہ و ایمان کو کافی دھچکا لگا۔

جمال بدوی جیسے مسلم سکالرز جن کے سامنے یہ حدیث آئی، ان کا خیال ہے کہ نبیؐ نے یہاں جو بات کہنی چاہی وہ عورتوں کی روحانیت پر کوئی ارشاد نبوی نہیں تھا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ تو عورتوں کو یہ نصیحت کرنا چاہتے تھے کہ مذہبی معاملات میں انہیں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت

Marfat.com

ہے کیونکہ صنف نازک کی حیثیت سے انہیں کئی مراعات حاصل نہیں۔ (۲۵) بدوی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلام اگر عورت سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایام حیض کے دوران نماز ادا نہ کریں، نہ روزہ رکھیں اور اس جسمانی عبادت وریاضت کی بچے کی پیدائش کے چالیس روز بعد تک ویسے رعایت مل جاتی ہے (قرآن ان ایام) کو ''تکلیف کے لمحات'' قرار دیتا ہے جن میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے، (۲: ۲۲۲) تو وہ اس بات کا ذکر بھی کرتا ہے کہ ان وقفوں کے دوران عورتوں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے کہ وہ ذاتی طور پر اللہ سے اپنے عجز وانکسار کا اظہار کرتی رہیں۔ تجارت میں جہاں تک دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر ٹھہرانے کے بیان کا معاملہ ہے بدوی کے خیال میں وہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ عام خواتین فطری طور پر تجارت کے معاملات کو مردوں کی نسبت کم سمجھتی ہیں، خصوصاً (اس کی ذاتی رائے میں) ایک مسلم معاشرے میں جہاں عورتوں کی صلاحیتوں کو معاشرت کی دوسری ضرورتوں کی جانب موڑ دیا جاتا ہے۔

چنانچہ بدوی دیکھتا ہے کہ ایام حیض کے دوران عورتوں کو ملنے والی رعایت اور کسی معاہدے میں شہادت اور گواہی کے قانون کے ضمن میں عورتوں کو کم تر درجے میں رکھنا اور ذلیل وپست ٹھہرانا مقصود نہیں بلکہ اول تو یہ کہ اسے صنف نازک کے طور پر قبول کرنا اور ثانیاً مردوں اور عورتوں کی قوت وطاقت کے درمیان قدرتی فرق کی نشاندہی کرنا مطلوب تھا۔ تاہم یہ بات اس حدیث کے مدعا اور منشا کے خلاف جاتی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شرائط اس لئے رکھی گئی ہیں کیونکہ عورت کے صنف نازک ہونے میں کچھ کمزوریاں اور نقائص رہ گئے ہیں جس کی بناء پر اس کے جہنم میں جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس پر بحث ہوسکتی تھی اور مجھے بدوی کی رائے کے ذریعے ہی یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کے منفی نتیجے تک پہنچنا اس وقت ناگزیر بن جاتا ہے جب اس کی تشریح زیادہ لغوی معنوں میں کرنے پر زور دیا جائے غالباً شب معراج آنحضرت ﷺ کا جنت تک کے سفر کا ذکر اور اس میں جہنم کا منظر بھی آپ کو دکھایا جانا اس مقصد کیلئے نہ تھا کہ ان دیکھی چیزوں کے بارے میں کوئی مشاہداتی معلومات فراہم کی جائیں بلکہ یہ تو حوصلہ افزائی اور تنبیہ کی غرض سے تھا۔

فضل الرحمن نے اپنی کتاب ''ہیلتھ اینڈ میڈیسن ان دی اسلامک ٹریڈیشن'' میں اس

Marfat.com

حدیث کو زیادہ تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ (۲۶)۔ اسے یہ قرآن کی رو سے مردوں اور عورتوں کے روحانی مساوات کے خلاف نظر آتی ہے اور اس کے خیال میں اس کو اسلام میں بذریعہ حدیث داخل کیا گیا ہے، یہ عجمی ثقافت وتمدن کے مخصوص مزاج کے راستے ان کی فتوحات کے بعد اسلام میں داخل ہوئی۔ وہ بیان جس میں عورت کی تصدیق وشہادت کا ذکر ہے اور جس میں اسے مرد کے مقابلے میں نصف بتایا گیا ہے اسے وہ اسلامی قوانین کی ترقی سے پہلے کے دور سے منسوخ کرتا ہے۔ وہ بھی بدوی ہی کا ہم خیال ہے کہ قرآن میں اس بارے میں جو مماثل حوالہ دیا گیا ہے وہ صرف تجارتی معاملات سے متعلق ہے اور اسے عام قانون تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حدیث نبویؐ، وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے، بعد میں تشکیل پانے والے تصور کی نشاندہی کرتی ہے جس میں اسے عام قانون تصور کیا جانے لگا تھا۔ مجھے یہ بات تسلیم کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ اس حدیث کے الفاظ یا اسلوب کسی عام قاعدے یا ضابطے کی طرف اشارہ نہیں کرتے مگر یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے مراد بھی یہی تھی۔ ہم عورت کے گواہی کے مسئلے کو تھوڑا سا آگے چل کر پھر زیر بحث لائیں گے۔ سر دست ہم صرف اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک نقطہ نظر غالباً درست ہے اس لئے کہ قرآن اور مستند احادیث سے مرد عورت کی برابری ہی ثابت ہوتی ہے اور اس مسئلے میں کوئی تنازع دکھائی نہیں دیتا۔

ایک اور اہم طریقہ جس کے ذریعے قرآنی نقطہ ہائے نظر تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے وہ ہے اس کا تمثیلی شکل میں مطالعہ۔ دوسرے الفاظ میں جب قرآن میں کچھ لوگوں کی لفظی تصاویر پیش کی جاتی ہیں، مثلاً جب ہم انہیں نماز ادا کرتے، باتیں کرتے، کام کاج میں مصروف دیکھتے ہیں تو ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان کے کردار کے کون سے پہلوؤں کو نمایاں کیا جارہا ہے؟ ہم نے یہ طریقہ اس وقت استعمال کیا تھا جب ہم پچھلے صفحات میں والدین کے بارے میں بحث کررہے تھے۔ قرآن میں عورتوں کی تصویر کشی میں سب سے زیادہ ہمدردی اور شخصیت کی کشش کا پہلو دکھایا گیا ہے: ملکہ سبا ایک مثالی لیڈر ہیں، حضرت موسیٰ کی والدہ محترمہ ہیں جو اللہ کی منشا و رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر کے شیر خوار بیٹے کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیتی ہیں، فرعون کی بیوی ہیں جو اپنے شوہر کے ظلم وستم سے بچنے کیلئے اللہ کی پناہ کی طلبگار ہیں اور حضرت مریمؑ کی ماں ہیں

Marfat.com

جو بچی کی پیدائش سے پہلے ہی اسے کلیسا کی خدمت کیلئے وقف کر دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی والدہ محترمہ حضرت مریم کی کہانی سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی کہانی ہے، یہاں تک کہ قرآن کی جس سورۃ میں ان کا ذکر ہوا اسے سورۃ مریم کا نام دے دیا گیا۔ یہ مشاہدہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ قرآن حکیم میں جن مردوں کی کردار نگاری کی گئی ہے ان میں نہایت قابل نفرت منکرین اور کفار سے لے کر سیرت و کردار کے اعلیٰ و ارفع نمونوں کے حامل پیغمبر تک شامل ہیں۔ میں اب محض حقائق پر مبنی مزید بیانات کا حوالہ دوں گا مثلاً ابولہب کی بیوی جہنم واصل ہوگی، یا لوطؑ کی بیوی منکر خدا تھی اس لئے کہ ان عورتوں کی شخصیات کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں دکھایا گیا۔ میں تو صرف کسی ایسے مرد یا عورت کا حوالہ دے رہا ہوں جس کے بارے میں ہمیں بطور خاص کچھ باتیں قرآن میں بتائی گئی ہیں۔ قرآن میں جب بھی وہ سب کی سب راسخ ایمان والی دکھائی گئی ہیں۔ اور اس ایک استثنائی معاملے میں بھی وہ عورت جس کا ذکر حضرت یوسف کے قصے میں آیا ہے، توبہ کر لیتی ہے اور اپنی اصلاح کر لیتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے صحفیوں سی موازنہ کیا جائے تو قرآن ایک بے مثال اور قابل ذکر حیثیت رکھتا ہے۔ (۲۷)

لڑکا اور لڑکی

''اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔'' (۳:۳۶)

تم میں سے ہر ایک امین ہے (ایک گڈریا ہے) اور جو کچھ اس کے ذمے کیا جائے اس کے لئے جواب دہ ہے۔ ایک حکمران کی حیثیت ایک امین کی ہے اور جو امانت اس کے ذمہ کی گئی اس کا ذمہ دار ہے، ایک مرد امین ہے اپنے خاندان کا، ایک عورت کے ذمہ اپنے شوہر کا گھر اور بچے ہیں جس کی وہ جواب دہ ہے۔ پس ہر کوئی اپنی اپنی جگہ امین ہے اور جو امانت اس کے ذمے کی گئی ہے اس کے لئے جواب دہ ہے۔ (۲۸)
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

Marfat.com

ماضی میں دنیا میں ہر کہیں مردوں پر یہ بات واضح تھی کہ ایک عام قانون کے تحت عورتوں کی نسبت مرد زیادہ ذہین، ذی شعور اور کم جذباتی تھے۔ حال ہی میں جو تاریخ کا مختصر سا وقفہ گزرا ہے اس میں عورتوں کو تعلیم اور سیاست کے میدان میں یکساں مواقع دیئے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے قدیم مفروضے چیلنج کر دیئے گئے ہیں۔

ان دنوں امریکہ میں نیشنل ٹیسٹ سکورز میں مردوں اور عورتوں کا فرق برائے نام ہے۔ حالانکہ عورتوں کی زبانی مہارتوں میں مردوں کی نسبت معمولی سا زیادہ فائدہ ہوتا ہے اور مردوں کو عملی مہارت و تجربے میں مگر اب یہ رجحان بھی تبدیل ہو رہا ہے کیونکہ عورتیں بھی اب سائنسی علوم کو اپنا کیریئر بنانے کی تیاری کرنے لگی ہیں۔ خواتین اب سیاسیات، تجارت، اعلیٰ تعلیم، طب اور کئی دوسرے ایسے شعبوں میں داخل ہو گئی ہیں جن پر اب تک صرف مردوں کی اجارہ داری تھی۔ وہ ان میدانوں کی جانب تیزی اور کامیابی سے بڑھ رہی ہیں اور اب اس نقطہ نظر کو بھی زیر بحث لایا جا رہا ہے کہ مرد عورتوں کی نسبت کم جذباتی نہیں ہوتے، البتہ وہ اپنے جذبات کا اظہار یا استعمال مختلف طریقوں سے کرتے ہیں: ظلم و تشدد کے ذریعے اور اکثر چیخ چلا کر۔ عورتوں کی نسبت مرد اور بھی بہت سے ظالمانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ وہ جرائم ہیں جن میں جذبات کا عمل دخل بہت ہوتا ہے۔

علم و آگہی اور کردار کے حوالے سے جدید معاشرے میں پیدا ہونے والی تمام تبدیلیوں کے باوجود پھر بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ ذاتی سطح پر اپنے والدین یا دادا دادی کی نسبت مرد اور عورت ایک دوسرے سے زیادہ مختلف تعلق رکھتے ہوں۔ مرد آج بھی، میرے خیال میں ایسے والدین کی خواہش رکھتے ہیں جو شفقت و محبت دینے والے، پرورش کرنے والے، مدد و معاون اور نرم خو ہوں۔ یہی کچھ روایتاً صنف نازک کی خوبیاں بھی تصور کی جاتی ہیں۔ اور عورتیں اپنے شوہروں کے بارے میں یہی تمنا رکھتی ہیں کہ وہ خود اعتماد، مستقل مزاج، مضبوط اور قابل بھروسہ ہوں۔ گویا یہ مردانہ صفات سمجھی جاتی ہیں۔ آج کے دور کی عورتیں مردوں میں احساسیت کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں مگر مجھے اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ مردوں میں یہ صفات بہت کم ملتی ہیں اور ان صفات کے مالک مردوں کی تعداد بہت کم نظر آتی ہے۔

ساٹھ اور ستر برس کی عمروں کے تجربات کے باوجود، میرے شاگرد مجھے بتاتے ہیں کہ

آج ایک نوجوان مرد سے ایک بار پھر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مقررہ تاریخ پر بل ادا کرے گا۔ یہ ایسی بات تھی جس کی مجھے اس زمانے میں کبھی فکر نہ تھی جب میں تیرہ اور بیس برس کی درمیانی عمر میں تھا۔ شادی کے موقعہ پر عورتیں روپے پیسے کے خرچ کرنے میں اپنے خاوندوں پر کم انحصار کرنے لگی ہیں لیکن ان کی انہیں ایک قیمت بھی تو ادا کرنی پڑی ہے: اگر ایک شادی شدہ جوڑے کا طرز زندگی وہی ہے جو ان کے والدین کا تھا تو خاندان کے اخراجات کے لئے دونوں کو اپنا اپنا حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اسے مثبت پہلو سے دیکھا جا سکتا ہے سوائے اس حقیقت کے کہ گھر کی فکر اور بچوں کی فکر کے معاملے میں اکثر زیادہ بوجھ بیوی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مغربی معاشرے میں یہ تصور قبول کر لیا جاتا ہے کہ بچوں کی نگہداشت عورتیں بہتر طور پر کر سکتی ہیں۔ طلاق کے قوانین اور معاشرتی رسوم میں اس بات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے: مثال کے طور پر طلاق کی صورت میں بچوں کو ہمیشہ ماں کی تحویل میں دیا جاتا ہے اور والدین کم و بیش ہمیشہ بچوں کی نگہداشت کیلئے عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے جب مردوں اور عورتوں کے اپنے اپنے رول کی بات ہوتی ہے تو مغربی معاشرہ اپنے آپ کو ایک عبوری حالت میں پاتا ہے جہاں اس کی تشریح و تصریح کی تلاش ہو۔

مسلم معاشرے یا اسلامی معاشرے میں بھی یہی بات سچ ہے جس نے مغرب سے اپنے ٹکراؤ اور تصادم کے دوران اپنی حیثیت کو از سر نو پرکھنا شروع کر دیا ہے۔

مسلم مصنفین اکثر معاملہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اسلامی عہد سے پہلے کا عرب بربریت، جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور اسلام آتے ہی اس جزیرہ نما کے مکمل سماجی و سیاسی ڈھانچے کو انقلابی طور پر الٹ پلٹ دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں اسلام کے انقلابی نظریات قبول کرنے کیلئے اس سے زیادہ کج رو ماحول مل ہی نہیں سکتا تھا۔ بے شک اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلام سے پہلے کے عرب اجڈ اور کھردرے تھے اور اعلیٰ تہذیبی و تمدنی علامات کا فقدان تھا مگر میں پھر بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان عربوں کی سادگی، عزت و آبرو کے اصول، شرافت و نجابت اور آزادی سے محبت جیسی خوبیاں انہیں قرآن میں دیئے گئے تصورات و نظریات کے حصول کیلئے نہایت موزوں امیدوار بناتی تھیں۔ جمہوریت، اخوت و بھائی چارہ، مساوات اور فراخدلی و فیاضی کے نظریات نے اس میں ایسی

Marfat.com

قبائلی صفات پیدا کردی تھیں جنہیں اب قبیلے کی حدود سے باہر نکال کر مزید وسعت دینے کی ضرورت تھی۔ (۲۹)

یہ تصور کہ محض ایک نظریے کو قبول کر لینے سے کوئی فرد ایک مکمل شہری بن جاتا ہے اس کی زیادہ سخت اور شدید مخالفت ایران اور روم کی طاقتور پڑوسی سلطنتوں میں ہوئی۔ چنانچہ اسلام کا پیغام جو بیشک ایک انقلابی پیغام تھا اس جزیرہ نما عرب کی سرزمین میری رائے میں اس کی اشاعت کیلئے نہایت موزوں زمین تھی اور خاص طور پر عورت کے مقام و مرتبے کے حوالے سے۔

یہ دستاویزی ثبوت پیش کرنا بہت آسان ہے کہ قدیم ہندو، یونانی، رومن اور ایرانی تمدن میں عورت کی حیثیت ایک خدمت گزار اور اطاعت شعار کی سی تھی۔ (۳۰) وہ قانونی درجہ و مقام سے محروم تھی اور اپنے مردسرپرست کے قریب اسے نابالغ تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام سے پہلے کے عرب میں مقابلتاً صورتحال بہتر تھی اور عورت کافی حد تک بہتر حالت میں تھی۔ احادیث نبویؐ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عرب عورتوں کو وراثت میں سے حصہ ملتا تھا، انہیں طلاق حاصل کرنے کا حق حاصل تھا اور وہ اس کے لئے ابتداء کرسکتی تھیں۔ شادی کے لئے اپنی مرضی کا اظہار کرسکتی تھیں جنگوں میں حصہ لیتی تھیں اور تجارت کرتی تھیں۔ عرب میں بظاہر ان حقوق کو یکساں طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اس لئے قرآن نے ان میں سے اکثر کو نافذ کیا۔ تاہم قرآنی قوانین کی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے قرآنی قوانین جو عورتوں کو تحفظ دیتے ہیں اس وقت بھی موجود تھے۔ عورتوں کی ایک خاص حد تک آزادی کی عرب میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں جبکہ پڑوسی ملکوں میں بسنے والی عورتوں کو اس قدر آزادی میسر نہ تھی جس سے اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی کہ قرآنی اصلاحات کے لئے عرب کی سرزمین بہت موزوں تھی۔

اسلام میں مرد اور عورت کے تعلق و رشتے کے تصور پر سورۃ مریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

''اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا'' (۳:۳۶)

Marfat.com

یہ اعلان اس وقت کیا جاتا ہے جب حضرت مریمؑ کی والدہ محترمہ بیٹی کو جنم دینے پر مایوسی کا اظہار کرتی ہیں اس لئے کہ وہ تو اللہ سے بیٹے کے لئے دعا کرتی رہی تھیں۔ اللہ کی طرف سے ہلکی سی سرزنش آ جاتی ہے کہ وہ بہتر جانتا تھا کہ کیا پیدا کرنا ہے اور یہ کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا اور یہ بات بہت واضح اور صاف ہے کہ وہ ایک طرح کے ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ لڑکے کی پیدائش پر زیادہ خوشی کے اظہار کے معاملے پر تنقید حضرت مریم کے قصے میں شامل کر دی گئی ہے، حضرت مریم جو حضرت عیسیٰ کی والدہ ماجدہ ہیں اور جن کا شمار قرآن پاک میں مذکورہ بلند مرتبت شخصیات میں ہوتا ہے۔ پس بیک وقت اور ایک واضح و روشن بیان کے ذریعے اور مثال کے واسطے سے مردوں اور عورتوں کی فطرت کے فرق پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ عورتوں میں مردوں سے فضیلت میں سبقت لے جانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ خدائی نظام میں مرد اور عورت یکساں تخلیق نہیں کئے گئے تھے بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل اور مدد کیلئے پیدا کئے گئے تھے۔

''وہ (تمہاری بیویاں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کیلئے''
(۱۸۷:۲)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔'' (۷۱:۹)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' (۲۱:۳۰)

Marfat.com

یہ بات اسلام کے بنیادی نظریات میں شامل ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کے کردار کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کو کسی خاص رشتہ و تعلق کے قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ ان کی تخلیق ہی کے اندر یہ بات شامل کردی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص رجحان کے نمونے کے مطابق تعلق قائم کریں گے۔ قرآن اور حدیث نبوی ؐ کو اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ خاندان کے اندر شوہر ایک خاص ڈھب کی بالادستی قائم کریں کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک شوہر کو اکثر مرد اور عورت دونوں میں پائی جانے والی قوتوں اور کمزوریوں کے باعث عورت کی نسبت شادی میں زیادہ آزادی اور بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ یقیناً ایک مرد جب بھی وحشیانہ قوت و طاقت کے مظاہرے میں اپنے فائدے کی بات دیکھے گا تو اس طرف جھک جائے گا۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے اسلام مردوں کی بالادستی اور حاکمیت کو کم کردیتا ہے اور یوں عورتوں کو ان کے نقصان سے محفوظ کرلیتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں پر پابندیاں کم سے کم ہوں۔ پس جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ مرد اپنے کنبے کے لئے گڈریوں کی مانند ہیں جو اپنے ریوڑ کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور عورتیں اپنے گھروں کی ذمہ دار ہیں تو آپ ؐ ایک خاندان کے اندر بالادستی اور حاکمیت کی کوئی ترتیب نو متعارف نہیں کرا رہے تھے، آپ تو ایک عام سا نمونہ و مثال اختیار کرا رہے تھے اور اس بات کی تلقین کررہے تھے کہ ہر مرد اور ہر عورت کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ اپنے اپنے لواحقین کی ذمہ داری قبول کریں۔ دوسرے لفظوں میں آپ ؐ فرائض اور ذمہ داریوں پر زور دے رہے تھے فوائد پر نہیں۔ مردوں اور عورتوں کی شخصیتیں بالکل مختلف قسم کی ہوتی ہیں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے اور دونوں میں سے کسی ایک کو فضیلت دیئے بغیر اس موضوع کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ کس حد تک ایک عورت ایک مرد سے پراسرار طور پر مختلف ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا لباس ہیں ایک دوسرے کی محبت و الفت اور رحم و ہمدردی کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔ (۵۵:۷، ۵۷:۲۵) یہ عدل اور توازن پوری کائنات میں دوڑ رہا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر شے کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے۔ (۳۶: ۳۶، ۴۳:۲۱، ۵۱:۴۹) دراصل جوڑے کے لئے عربی لفظ زوج وہی لفظ ہے جس کے معنی بیوی

Marfat.com

کے ہیں۔ چنانچہ یکساں مراتب کے نظام میں جو بڑا وسیع اور پیچیدہ ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہی ایک واحد عنصر ہے جو ان کے تعلق اور رشتے کو قائم رکھتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کی قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں آسانی پیدا کرتا ہے اور مردوں اور عورتوں کے حقوق تک رسائی میں ان کی تکمیل و توازن کی معاونت کرتا ہے۔

حقوق و فرائض

''عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔'' (۲:۲۲۸)

اکثر قرآن مومنوں سے اجتماعی شکل میں خطاب کرتا ہے:

''اے ایمان والو!'' لیکن کبھی کبھی وہ مردوں اور عورتوں دونوں سے مخاطب ہوتا ہے جیسے (۳۳:۳۵) میں

تاہم بہت سی آیات میں اعلانات اور احکام خاص طور پر براہ راست مردوں یا عورتوں تک پہنچائے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں عموماً قریب کی دوسری صنف کیلئے بھی متوازی احکام ہوتے ہیں۔ سورۃ النور میں معتدل سلوک کا حکم دیا گیا ہے:

''اے نبیؐ، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے'' (۲۴:۳۰)

''اور اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دو۔ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں۔'' (۲۴۔۳۱)

Marfat.com

جب آنحضرت ﷺ سے اس آیت پر تفصیلی صراحت کیلئے کہا گیا تو آپؐ نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ''اپنی نظریں بچا کر رکھیں'' سے مراد ہے ''پر شہوت نظروں سے بچنا'' اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے یہی حکم ہے کیونکہ مغربی تاریخ کے کچھ ادوار ایسے بھی تھے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورتوں میں شہوانی اور جنسی خواہش کی کمی ہوتی ہے یا یہ کہ ان میں یہ خواہش ہوتی ہی نہیں۔ جن دنوں میں ابھی گریجویشن میں نہیں پہنچا تھا یہ تحقیق ہورہی تھی کہ اس مفروضے کو غلط ثابت کیا جائے۔ مگر قرآن اور احادیث نبویؐ میں تو اس بات کو برملا تسلیم کیا گیا ہے کہ عورتوں میں جنسی خواہش بڑی شدید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غور فرمایئے کے پیغمبر خدا حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر مصری عورتوں میں کیا ردعمل پیدا ہوا تھا۔ (۱۲: ۳۰۔۳۴) آیت (۲۴: ۳۱) میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ڈھنگ کے لباس پر توجہ دیں (یعنی جس سے پردہ پوشی ہوتی ہو) اور یہی بات تین اور آیات میں دہرائی گئی ہے۔ اس قسم کی ہدایات مردوں کیلئے نہیں ہیں۔ یہاں قرآن اس بات پر فکرمندی کا اظہار کرتا ہے کہ کسی معاشرہ میں مرد کی نسبت ایک عورت کی جنسی خواہش سے زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

قرآن پاک کی سورۃ نمبر 4 (النساء) میں دو جگہ بیوی کی کسی غیر اخلاقی حرکت پر مرد کے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلی جگہ ایک بیوی کی جنسی کج روی کو زیر بحث لایا گیا ہے:

> ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کیلئے بہانے تلاش نہ کرو یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔'' (۴: ۳۴)

عربی زبان پر عبور اور دسترس رکھنے والے ماہرین زبان اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیت میں مختلف اقدامات کی ترجیحات مقرر کر دی گئی ہیں، یہ اقدام بیک وقت نہیں کئے جانے چاہئیں اور سرکشی (نشوز) انتہائی مجرمانہ نوعیت کی ہونی چاہئے۔ بہت سے قانون دان اور فقہاء مخلوط میل جول کی مثال کا حوالہ دیتے ہیں مگر دوسرے اسلامی قوانین کی خلاف ورزی مثلاً شراب نوشی کو بھی اس میں شامل کرنا چاہئے، سرکشی اللہ کو پسند نہیں اور نہ صرف مرد کی متلون مزاجی کا

Marfat.com

ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ یہی لفظ سرکشی (نشوز) بیوی کے اس اقدام سے بھی ثابت ہوتا ہے جو وہ خاوند کی سرکشی کے موقع پر اٹھا سکتی ہے (۴: ۱۲۸) مسلم سکالرز (مثلاً طبری، رازی اور امام شافعی) نے ہمیشہ اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ تیسرا اقدم۔ مارنے پیٹنے والا ایسا ہے کہ جس کی بہت ہی کم صورتوں میں اجازت دی گئی ہے اور بہتر ہوگا کہ اس کی نوبت نہ آئے۔ نبیؐ نے جو حدود و قیود مقرر کردی تھیں ان میں سے یہ سمجھا گیا کہ یہ اقدام ایسا ہے جسے اگر اختیار کرنا ضروری ہو جائے تو کم وبیش یہ علامت کے طور پر ہی لیا جانا چاہئے۔ ابتدائی دور کے صاحبان علم وحکمت نے اس حوالے کو انتہائی غیر اخلاقی کاموں کی مخالفت کا ایک مضبوط اشارہ سمجھا اور اسے مردوں کیلئے ایسا اجازت نامہ تصور نہیں کیا جس سے انہیں بیویوں کو مارنے پیٹنے کی کھلی اجازت مل گئی ہو اور تمام احادیث اس بات کی گواہ ہیں کہ خود نبیؐ نے اپنی زندگی میں ایسا کبھی نہیں کیا (۳۱) بیویوں کے لئے جو ہدایات واحکامات ہیں وہ بھی اسی طرح کے حالات کے ساتھ منسلک ہیں جو اس طرح ہیں:

> ''جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کرلیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔'' (۴: ۱۲۸)

جیسا کہ (۴: ۱۳۰) سے ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ نہ صرف اپنے مسئلے پر گفتگو کرسکتی ہے بلکہ اسے تو اس کے حق انتخاب کی یاددہانی بھی کرائی جاتی ہے کہ وہ خاوند سے خلع لے کر علیحدہ بھی ہوسکتی ہے۔ بے شک ایسا بیوی کو اسی وقت کرنا چاہئے جب خاوند اپنے قابل مذمت سلوک سے باز نہ آئے، فقہاء اور قانون دانوں کا خیال ہے کہ صرف اسی وقت بیوی کو یہ قدم اٹھانا چاہئے۔ بیوی کو جو اختیارات اس متوازی صورتحال میں دیئے گئے ہیں اس کی بڑی واضح وجوہ ہیں ہوسکتا ہے اس مرد کی پہلے سے ایک اور بیوی بھی ہو اور پھر وہ اس بیوی سے علیحدگی پر فوراً دوسری شادی بھی کرسکتا ہے (جب کہ عورت کو تین ماہ کی مدت عدت پوری کرنی ہوتی ہے) تو یہ بات اس عورت کے حق میں نہیں جاتی کہ خاوند سے ازدواجی تعلقات ختم

Marfat.com

کر دینے کی دھمکی دے سکے یا یہ کہ جسمانی سزا کا سوچ سکے خواہ یہ محض علامتی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد ضدی ثابت ہو تو عورت کیلئے ایک دوسرا راستہ بھی ہے کہ وہ مرد سے علیحدگی کے بارے میں رفتہ رفتہ قدم اٹھانے لگے۔ پہلا قدم، قرآنی آیت (۴: ۳۵) کے مطابق یہ ہے کہ دونوں خاندانوں (یعنی مرد اور عورت کے) کے لوگ اکٹھے ہو کر اس مسئلے کا حل نکالیں اور صلح صفائی کی کوشش کریں۔ دونوں کے مفاد میں یہ بات جاتی ہے اگر عورت یہ پہلا قدم اٹھالے۔

قرآن میں جہاں وراثت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے وہاں اس بات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ عورتوں کو کافی حد تک خودمختاری حاصل ہے اور مردوں کے ساتھ ان کی ضروریات اور حقوق کا توازن بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

> ''تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔'' (۴: ۱۱)

> ''اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہم نے ہر اس ترکے کے حق دار مقرر کردیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں گے۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس بناء پر اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں'' (۴: ۳۲۔۳۴)

ایک مسلمان خاندان کے معاشی و اقتصادی انتظامات میں وراثت کی تقسیم کو ایک کلیدی عنصر کی حیثیت دی گئی ہے۔ بے شک اس میں کئی استثنائی صورتیں بھی ہیں مگر عام طور پر وراثت

Marfat.com

میں سے ایک عورت کو مرد کے مقابلے میں نصف حصہ ملتا ہے۔ اگلی آیت میں وراثت کے قانون کو خاندان کی ذمہ داریوں کے ساتھ پیوستہ کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے مرد اپنے خاندان کی کفالت اور دیکھ بھال کیلئے مکمل طور پر ذمہ دار ہوتا ہے۔ بیوی کو اس کے حصے کی ضمانت حاصل ہوتی ہے اور اس کی آمدن کے دیگر ذرائع بھی ہوسکتے ہیں مگر پھر بھی اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے اور بچوں کی کفالت کیلئے خاوند کی مدد کرے۔ اور مزید یہ کہ خاوند اپنی بیوی کو ایسا کرنے پر مجبور بھی نہیں کرسکتا۔ اسی لئے ہمارے معاشرہ میں شادی کے وقت مسلمان عورتوں کو معاشی تفکرات سے آزاد رہنے کا مژدہ سنایا جاتا ہے یہ بات مردوں کے معاملے میں سچ ہے مگر تھوڑی سی ترمیم و تبدیلی کے ساتھ۔ اسلام میں شوہر کی دولت اور اس کی جائیداد پر اس کی کلی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ کچھ حدود و قیود کے ساتھ مشروط کردیا گیا ہے۔ مثلاً وہ قانونی طور پر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ خاندان بھر کی ضروریات کا خیال رکھے۔ بیوی کو کسی حد تک اتنا اختیار حاصل ہے کہ وہ جائیداد اور مال و دولت کے استعمال کے سلسلے میں خصوصاً شوہر کی عدم موجودگی میں اپنا اختیار استعمال کرسکے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی یاد رکھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ شوہر کی غیر حاضری میں اسے صحیح معنوں میں اللہ کی اطاعت کرنی ہے اور اپنے شوہر کی جائیداد اور ملکیت کو غلط استعمال نہیں کرنا اور نہ ہی اس سے متعلق خاندان کی واضح خواہشات کے خلاف قدم اٹھانا ہے۔ مرد اور عورتیں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے انتظامات کا فائدہ دوسری صنف کو یعنی صنف نازک کو زیادہ پہنچتا ہے۔ ابتدائی اسلامی عہد میں مردوں کو یہ خیال گزرا کہ اسلام نے شاید انہیں معاشی و اقتصادی لحاظ سے گھاٹے اور نقصان میں رکھا ہے۔ (۳۲) مگر قرآن مرد اور عورت دونوں کو تنبیہہ کرتا ہے کہ جو کچھ دوسرے کو دیا گیا ہے اس پر للچائی نظروں اور لالچ و حرص کے ساتھ مت دیکھو اس لئے کہ آخر میں ایک نہایت مناسب توازن برقرار رکھا جاتا ہے۔

یہ بات مشکل لگتی ہے کہ امریکہ میں اس نظام کو کس حد تک نافذ کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں کو ملازمت کی جس قدر سہولتیں ان دنوں حاصل ہیں پہلے کبھی نہ تھیں اور عورتوں کی اقتصادی اور معاشی خودمختاری وسیع طور پر تسلیم کرلی گئی ہے، کم و بیش یہ بات تو ناممکن ہوگئی ہے، کہ ایک فرد کی آمدنی پر پورا خاندان زندہ رہ سکے اور امریکی جوڑے اسی وجہ سے شادی کو ایک ایسا سنجوک سمجھتے

Marfat.com

ہیں جس میں میاں بیوی مل کر زندگی کی گاڑی کو کھینچ سکیں۔ روایتی اسلامی کلچرز میں، اس تصور کے حوالے سے شادی شدہ جوڑوں کو اس بات کی فکر کم ہوتی ہے۔ میرے ایک مصری دوست کی بیوی لارنس میں ایک کامیاب کاروبار میں کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ فراہم کرتی ہیں۔ اس کاروبار سے حاصل شدہ منافع سے وہ ایک فلیٹس پر مشتمل عمارت خریدنے کا ارادہ رکھتی ہیں جسے وہ کرایہ پر دے دیں گی۔ اس خاتون کو یہ اطمینان ہے کہ اس کی آمدن جو اس کے خاوند کی کمائی سے بھی بڑھنے والی ہے اس کی اپنی ہے جو خاوند کی ضروریات پر استعمال نہیں ہوگی۔ یہ کوئی انوکھی مثال نہیں ہے۔ اگر مختلف جوڑے ضرورت کے تحت یا اس کے بغیر بھی اپنی آمدن یکجا کرلیں تو اس عمل سے جو چند تحفظات حاصل ہوتے ہیں وہ یقیناً کمزور پڑ جائیں گے۔ نامساعد اور مشکل حالات میں بیوی کی معاشی خودمختاری کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اسے تحفظ بخشتی ہے۔ مثلاً طلاق یا خاوند کے انتقال کی صورت میں۔ اگر وہ اپنی اپنی آمدن کو یکجا کرلیں گے تو پھر انہیں انفرادی طور پر ایک دوسرے کو معقول اور عملاً قانونی تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

اس مرحلے میں یہ بات مفید رہے گی کہ ہم اس بات پر غور کرلیں کہ زمانہ وسطیٰ کے مسلمان فقہاء اور قانون دانوں کی نظر میں ایک مسلمان شوہر اور بیوی پر ایک دوسرے کیلئے کم سے کم کن ضروریات کا خیال رکھنا لازمی تھا۔ میرے خیال میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ سکالرز عورتوں کو ملنے والی ان رعایتوں یا فوائد کو اکثر نص الکتاب کے مطابق محدود کردیتے تھے اور مردوں کو ان کے حقوق دیتے وقت جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا نص الکتاب کے ماخذ سے شوریدہ سر ہوکر روگردانی نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے ایک شخص یہ توقع رکھ سکتا ہے اور ایسا ان دنوں ہورہا ہے کہ اس دور کے مسلم مفکرین اس رجحان کو کسی حد تک الٹ دیں گے۔ پھر بھی اس حقیقت سے قطع نظر کہ ماضی میں شوہر کو اپنی بیوی پر ناقابل تردید کنٹرول دے دیا گیا تھا یہ وہ حد تھی جہاں بیوی نہیں جاسکتی تھی۔ اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے لئے حقوق و فرائض کیا تھے ان تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں۔ دونوں کو بیوی بچوں کی کفالت کرنی تھی اور بعض اوقات اقرباء کی ذمہ داریاں بھی نبھانی پڑتی تھیں جبکہ بیوی کی آمدن صرف اس کی اپنی تھی۔ اس بیوی پر یہ لازم نہ تھا کہ وہ گھر کا کام کاج کرے، کھانا پکائے یا بچوں کی فکر کرے۔ پھر یہ کہ اگر یہ

بات اس کے شوہر کے ذرائع آمدن کے مطابق اس کے اختیار میں ہوتی تو وہ بیوی کے لئے ایک نوکرانی کا انتظام بھی کر دیتا تھا۔ (عرب میں آج بھی جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو اسے یہ قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ خاوند سے نوکرانی کا مطالبہ کر سکے) یہ بھی خاوند کے فرائض میں شامل ہوتا تھا کہ وہ بیوی کی دینی تعلیم کے اخراجات برداشت کرے (۳۴) خاوند کی عدم موجودگی میں بیوی کو تمام جائیداد کا انتظام سنبھالنا ہوتا تھا اور خاوند کی مرضی کے مطابق وہ یہ سارے انتظامات کرتی تھی۔ وہ ان لوگوں کو گھر پر مدعو نہ کر سکتی تھی خصوصاً مردوں کو، جنہیں اس کا خاوند پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کے گھر آئیں۔ حالانکہ میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ مسلم امریکی جوڑے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ بیوی کے کہیں آنے جانے پر اس کے شوہر کا مکمل کنٹرول ہونا چاہیے یا دوستوں کے انتخاب میں بیوی کو شوہر کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، یا یہ کہ یہ بات بہت ضروری ہے یا ایسا ضرور ہونا چاہئے مگر میرے یہی امریکی مسلم بھائی ابتدائی اسلامی عہد کی گھریلو اور نجی زندگی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر اور آراء سن کر حیران رہ جائیں گے۔

آغاز اور اختتام

ان کی دوستی اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جہاں وہ بے تکلفی سے اور کھل کر صاف صاف ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے۔ چنانچہ کاروباری خاتون نے اپنے سوالات میں اپنی اس سخت ناراضگی کا بانگ دہل اظہار کر دیا تھا جسے وہ ایک طویل عرصے سے روکے ہوئے تھی۔

''تم یہ ڈراؤنا اور خوفناک سکارف کیوں پہنتی ہو؟''

''کیوں کہ میرے دین میں اس کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور میرا اس بات پر ایمان نہیں ہے کہ عورتوں کو جنسی بے راہ روی پر اکسایا جا سکتا ہے۔''

''تم سچ کہتی ہو، میں نے ریاضی میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کی ہے۔

تمہیں کوئی ڈھنگ کا کیریئر اپنانا چاہیے۔"

"تم نے ریاضی میں ڈگری ضرور لی ہے اور میری تعلیم نے اس کیلئے تیاری کرنے میں میری مدد کی ہے۔ میں ایک ماں ہوں اور میں تین بچوں کی پرورش کررہی ہوں۔"

"میرا اشارہ کسی مفید اور اچھی ملازمت کی طرف تھا، جہاں تم معقول تنخواہ پاسکتیں!" محبت و شفقت سے بڑھ کر کیا شے زیادہ قیمتی ہوسکتی ہے؟ تم اسے نہ دیکھ سکتی ہو نہ اس بحر بیکراں کی اتھاہ گہرائیوں کو ماپ سکتی ہو مگر یہ تمہارے اندر ہی اندر پنپتی ہے اور تمہارے اور اس کے درمیان جن سے تم محبت کرتی ہو یہ پروان چڑھتی ہے" "اور اگر تم ملازمت کرنے لگو تو تم مالی لحاظ سے خود کفیل ہو جاؤ گی اور بس" میں بہت محنت کرتی ہوں اور میرے شوہر اپنی کمائی کا دس فیصد تنخواہ میں سے مجھے دے دیتے ہیں اور اسے میں جس طرح چاہوں خرچ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔ میرے شوہر ایک نوکرانی کی تنخواہ بھی اپنی جیب سے دیتے ہیں جو ہفتے میں دو بار کام کیلئے آتی ہے۔"

"لیکن اگر تم خود ملازمت میں ہوتیں تو تمہیں اپنے شوہر کی سخاوت و فیاضی پر انحصار نہ کرنا پڑتا۔" "میرے شوہر کا روپیہ پیسہ میرا ہی ہے۔ یہ روپیہ اور نوکرانی ہماری شادی کے معاہدہ کا حصہ ہیں حالانکہ میں اپنے بچوں سے محبت کرتی ہوں، مجھے اپنے بچوں سے اور گھر سے پیار ہے میری ساری کوشش اور تگ و دو کو قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے اور معاہدہ کے مطابق جو مجھے ملتا ہے میں اسی کی حقدار ہوں!۔"

"لیکن تم نے یہ بھی کبھی سوچا کہ تمہارے پاس زیادہ دولت ہوتی تو تم زیادہ کچھ کرسکتی تھیں۔ تم اکثر و بیشتر سفر کرسکتی تھیں۔"

Marfat.com

"میری منزل، میرا مقصد حیات یورپ نہیں ہے۔"

شادی سے متعلق اسلامی نقطہ نظر بڑا غیر استدلالی ہے۔ جب لڑکا لڑکی اپنی مرضی کا اظہار کر دیتے ہیں تو خاندان کے لوگ دونوں طرف سے اکٹھے ہو کر تفصیلات طے کرتے ہیں اور شادی کا معاہدہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ اگر دونوں فریق اتفاق کریں تو دولہا اپنی دلہن کو طے شدہ معاہدے کے مطابق مہر دے دیتا ہے۔ پھر ایک مختصر سی مذہبی رسم ادا کی جاتی ہے اور اس کے بعد ایک پر مسرت دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اکثر دولہا دلہن اس رسم کے فوراً بعد اکٹھے نہیں ٹھہریں گے۔ ان دو میں سے ہر ایک کچھ مدت تک اپنے اپنے خاندان میں رہے گا تا کہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر جان سکیں، جس سے نو بیاہتا جوڑے میں محبت والفت کا بندھن مضبوط تر ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں دلہن اور دولہا کی عیاں وجوہ کی بناء پر، مباشرت کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ تاہم اگر وہ ایسا کر لیں تو چونکہ اب وہ شرعاً اور قانوناً شوہر اور بیوی ہوتے ہیں اس لئے وہ کسی مذہبی قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ شادی کا رومانوی پہلو، جیسا کہ مغرب میں تصور کیا جاتا ہے دولہا دلہن کے وصال سے پہلے سخت قانونی اور رسمی کارروائیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے لڑکے لڑکیاں جو خاص طور پر جوان ہوں وہ شادیوں کی بنیاد کم و بیش عشق و محبت کے جذبے ہی کو بناتے ہیں (جسے ہمارے ہاں پاکستان میں محبت کی شادی یا لو میرج کا نام دیا جاتا ہے۔ مترجم) اسی لئے خاندان کے نمائندوں کو لڑکے لڑکی کی شادی سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ بہت سخت مذاکرات کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے لئے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ شادی سے پہلے ان مشکلات پر غور و فکر کرتے ہیں جو بعد میں پیدا ہو سکتی ہوں اور یوں ان سے بچنے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ اس میں یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ خدانخواستہ مستقبل میں کبھی طلاق کی نوبت آ جائے تو اس کیلئے شرائط کیا ابھی سے طے کرنی ضروری ہوں گی۔ شادی کے ختم ہو جانے کے امکانات پر غور و فکر کرتے وقت جو افہام و تفہیم ہوتی ہے وہ دو اسلامی دستور سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ جہیز یا حق مہر اور معاہدہ شادی۔

"اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے)" (۲:۲۳۷)

Marfat.com

''اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو ان کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے'' (۲:۲۲۹)

''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟'' (۴:۲۰)

ان آیات میں جو اس مہر سے متعلق ہیں جو ایک مرد اپنی ہونے والی بیوی کو دیتا ہے طلاق کی نوبت کا پورا پورا امکان موجود ہے ان کے پیش نظر مسلمانوں نے شادی کے معاہدے کے وقت باہمی گفت وشنید سے دو قسم کے مہروں کا معاملہ طے کر لینے پر کلی اتفاق کیا ہے۔ وہ ابتدائی مہر جو شادی سے پہلے دیا جاتا ہے اور بعد میں دیا جانے والا مہر جو اقساط میں بھی ادا ہو سکتا ہے اور اگر خاوند شادی کے معاہدے کو توڑے تو بیوی کے مطالبے پر بیک وقت پورا مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔ (۴:۲۰) اگر بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے مرد طلاق چاہتا ہے تو اسے اس مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا جو شادی سے پہلے طے ہوا تھا۔ (۲:۲۳۷) اگر بیوی تنسیخ نکاح کا مطالبہ کرے تو اسے اپنا سارا جہیز یا اس کا کچھ حصہ واپس کرنا ہوگا۔ اس کا انحصار اس خطا اور قصور کی نوعیت پر ہوگا جو عدالت اس کے شوہر پر لگائے گی۔ (۳۴) (۲:۲۹) قرآن کی آیت (۴:۲۰) کے مطابق جہیز کے معاملے کا تصفیہ فراخ دلی سے ہوگا۔ ایک امریکی دوست کو جن کی شادی ایک مصری عورت سے ہوئی تھی بیوی کو قاہرہ میں ایک رہائشی مکان بھی جہیز میں خرید کر دینا پڑا تھا اس کے کرایے سے اسے جو رقم ملتی ہے وہ خاتون اسے دوبارہ کاروبار میں لگا دیتی ہے ایک اور دوست جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے حال ہی میں شادی کا ایک معاہدہ طے کر کے آیا ہے جس میں اس نے اپنی بیوی کو ایک لاکھ ڈالرز کے ہیرے دیئے ہیں۔

Marfat.com

اکثر و بیشتر مہر کسی قیمتی شے کی شکل میں دیا جاتا ہے مثلاً ہیرے جواہرات یا جائیداد مثلاً گھر وغیرہ۔ شادی کے بعد دیئے جانے والے مہر کی ادائیگی میں افراط زر کو بھی نظر میں رکھا جاتا ہے۔ مثلاً شوہر کی تنخواہ کے ایک مقررہ فی صد حصے کو کئی سال کے عرصے پر پھیلا دیا جاتا ہے یا اس کی کل جمع شدہ پونجی کا کچھ حصہ وصول کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیوی اپنے شوہر کی غیر منقولہ جائیداد کے نصف کی حقدار ہوسکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھ سے اکثر غیر ملکی مسلم نوجوان پوچھتے ہیں کہ کیا میں ایسی امریکی مسلم خواتین کو جانتا ہوں جو شادی کی خواہش مند ہوں۔ جب میں ان کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے آبائی وطن میں کسی خاتون کو آسانی سے شادی کیلئے تلاش کر سکتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ امریکی عورتیں بہت کم مہر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر اپنے دوستوں کو ایسے مردوں سے متعارف کرا کے خوش نہیں ہوتا جو ایسی خواتین کی شادی کے بارے میں معلومات کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔

مہر صرف ایک ایسا معاملہ ہے جسے شادی کے معاہدے کے ذریعے طے کیا جانا چاہئے۔ جو مرد اور عورت دونوں کے حقوق اور ضرورتوں کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں مرد یا عورت دونوں میں سے ہر ایک اپنا مطالبہ صاف صاف بتا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اسلامی قوانین کے کسی بھی پہلو کے خلاف نہ جاتا ہو۔ ایک عورت اس بات پر زور دے سکتی ہے کہ شادی کے بعد اسے گھر سے باہر کسی کام کاج کی اجازت ہوگی، شوہر اس کے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرے گا، گھر میں نوکر یا نوکرانی کا انتظام کر کے دے گا یا بچوں کیلئے آیا کا بندوبست کرے گا۔ پاکستان کے فقہاء اور قانون دان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر شوہر دوسری شادی کرے گا تو پہلی بیوی سے اس کی اجازت لینا ضروری ہوگی۔ (۳۵) یہ بات بڑی مضحکہ خیز لگتی ہے کہ ان رعایتوں کو مانگا جائے جو قانون نے پہلے ہی دے رکھی ہوں لیکن شادی کے معاہدے میں کوشش کی جاتی ہے کہ ممکنہ معترضہ باتوں کو طے کر لیا جائے اور طلاق کی صورت میں بجائے اس کے کہ جج بیوی اور شوہر دونوں کے درمیان غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچے، وہ معاہدے کی خلاف ورزی کی بنیاد پر قصوروار فریق کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔

طلاق کے وقت اگر بچوں کی زندگی کے متاثر ہونے اور ان کے مستقبل کا سوال ہو تو بہتر

Marfat.com

یہی ہے کہ طلاق سے بچا جائے۔ بہتر سے بہتر شرائط طے ہو جانے کے باوجود طلاق سے متاثر ہونے والوں کیلئے یہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نبیؐ نے فرمایا کہ اللہ کی نگاہ میں جن چیزوں کی اجازت ہے ان میں سب سے زیادہ قابل نفرت فعل طلاق ہے۔(۳۶)

طلاق کے معاملے میں اسلام کا رویہ وہی ہے جو جنگ کیلئے ہے۔ کبھی کبھی یہ ناگزیر ہو جاتی ہے مگر اسے آخری حربے کے طور پر ہی اختیار کرنا چاہئے۔ اسی لئے طلاق کا مسئلہ کھڑا ہو جائے تو خاندان کے عقل مند افراد کو ثالث بنا لیا جاتا ہے جو مصالحت اور صلح صفائی کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ طلاق کا اعلان تین بار علیحدہ علیحدہ وقفوں سے کیوں کیا جاتا ہے اس لئے کہ تین ماہ کے عرصے میں، اس سے پہلے کہ طلاق واقع ہو جائے اور ناقابل تنسیخ بن جائے صلح صفائی کا موقع مل جائے اور میاں بیوی میں مفاہمت ہو جائے۔

''طلاق دو بار دینے کی اجازت ہے پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں'' (۲:۲۲۹)

> ''پھر اگر (دو طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔ الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔ تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کیلئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں''
> (۲:۲۳۰)

تین بار مفاہمت کی کوشش کر لینے میں ناکامی کے بعد عورت کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ

وہ اس شادی سے چھٹکارا حاصل کر کے سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ مرد اور عورت دونوں علیحدگی پر رضا مند ہو جائیں گے۔ عورت اور مرد میں جب بھی علیحدگی ہوتی ہے تو دونوں کے ملے جلے جذبات اور احساسات ہوتے ہیں جن میں یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ قرآنی احکامات کی کہیں خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اس میں اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے کہ کسی عورت کا نیا شوہر طلاق کی کوشش کا آغاز کرے اس سے پہلے کہ وہ عورت اپنے سابق شوہر کے پاس لوٹ جائے اس سے اس عورت کی طرف سے دوسری شادی کر لینے کی خواہش کے جواز کی ضمانت حاصل ہوگی۔ مسلم فقہا اور قانون دانوں نے شوہر کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طیش میں آئے بغیر ایک ہی بار تین طلاقیں دے سکتا ہے مگر یہ قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ بہت سے اسلامی ممالک میں حکومت نے اس بات کو لازمی قرار دے دیا ہے کہ تمام شادیاں اور تنسیخ نکاح کے واقعات سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہوں گے تا کہ ان خرابیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ یہ ایک مثبت قدم نظر آتا ہے جو قرآن حکیم کے اس اعلان سے مطابقت رکھتا ہے کہ ''اللہ کی آیات کا تمسخر مت اڑاؤ'' جس کا ذکر طلاق کے موضوع پر طویل بحث کے درمیان آیا ہے۔

قرآن پاک کی آیت (۲: ۲۲۹) اور نبیؐ کے زمانے کے بہت سے واقعات کی روشنی میں مسلم فقہاء اور قانون دانوں نے ہمیشہ عورت کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے۔ قانون کی کتابوں میں شوہر کی طرف سے مطالبہ کی گئی علیحدگی کیلئے جو تکنیکی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ ''طلاق'' ہے اور ایسی علیحدگی یا ترک تعلق جس کا مطالبہ بیوی کرے اسے ''خلع'' کہا گیا ہے۔ (۳۷) درج ذیل واقعہ کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے:

جمیلہ بنت صلول نے نبیؐ سے اپنے شوہر کے بارے میں شکایت کرتے ہوئے کہا:

''مجھے قسم ہے اپنے پروردگار کی کہ میں اس کے کردار کی کسی کمزوری یا عقیدہ وایمان کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے اس لئے ناپسند کرتی ہوں کہ وہ بدصورت ہے۔ خدا کی قسم اگر مجھے اپنے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو میں جب وہ میرے قریب آتا اس کے منہ پر تھوک دیتی۔ اے اللہ کے پیغمبر! آپؐ دیکھ رہے ہیں میں کس قدر حسین ہوں جبکہ ثابت ایک بدصورت مرد ہے۔ میں اسے اس کے کردار یا اس کے ایمان کی کسی کمزوری کی وجہ سے قصوروار نہیں ٹھہراتی مگر میں اسلام کی

Marfat.com

حالت میں کفر کو برا سمجھتی ہوں (یعنی مجھے اس سے خواہ مخواہ نفرت ہے) محمد ﷺ نے اس سے پوچھا: ''جو باغ تمہارے خاوند نے تمہیں دیا ہے وہ واپس کردو گی؟'' اس نے جواب دیا ''اے خدا کے پیغمبر! اگر وہ اس سے بھی زیادہ مطالبہ کرے گا تو میں اسے وہ بھی دینے کیلئے تیار ہوں۔'' نبیؐ نے فرمایا ''زیادہ نہیں مگر تم باغ واپس کردو''۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ ثابت یہ باغ قبول کرلے اور بیوی سے علیحدگی پر رضامند ہو جائے۔ (۳۸) (صحیح بخاری)

بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ باوجود اس کے کہ ثبوت کی تشریح فراخ دلی سے کی جاسکتی تھی لیکن بہت سے فقہاء اور قانون دانوں نے اس کے برعکس کیا اور جہاں تک وہ کرسکتے تھے انہوں نے عورت کے حقوق کو محدود کرنے کو ترجیح دی۔ یہ ایک عام رسم بن چکی ہے کہ کسی عورت کو اس رعایت سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھانے دیا جاتا جب تک کہ وہ اس کی استدعا شادی کے معاہدے میں نہیں کرتی اور دوسری جگہوں میں اسے اس کے استعمال کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جاتی جب تک اس کا خاوند محدود سی انتہائی خرابیوں میں سے کسی ایک کا مرتکب نہیں ہوتا۔

طلاق کے مسئلے میں قرآن میں دیئے گئے ضابطے بڑے واضح ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کے حقوق پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ مردوں اور عورتوں (دونوں جنسوں کو) یکساں طور پر نہیں لیا گیا۔ مثال کے طور پر عورتوں کو طلاق کے بعد دوسری شادی کرنے سے قبل تین ماہ کا عرصہ ضرور گزارنا چاہئے تاکہ اس بات کا پتہ چل سکے کہ حمل تو نہیں ٹھہر گیا اور شکم مادر میں موجود بچے کی ولدیت تو نہیں عیاں ہوگئی جبکہ مرد نئی شادی فوراً کرسکتے ہیں۔ تاہم اس سے اس امر کی یقین دہانی ضرور ہوتی ہے کہ برابری اور غیر جانبداری نظر انداز نہیں کی جاتی۔ ایک بار پھر یہ بات قرآن کے دلآویز اور دلکش پہلوؤں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتی ہے اور یہ ہے ان چیلنجوں کے مقابلے کیلئے چوکس وخبردار رہنا جو نزول وحی کے وقت اور صدیوں بعد بھی سامنے آسکتے تھے۔ ساتویں صدی میں یہ بات ضروری نہیں تھی کہ مذہبی ضابطوں کی رو سے مرد اور عورت کے درمیان پائی جانے والی عدم یکسانیت کیلئے کسی استدلال کی ضرورت ہو اور اس دلیل وحجت کو کافی نہ سمجھا جاتا کہ مرد پیدائشی طور پر اور اپنی صفات اور جوہر کی بنیاد پر عورتوں سے برتر ہیں۔ پھر بھی قرآن طلاق پر نازل ہونے والی ایک آیت کے آخر میں یہ دفاع پیش کرتا ہے:

Marfat.com

''عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔'' (۲:۲۲۸)

اور ہمارے پاس وہ آیت بھی ہے جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے:

''اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں اور جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں ہے۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بناء پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔'' (۴: ۳۲۔۳۴)

قرآن کے نقطہ نظر سے یہ بات ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عورتوں کے حقوق کا معاملہ جھگڑے کی وجہ بن سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو وسیع تناظر میں اس بات کو دیکھنا چاہئے جس میں انفرادی اعلانات کئے جاتے ہیں۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کے کم و بیش ایک جیسے حقوق و فرائض ہیں مگر دونوں میں سے مرد کے حصے میں زیادہ آتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ مصنف نے معاشرے کے مکمل مزاج کو سامنے رکھا ہے۔

جنت کو جانے والے راستے

جب ان دونوں نے ایک دوسرے کو دوبارہ پالیا تو میں انہیں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس ملاپ میں جو تسکین اور راحت دونوں کو میسر آئی تھی اس نے ان کی اس اذیت کو یکسر فراموش کرا دیا تھا جس سے ماضی میں وہ دونوں گزر چکے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور جو محبت و

Marfat.com

الفت اب دونوں میں پائی جاتی تھی یہ برسوں سے ان کا مقدر تھی۔ اگر اللہ ہمیں اپنی صفات رحیمی وکریمی میں سے کچھ عطا کردے، میں نے سوچا، تو رحمدلی و ہمدردی کا زیادہ بڑا حصہ عورت پاتی۔ یہ بات درست نکلی تھی، میری تیسری بیٹی کی ولادت کے کچھ سیکنڈ ہی بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس تخلیقی تحریک اور ہیجان واضطرار کی ایک جھلک دکھا دی گئی ہے جو ہمیں اس دنیا میں لاتی ہے۔

قرآن بلا کسی رورعایت کے اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تخلیق ایک ہی روحانی جوہر سے ہوتی ہے اور اچھائی، بھلائی اور نیکی میں کسی ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں۔ پھر بھی اسلام اس ضمن میں مرد اور عورت کی روحانی ترقی کے ان مختلف طریقوں کا اعتراف کرتا ہے جو انہیں اپنی اپنی جگہ موزوں اور موافق لگتے ہیں۔ میری ماں ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتی کہ دنیا میں ماں کی اپنے بچوں کیلئے محبت سے زیادہ کوئی اور محبت وجود ہی نہیں رکھتی۔ اور اس رائے کو اسلام سے تصدیق مل سکتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کئی جگہ قرآن میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ انسان خدا پر انحصار کرتا ہے جس طرح بچہ ماں کی مامتا پر (۳۱: ۱۴، ۴۶: ۱۵) اور بہت سی احادیث نبویؐ میں بھی اللہ کی محبت کا ماں کی محبت سے موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک موقعہ ایسا آیا جب آپ نے ایک ایسی ماں کی جانب اشارہ کیا جو اپنے شیر خوار بچے سے لاڈ پیار کر رہی تھی۔ آپؐ نے اپنے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کیا ان کے خیال میں یہ عورت کبھی اپنے بچے کو آگ میں بھی پھینک سکتی ہے۔ جب انہوں نے جواباً عرض کیا کہ ایسا ممکن نہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اور اللہ تو تم سے اس ماں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔'' (۳۹) ماں کی محبت نہ صرف یہ کہ زمین پر اللہ کی محبت سے قریب تر ایک بہت چھوٹی مثال ہے بلکہ یہ تو اس کے لئے سب سے زیادہ باعث تقویت ہے اور روحانی مراتب تک رسائی کے راستوں میں سے ایک اہم راستہ۔ حدیث نبویؐ میں آتا ہے کہ ''ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔'' (۴۰) اسے یہ شکل اور بہتر طور پر یوں دی جاسکتی ہے ''ایک عورت کی مامتا جنت تک رسائی میں ایک سہارا ہے۔'' ہمیں اس بات پر یقین کرتے وقت بھٹک نہیں جانا چاہئے کہ شفقت پدری ایک مرد کی اخلاقی ترقی اور سیرت و کردار کی بلندی کے حصول میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی کئی آیات اور احادیث نبویؐ اس کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہی ماخذ ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کسی نیک اور اچھے مقصد کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں

Marfat.com

سر تسلیم خم ہے

ڈال سکتا ہے اور تسلیم و رضا کا یہ فعل انسانی زندگی میں کوئی چھوٹا کام نہیں کیونکہ یہی اسے اس کی منزل مراد تک پہنچاتا ہے۔

اگر ہم قرآن پاک کی آیات ۳۱: ۱۴، ۴۶: ۱۵ کو بغور پڑھیں تو ہم پر خدا۔ انسان۔ ماں۔ اور بچے کے درمیان پائے جانے والے رشتہ و تعلق کی گہری متصوفانہ مثال آشکار ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے ذہنوں میں اکثر ماؤں سے اپنی محبت اور لگاؤ کو بڑی مشکل کے دو لمحات سے وابستہ کرتے ہیں جن کا ذکر ان آیات میں آیا ہے: پیدائش اور ماں کی چھاتی سے دودھ پینا۔ لیکن ماہر نفسیات کا خیال یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی میں شدید اکھاڑ پچھاڑ اس کی شخصیت کی نشو و نما میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ عمر بھر کا ذہنی و جسمانی تناؤ۔ جو شعوری سے زیادہ لاشعوری ہو جو رحم مادر میں میسر آرام و سکون، ماں کی چھاتی سے ملنے والے دودھ اور اپنے آپ پر آزادانہ ضرب لگانے کی خواہش کے درمیان ملتا ہے وہ ایسا بنیادی عمل انگیز ہے جس سے ہماری ذات یا خودی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہ دو ناگزیر بڑی تبدیلیاں ہماری زندگیوں میں محبت اور پیار کرنے کے اس جذبے سے جنم لیتی ہیں جسے دبایا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح ہماری اس دنیا کی زندگی جس نے ہمیں اپنے خالق سے، اپنے رب سے جدا کر دیا ہے اور ہمارے اندر کی وہ کشمکش جو اللہ کی طرف لوٹ جانے کی ہماری اس روحانی، اکثر لاشعوری خواہش اور ذاتی خود مختاری کی ہمارے اندر کی خواہش کے درمیان پیدا ہوتی ہے ہماری ساری روحانیت اور شخصیت کی ترقی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس میں ماں اور بچے کا مقدس پیار اس اعلیٰ و ارفع رحم کی علامت بن جاتا ہے جو ہمیں اس دنیا میں لانے کا سبب بنا تھا۔

ایک نظام کے طور پر، اسلام اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ ماں کی ممتا کی برتری، فوقیت اور اہمیت کی محض یاد دہانی بھی مسلمان عورتوں کے لئے بڑی حوصلہ افزاء بات ہے ورنہ یہ عورتوں کو معاشی اور قانونی شناخت کبھی نہ عطا کرتی، نہ طلاق دینے کا حق اور وراثت میں سے اپنا حصہ اسے ملتا۔ ان دنوں مغربی دنیا کے بہت سے مسلمان خاندان بہت کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان ماؤں کو یہ اختیار مل جائے، یہ اور بات کہ اس ضمن میں مشکلات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

Marfat.com

خاونداور بیوی کے رشتے سے ماوراء

ابھی تک ہم ایک خاندان کے اندر اندر مردوں اور عورتوں کے رشتہ و تعلق پر بحث کررہے تھے۔ اصلاً یہ ساری بحث خاونداور بیوی کے بارے میں تھی۔ ایک نظریے یا اصولی مسئلے کی حد تک شادی کے تعلق اور رشتے میں ایک سے زیادہ عورتیں، شریک حیات ہوسکتی ہیں کیونکہ اسلامی قانون ایک مرد کو چار بیویوں تک کی اجازت دیتا ہے۔ پہلی بار جب یہ اعلان ہوا تو یہ قانون درحقیقت ایک خاص حد تک تھا، اس لئے کہ اسلامی عہد سے پہلے عربوں کیلئے بیویوں کی تعداد کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس دور کے مسلمانوں کا ردعمل ملا جلا ہے، ابتداء اس بات پر اصرار سے ہوتی ہے کہ اسلام میں تو ایک شادی کا حکم ہے اور پھر بات چلتے چلتے اس تصور تک جا پہنچتی ہے کہ فطرتاً مردوں میں ایک سے زیادہ شادیوں کی رغبت ہوتی ہے اور یہ کہ اگر ایک سے زائد شادیوں پر پابندی لگادی گئی تو مرد اپنی اس جنسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ناجائز طریقے ڈھونڈ لیں گے۔ اس موضوع پر اکثر غیر مسلموں نے خالصتاً لادینی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ عوامی ٹیلی ویژن پر حال ہی میں ایک ایسا پروگرام دکھایا گیا تھا جس میں اس بات پر تحقیق کی گئی تھی کہ کیا مرد فطرتاً ایک سے زائد شادیوں کے متمنی ہوتے ہیں اور عورتیں جبلی طور پر ایک شادی کی خواہش رکھتی ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے کے طالب علموں کے اخبار نے تقریباً دس طلبہ و طالبات سے ووٹ حاصل کئے، جن سے یہ پوچھا گیا تھا کہ کیا کیلی فورنیا میں شادی کے قابل مردوں کی تعداد کے باعث قانوناً مردوں کو ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کی اجازت دے دی جائے۔ ہر چند کہ پولنگ کسی سائنسی طریقے سے نہیں ہوئی تھی مگر حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جتنے لڑکوں نے ووٹ ڈالا، سب اس خیال کے حامی تھی کہ اجازت دے دینی چاہئے۔ ایک عورت نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں اس کے جنسی اور شہوانی جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کریں گی اور اسے ایک شادی کے مقابلے میں زیادہ آزادی مل جائے گی۔ دوسرے کالجوں کے طلبہ وطالبات سے بھی اسی قسم کے ردعمل کی توقع کی جاسکتی تھی۔ (برکلے انقلاب پسندی کے لئے مشہور ہے)۔ تاہم ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کا تصور کس حد تک مختلف معاشرتی الجھنوں کا حل پیش کرتا ہے اس حوالے سے یہ

Marfat.com

قرآن کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں کیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہوتو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔''
> (۴:۳)

اس آیت کے شان نزول اور اس کی صحیح تشریح کے بارے میں نبیؐ کے صحابہ کرامؓ کے درمیان کچھ عدم اتفاق رائے تھا۔ (۴۱) مگر اس بات پر سبھی متفق تھے کہ بیک وقت ایک مرد اپنے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں نہیں رکھ سکتا۔ قرآن کے مفسرین میں بھی اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ مدینہ کی مسلم ریاست میں جنگ کے باعث بیواؤں اور یتیموں کی تعداد بڑھ گئی تھی اس لئے اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

بہت سے شارحین اور مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں یتیم بچیوں سے شادی کی تجویز دے کر اس ہنگامی صورتحال کا حل پیش کیا گیا ہے اور اس میں شک وشبے کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس آیت کا شان نزول یہی ہو، اس کا مقصد یقیناً زیادہ عام مخاطب ہے اس لئے کہ اس میں صرف یتیم لڑکیوں کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ ''یتامیٰ'' سے مخاطب ہونے کی صورت میں اس میں یتیم لڑکے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ عربی زبان میں مذکر کا جمع کا صیغہ لڑکے اور لڑکی دونوں کیلئے مستعمل ہے لیکن جب صرف لڑکیوں کا ذکر مقصود ہوتو صرف تانیث کا جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے یوں لگتا ہے جیسے مردوں کے بغیر کنبوں کے مسئلے کے حل کیلئے قرآن مردوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے کہ جنگ کے دوران مارے گئے مردوں کے بکھر جانے والے گھروں کو بچا لینے کی غرض سے شادی کے قابل بیوہ عورتوں سے شادی کرلیں اور ان یتیم لڑکیوں کو اپنے نکاح میں لے آئیں جو اس قسم کے سانحہ سے متاثر ہوئی ہوں۔

یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عام حالات میں ایک ہی شادی قابل ترجیح ہوسکتی ہے۔ اس آیت میں جس نوع کا بحران سامنے آیا ہے اسے مستثنیٰ ٹھہراتے ہوئے اور اگر شادی کے لائق مردوں اور عورتوں کی تعداد تقریباً یکساں ہو تو اس صورت میں اس آیت میں دیئے گئے حکم کی تعمیل میں ایک ہی شادی نہایت موزوں اور مناسب رہے گی:

''تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کردو'' (۲۴: ۳۲)

اس بات کی بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ جن خاندانوں میں مرد ایک سے زائد عورتوں سے شادیاں کرلیتے ہیں ان میں زیادہ ذہنی تناؤ کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ جدید دور کے بہت سے مسلمان یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ ایک شادی ہی ترجیحی طور پر کرنی چاہئے اور اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں یہ آیت حوالے کے طور پر لاتے ہیں: ''بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہوسکتے لہٰذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کیلئے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو'' (۴: ۱۲۹) یہی آیت جب ایک دوسرے سیاق و سباق میں سامنے آتی ہے جہاں شادی طلاق کی صورت میں ختم ہونے والی ہو تو اسے غالباً براہ راست آیت ۴: ۲۔۵ کے بارے میں رائے زنی پر مبنی نہیں سمجھنا چاہئے لیکن عبارت کی تشریح و تفسیر میں مدد لینے کی خاطر اس کے استعمال سے منع کیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی آیت نمبر ۴: ۲۔۵ میں اس بے انصافی کے خدشے کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کیا گیا ہے جو ایک سے زیادہ بیویوں کی موجودگی میں پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے ایسا کرتے وقت نہایت احتیاط برتنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً پاکستان میں خرابی کے امکانات کو کم کرنے کی کوشش میں اب حکومت پہلے یہ ثبوت طلب کرتی ہے کہ ایک مرد تمام بیویوں کی ضروریات کو یکساں طور پر پورا کرسکتا ہے، اس کے بعد اسے ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی جاتی ہے۔ (۴۲)

بدقسمتی سے تقریباً کسی بھی زمانے اور مقام پر اس آیت میں مذکور ہنگامی صورتحال ضرور

Marfat.com

موجود ہوتی ہے جس سے چار بیویوں کا جواز نکل آتا ہے۔ ان دنوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایسی بچوں والی ماؤں کی تعداد کافی زیادہ ہے، جن کے شوہر نہیں ہیں اور مسلم رسائل و جرائد میں اکثر ان کی طرف سے یہ التماس اور اپیل شائع ہوتی ہے کہ کوئی خاندان انہیں قبول کر لے۔ ان ماؤں کو زیادہ فکر اپنے بچوں کے بارے میں دامن گیر ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر آیت نمبر ۴: ۳ میں ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: ''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو''۔ عورتوں کی دوسری شادی کے راستے کی امریکہ میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں ایک امریکہ کا قانون اور دوسرا امریکی تہذیب و تمدن کا ایک سے زائد شادیوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا۔ اس کے علاوہ زیادہ تر امریکی مرد یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ تو بمشکل ایک شادی کے متحمل ہو سکتے ہیں دو کا بوجھ کون اٹھائے اور جو مرد پہلی شادی کر رہے ہوں وہ کسی ایسے خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے سے ہچکچاتے ہیں جو کسی ناخوشگوار حادثے کا شکار ہو چکا ہو۔ ان میں سے زیادہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان کی پہلی شادی تو کم از کم اچھے حالات میں ہو۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں کیوں کہا گیا ہے کہ ''پھر دو سے، تین سے یا چار عورتوں سے شادی کرو'' کیونکہ بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دینے کے علاوہ قرآن میں یہ بھی تجویز کیا جا رہا ہے کہ صاحب ثروت مرد جن کی پہلی بیویاں ہیں ان پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بکھرے اجڑے خاندانوں کی نگہداشت کریں۔

''دوسری عورت سے شادی کرو تیسری سے یا چوتھی سے'' اس اجازت سے دراصل ان مردوں کی حوصلہ افزائی مقصود ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جب تک امریکی مسلمان ایک سے زائد شادیوں کے راستے میں حائل رکاوٹوں پر قابو نہیں پا لیتے انہیں کم از کم مسلم برادری کیلئے ایک ایسا فنڈ ضرور قائم کر لینا چاہئے جس سے تنہا ماؤں کی مدد کی جا سکے۔ (۴۳)

شادی کے رشتے اور تعلق سے باہر کاروبار، سیاست، تعلیم اور ان سے پیوستہ دوسرے موضوعات مثلاً لباس اور مردوں، عورتوں کے غیر مخلوط اجتماعات میں عورت کے مقام و مرتبے پر ان دنوں بڑی بحث ہو رہی ہے مسلم برادری میں عورتوں کی حیثیت کے موضوع پر بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ شہادت اور گواہی کے معاملے میں مسلم عورت کے مقام و مرتبے کو اکثر و بیشتر زیر بحث لا کر شہری اور قانونی معاملات تک اس کی

رسائی محدود کردی جاتی ہے ہم اس موضوع پر گفتگو سے پہلے اس کا جائزہ لیں گے۔

عورتوں کی گواہی

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدت کیلئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے، جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ سے، اپنے رب سے ڈرنا چاہئے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کراسکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔'' (۲: ۲۸۲)

عورتوں کو سیاسی اور سرکاری دفاتر سے دور رکھنے کیلئے اس آیت کا سہارا لیا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ عورت ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے مرد سے کمتر ہے اس لئے اسے اس حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ دوسرا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ تجارتی معاملات سے باہر بھی اس کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی۔ (۴۴)۔ خوش قسمتی سے، جیسا کہ بدوی نے بھی یہی اظہار کیا ہے، ابتدائی دور کے مسلم سکالرز عالمی سطح پر یہ آراء نہیں رکھتے تھے اور دور حاضر کے سکالرز بھی آہستہ آہستہ مخالف سمت کا رخ کر رہے ہیں (۴۵)۔ فوری طور پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ زیر بحث سوال کا اصل مقصد یہ ہے (اور میں نے تو اس میں سے صرف نصف کا ہی حوالہ دیا ہے) کہ تجارتی معاہدات کا تحفظ کیا جاسکے اور بعد میں پیدا ہونے والے جھگڑوں سے بچا جاسکے۔ وسیع پیمانے پر جہالت سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اسلام نے کسی تجارتی معاہدے کی شرائط کے تحت

Marfat.com

معیارات کی ضمانت فراہم کی اور ایسا کرتے وقت دھوکہ وفریب کے امکانات کم کر دیئے تھے اور یوں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دیا گیا تھا جو کم از کم ماضی میں تو بڑے جھگڑے فسادات کے بعد دور ہوتی تھی۔ اس دور میں اور تمام معاشروں میں بعد کی کئی صدیوں تک عورتیں عموماً کم پڑھی لکھی ہوتی تھیں اور مردوں کے مقابلے میں روپے پیسے کے لین دین کے معاملات میں کم تجربہ کار اور باصلاحیت ہوتی تھیں اور اسی لئے قرآن نے دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا۔

قرآن میں آٹھ مختلف مقامات پر گواہی کے موضوع پر ہدایت واحکامات جاری کئے ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق تو صرف کسی عہد و پیمان کے موقع پر قسم کھانے سے متعلق ہے اور ان کا تعلق عام شہادت یا گواہی کے بارے میں نہیں ہے جبکہ دوسری چھ کا تعلق گواہی سے ہے۔ (۲: ۲۸۲، ۴: ۶، ۴: ۱۵، ۵: ۱۰۹، ۵: ۱۱۰، ۲۴: ۴، ۲۴: ۶۔ ۹، ۶۵: ۲) سوائے آیت نمبر ۲: ۲۸۲ کے باقی کہیں بھی گواہ کے مرد یا عورت ہونے کی تخصیص نہیں کی گئی۔ احادیث کے مجموعوں میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں عورتوں کی گواہی کو بغیر کسی تائید وتوثیق کے قبول کر لیا گیا ہے۔ اور بعض اوقات تو ایک خاتون کی گواہی کئی مردوں کی گواہی کو مسترد کر دیتی ہے۔ (۴۶) مزید یہ کہ آنحضرت ﷺ کی بہت سی احادیث ایسی ہیں (مستند احادیث کے مجموعوں میں) جنہیں مستند خیال کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی روایت کرنے والی ایک واحد عورت ہے۔ ان مشاہدات کی روشنی میں بہت سے جدید مصنفین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آیت نمبر ۲: ۲۸۲ کبھی بھی ایک اقرار کے طور پر نازل نہیں ہوئی تھی۔ تجارتی معاملے میں اس ضرورت کیلئے تو مختلف تاویلات پیش کی جاتی ہیں: عورت کی جذباتیت، حیض کے ایام میں اس کی تلون مزاجی، تجارت اور حساب کتاب کے معاملات کیلئے مرد کا فطرتی رجحان۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت ۲: ۲۸۲ کو غیر مالیاتی معاملات تک محدود نہ کیا جائے، جو ان دنوں مغربی دنیا میں پھیلا ہوا تصور ہے تو اس صورت میں صرف آخری تشریح قابل غور رہ جاتی ہے۔ چونکہ دوسرے لوگ، اگر ان کی رائے معتبر ٹھہری تب، تو دوسری صورتوں میں عورتوں کی گواہی کے خلاف استدلال پیش کریں گے مثلاً فوجداری مقدمات کے موقعوں پر۔

امریکہ، یورپ اور دنیا کے دوسرے معاشروں میں بھی عورتیں یہ ثابت کر رہی ہیں کہ وہ

Marfat.com

بلاشعبہ مالیات میں بھی مردوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر تجارت میں تو ابھی تک کاروباری لوگ مرد ہی ہیں مگر عورتیں اپنا مقام بنا رہی ہیں اور تجارتی معاملات پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ تجارت کے لئے عورتوں کی نسبت مردوں میں فطری رجحان زیادہ پایا جاتا ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا دفاع اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ نقطہ نظر عام ہو رہا ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں عورتوں کے تجربے سے دوسرے شعبوں میں فائدہ اٹھایا جائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک بار پھر مالیات کی دنیا میں بلاشرکت غیرے مردوں کا راج ہوگا۔ لیکن یہ تصوراتی اور خیالی دلائل ایسے ہیں جن کا انحصار اس شخص کی بالغ نظری پر ہے جو ایک سچے اور اچھے معاشرے پر نگاہ رکھتا ہے اور وہ معاشرہ درحقیقت کیا ہے اس بارے میں لامحالہ بہت سی آراء ہوسکتی ہیں۔

اس معاملے کا لب لباب گھوم پھر کر قرآن پاک کی بتائی گئی اس شرط کی جانب لوٹ آتا ہے ''اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو''۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب ہم کلام الٰہی پڑھ رہے ہوتے ہیں تو ہم حالیہ تجربے کو قرآنی آیات کے ساتھ جوڑنے یا منطبق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ متن کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اظہار کیا جائے۔ (متن کے سیدھے سادے ترجمے پر انحصار کر لیا جائے) جبکہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کا اصرار یہ ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور زمانے کے مطابق قرآن پاک کی تشریح و تفسیر کی جانی چاہئے۔ مثال کے طور پر:

قرآن نے غلاموں کے ساتھ سلوک کے بارے میں مخصوص معیارات مقرر کر دیئے ہیں (یعنی کوئی غلام عورت بدکاری کی مرتکب ہو تو اسے ایک آزاد عورت کی نسبت نصف سزا دی جائے) ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا کبھی کسی اسلامی حکومت کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ غلامی کی قانوناً ممانعت کر دے؟ زیادہ تر لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہوگا کہ قرآن میں تو غلامی کو مکمل طور پر منسوخ کر دینے کے احکامات موجود ہیں اور یہ لوگ غلامی کے خاتمے کے حق ہی میں استدلال پیش کریں گی۔ اسی طرح کچھ لوگ اس بات پر اصرار کریں گے کہ اسلام تو مردوں اور عورتوں کے لئے تعلیم اور تجارت کے شعبوں میں یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔ کیا یہ مقصد حاصل کر لینا چاہئے اور اختلافات کو ختم کر دینے کی ضرورت ہے، کیا اب بھی اس خیال کو موجود رکھنا ضروری

ہے کہ تجارتی معاملات میں گواہوں کے مرد یا عورت ہونے کے مسئلے کو زندہ رکھا جائے؟ فضل الرحمٰن اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، فرماتے ہیں ۔: ''چونکہ قرآن جس معاملے کا ذکر کررہا ہے وہ تجارتی لین دین کا معاملہ ہے اور چونکہ ان دنوں زیادہ عورتیں روپے پیسے کا لین دین نہیں کرتیں تھیں نہ ہی عام طور پر تجارت کے پیشے سے وابستہ تھیں، اس لئے قرآن نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ گواہ کے طور پر ایک کے بجائے دو عورتوں کا ہونا لازمی قرار دے۔ اگر عورتوں کی گواہی ضروری ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورتیں تعلیم کے میدان میں مردوں کی برابری کرنے لگیں، اور تجارت و مالی لین دین سے واقف ہو جائیں، تو پھر قانون کو اس نئی صورتحال کے مطابق تبدیل کر لینا چاہئے۔'' (۴۷)

مسلمان کسی حد تک خود بخود ایسے جرأت مندانہ فیصلے سے پیچھے ہٹ جائیں گے اس لئے کہ کسی مسلمان مرد یا عورت کیلئے قرآن محض ایک مقدس الہام و وجدان کی ضمنی پیداوار نہیں ہے۔ یہ خالص، براہ راست نزول وحی ہے۔ اس قسم کی جرأت مندانہ تشریح ہدایات واحکامات کی مطابقت سے دور چلی جاتی ہے کیونکہ یہ منشائے خداوندی کو سمجھتی ہے اور اگر اس میں بے احتیاطی برتی جائے تو انسان اپنی من مانی کرنے لگتا ہے اور یہ اللہ کے احکامات سے دور لے جاتی ہے پھر بھی تمام تشریح وتفسیر یہاں تک کہ لفظی تشریح میں بھی قدرے قیاس آرائی شامل ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ فرض کیا جاتا ہے کہ دنیوی اور اس فانی زندگی کے تناظر میں ہدایات نہیں دی گئی ہیں اس لئے اس نکتے پر میں اپنے آپ میں فضل الرحمٰن سے اتفاق کرنے کا میلان پاتا ہوں اس لئے کہ میں اس کی پیش کردہ تمہید اور مقدمے کو قبول کرتے ہوئے یہ مانتا ہوں کہ اسلام کا ایک مقصد و منشا تعلیم اور تجارت کے میدان میں مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنا ہے اور یہ کہ اس اثناء میں قرآن نے مالیاتی معاہدوں کے تحفظ کیلئے موجودہ تفاوت کا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے۔

بے شک ہمیں اس حقیقت سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی نے مردوں اور عورتوں کے مل جل کر کام کرنے کے امکانات میں اضافہ کیا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی ہے جس کا مالیاتی ڈھانچہ ساتویں صدی کے سعودی عرب کے مالیاتی ڈھانچے سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ جوں جوں دنیائے تجارت کی پیچیدگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

Marfat.com

اسی تدرزیرکی، چالاکی اور ہوشیاری پر مبنی نئے نئے طریقے مسلسل دریافت ہوتے جارہے ہیں اور مالیاتی و قانونی اداروں کیلئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے تحفظ کیلئے اور مذکورہ دھوکہ وفریب کے جالوں سے بچنے کیلئے زیادہ سخت معیارات مقرر کردیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اگر کوئی مکان خریدتا ہے، طویل المدت قرضے لیتا ہے اور کسی وصیت کو قانونی طاقت حاصل ہونے کے بارے میں سوچتا ہے تو اسے کئی اداروں کے جائزوں سے گزر کر عوامی ریکارڈ پر پہنچنا ہوتا ہے۔ قرآن چونکہ معاہدات کرنے اور ان کے تحفظ کو بڑی اہمیت دیتا ہے اس لئے میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مالیاتی لین دین کے تمام موجودہ قانونی تحفظات جو زیر بحث آیت قرآنی کے مطالبات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ اکثر عوام کے مفاد اور اس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

لیڈرشپ

پاکستان میں بے نظیر بھٹو کے وزیراعظم پاکستان بننے کے لئے انتخابات نے اس بحث کو جنم دیا ہے کہ کیا مسلم معاشرے میں عورتیں حکمران بن سکتی ہیں۔ اس میں امریکی مسلمانوں کے لئے بڑے اشارے مضمر ہیں، کیونکہ بہت سی نومسلم عورتیں ایسی ہیں جو تنظیمی اور حکومتی تجربے سے لیس ہیں اور ان میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کی ان کی مسلم برادری کو بے حد ضرورت ہے۔ قرآن میں براہ راست تو کوئی ایسی آیت نہیں جس میں اس بات کی ممانعت ہو کہ عورتوں کو حکمرانی کے لئے منتخب نہ کیا جائے اور صرف ایک حکمران خاتون کی مثال قرآن میں پیش کی گئی ہے۔ یعنی ملکہ سبا کی (۴۸)، قرآن نے اسے ایک دانا و بینا، متفکر جمہوریت پسند لیڈر کی شکل میں پیش کیا ہے جسے اپنے عوام کی فلاح و بہبود بہت عزیز ہو اور جو حضرت سلیمانؑ کے زیر اثر اپنی قوم کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک خدائے واحد پر ایمان لے آنے تک رہنمائی کرتی ہے۔ اس امکان کے بارے میں قرآن چونکہ کوئی ممانعت نہیں کرتا اور جس عورت کی واحد مثال پیش کرتا ہے وہ بھی مثبت پیش کی ہے اس لئے ہم یہ گمان کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کیلئے کسی خاتون کا سربراہ مملکت ہونا قابل قبول ہوگا لیکن عام حالات میں معاملہ اس طرح نظر نہیں آتا۔

ایک دلیل تو یہ پیش کی جاتی ہے کہ جو فرائض حکمرانی نبیؐ نے اور چاروں خلفائے

Marfat.com

راشدین نے انجام دیئے تھے وہ کوئی عورت انجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر آنحضرت ﷺ اور ان کے چاروں صحابہ کرامؓ نے باجماعت نماز میں امامت کرائی اور تکنیکی طور پر اگر مرد موجود ہوں تو امامت کے فرائض صرف کوئی مرد انجام دے سکتا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات عسکری صلاحیتیں رکھتے تھے اور سپاہیوں کو لے کر جنگوں میں شریک بھی ہوئے اور یوں لگتا ہے جیسے لیڈر شپ کے اس پہلو کو خواتین پورا نہیں کرسکتیں۔ چونکہ مسلمان آنحضرت ﷺ اور چاروں خلفائے راشدین کی سیاسی جانشینی کو ایک مثالی نمونہ تصور کرتے ہیں اس لئے حکومتی سطح پر عورت کسی بہت بڑے عہدے کے قابل نہیں ہوسکتی۔

تاہم فی زمانہ یہ بات بعید از حقیقت ہوگی اگر اس پر زور دیا جائے کہ ابتدائی دور کے مسلم لیڈر یا حکمران جس طرح کے فرائض منصبی ادا کرتے تھے آج بھی ایک لیڈر یا حکمران طبقے کا کوئی بڑا افسر وہی فرائض سرانجام دے۔ آج حکمرانی بڑی پیچیدہ ہوگئی ہے اور بے شک ہم اس کیلئے اسی امیدوار کو ترجیح دیں گے جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتا ہو، عسکری سائنس، اقتصادیات، انتظامیہ اور سبھی شعبوں میں پورے پورے علم و تجربے سے لیس ہو، ہم یہ بھی پسند کریں گے کہ ایسے سرکاری ادارے قائم کئے جائیں جن کے افراد اُن شعبوں میں مکمل دسترس رکھتے ہوں اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سربراہ مملکت صورتحال کے ثانوی پہلو سے ہدایات و احکامات جاری کرسکے گا۔ ہم اپنے سیاسی لیڈران کرام سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ محاذ جنگ پر جائیں نہ ہی ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عسکری معلومات رکھتے ہوں اور نہ ان کو یہ تربیت حاصل ہوگی کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے وقت رہنما کردار ادا کرسکیں۔ البتہ مستند سنی اسلامی قانون میں بمقابلہ تشیعی نقطہ نظر، سربراہ مملکت سے کم توقعات وابستہ کی جاتی تھیں جن کی زیادہ اہم ذمہ داریاں انتظامی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ جب تک وہ ریاست کے دفاعی معاملات بحسن و خوبی چلاتا رہتا اور شریعت (اسلامی قانون) کے مطابق عمل پیرا رہتا، شہری اس کے مطیع و فرمانبردار رہتے تھے۔ (۴۹)

ایک اور بہت سنجیدہ سا اعتراض آنحضرت ﷺ کی اس حدیث پر کیا جاتا ہے: ''جو قوم ایک عورت کو اپنا حاکم چن لے وہ کامیاب و کامران نہیں ہوتی''۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں دی گئی ہے (۵۰) جبکہ احادیث کے دوسرے مجموعوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً ایسے لوگ

''بدقسمت'' ہوتے ہیں یا ''ناخوش'' ہوتے ہیں۔ حال ہی میں اس حدیث کے استدلال پر اعتراض کیا گیا ہے لیکن مسلم سکالرز کی اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے تو اس حدیث پر شک کرنے کا کوئی خاص سبب نظر نہیں آتا اس لئے کہ راوی جن کا نام ابوبکرہ ہے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں آزاد کرایا تھا اور یہ نفیع بن مسروح کے نام سے بھی مشہور ہیں اور ان سے کئی مستند احادیث روایت ہیں۔ (۵۱) پھر یہ بات بھی ہے کہ اس حدیث کے بیان کی تفصیل میں مطابقت و ربط باہمی پایا جاتا ہے اور اس عہد کے پیچیدہ سیاسی انکشافات اسے مزید قابل یقین اور قابل اعتبار بنا دیتے ہیں۔ اگر کوئی عورت کی حکمرانی کی قدر و قیمت کم بھی کرنا چاہتا ہے تو سیدھے سادے راستے میسر تھے۔

آنحضرت ﷺ کے مشن کے آغاز سے چھ سال بعد، بمطابق ۶۱۵ ۔ ۶۱۶ بعد مسیح تیسویں سورۃ نازل ہوئی تھی۔ اس وقت تک ایرانی فتوحات کا سلسلہ بازنطینی سلطنت کے خلاف جاری تھا جس نے مسیحی سلطنت کو مکمل شکست کے دہانے لا کھڑا کیا تھا اور یروشلم ہاتھ سے نکل چکا تھا اور مکمل خاتمے کا سگنل مل چکا تھا اس نئی صورتحال پر بت پرست قریش بہت خوش تھے اس لئے کہ یہ توحید پر ایک ضرب کاری تھی۔ اس سورۃ کے آغاز میں ناقابل تصور مراجعت کی پیش گوئی شامل تھی:

''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلومیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔''
(۳۰:۲۔۴)

تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ اس کے فوراً بعد اہل فارس کی تقدیر بدل گئی تھی۔ سن ۶۲۲ء اور ۶۲۷ء کے درمیان سلطنت روم اس قابل تھی کہ شاندار فتح پر فتح کے بعد اپنے کھوئے ہوئے مقبوضہ جات واپس لے سکے اور اہل فارس کے علاقے میں دور تک اندر داخل ہو جائے۔ ۶۲۸ء میں سلطنت فارس کو زوال آیا اور خسرو کو، جو ایرانی شہنشاہ تھا پہلے قید میں ڈال دیا گیا اور پھر اسے قتل کردیا گیا تھا۔ آئندہ برس کے بحران میں کم از کم دس مختلف حکمران اس متزلزل سلطنت کے تخت پر بیٹھے جن میں خسرو کی بیٹی بھی شامل تھی۔ جس کا دور حکومت ایک برس سے کچھ اوپر تھا۔ یہ ایران کی پوری تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ سلطنت کی حکمرانی ایک عورت کے

Marfat.com

حصے میں آئی تھی۔ (۵۲) جب وہ مسلمان جو بغور دیکھ رہے تھے کہ ایران میں کس قسم کے سیاسی حالات رونما ہو رہے ہیں اس بات کے بھی منتظر تھے کہ دیکھتے ہیں قرآن پاک کی پیش گوئی کب درست ثابت ہوتی ہے۔ اسی دوران انہوں نے سنا کہ ایک عورت حکمران بن گئی ہے، یہ خبر لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے مذکورہ بالا تبصرہ فرمایا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا یہ محض ایک عام اصول کے طور پر فرمایا یا اس عہد میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں پر تبصرہ کے طور پر۔ اسے اس کے تاریخی تناظر سے جدا کر کے ان عورتوں کے خلاف ایک مستقل ہدایت اور حکم کے لیا جاسکتا ہے جو حکمران بننے والی ہوں۔ دوسری طرف آنخضرت ﷺ قرآنی پیش گوئی کی تصدیق بھی فرما رہے ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کو یقین دہانی کرا رہے ہوں گے کہ اس طرح کی تحریک سے ایرانی سلطنت زوال سے بچ نہیں سکے گی اور ان کا اپنے ماضی کی بنیاد سے اس قدر دور ہو جانا تو خود اس بات کی دلیل تھی کہ ان کا زوال ناگزیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ فیصلے کا انحصار دوسرے ثبوت کی طرف رجوع کرنے پر ہے۔ قرآن نے چونکہ ملکہ سبا کی بڑی مثبت تصویر کشی کی ہے اور ماضی و حال میں حکمران خواتین کا ریکارڈ بھی اچھا رہا ہے اور پھر آج کی مغربی ثقافت میں بھی اس تصور کو پذیرائی مل چکی ہے اس لئے اگر امریکی مسلمان عورت کی حکمرانی تسلیم نہیں کریں گے تو مجھے حیرت ہوگی۔

عورت کا لباس

کیرن نوجوان، خوبصورت ملائشیائی عورتوں کی پرخلوص اور سچی دعوت کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی اور اسلام قبول کر لینے کے چند ہفتوں بعد جن مسلمانوں سے اس کی ملاقات ہوئی وہ اس کی طرح رات کی نمازیں باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ایک استثناء یہ تھی کہ وہ سبھی مرد تھے۔ اس لئے وہ تو پہلے ہی سے منتظر تھی کہ اس کی ملاقات خواتین سے ہو جائے۔ کیرن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان سب کے درمیان صرف وہ روایتی اسلامی لباس میں نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کیمپس میں مسلمان خواتین کو مغربی ملبوسات میں دیکھا کرتی تھی۔ اسے زیادہ تعجب تو اس وقت ہوا جب اسے پتہ چلا کہ اس شب لیکچر بھی اسلامی لباس کی پابندی پر تھا۔ ظاہری بات ہے

Marfat.com

کہ لیکچر کے موضوع کی مناسبت سے ان عورتوں کو اسلامی لباس میں ہی آنا چاہئے تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر مذہبی اختیارات کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا ہو اور اس سے جرح کی جا رہی ہو۔ وہ خواتین جو مغربی لباس پہنتی تھیں ان کی نظر میں یہ لباس پروقار مذہبی رسومات کی ریاکاری تھی جبکہ ایک دوسری امریکی نومسلم نے مغربی معاشرے، خصوصاً اس کی عورتوں کی طرف سے خطرات، بیماریوں، سفلی خواہشات کو عام کرنے کی کوشش کا نام دیا جنہیں یہ عورتیں اپنے نیم برہنہ جسموں کی نمائش کے ذریعے پھیلاتی ہیں۔ اس امریکی نومسلم خاتون نے تو ناخن پالش پر بھی تنقید کرتے ہوئے اسے ''برائی'' کا نام دیا۔ کیرن یہ سن کر اپنی انگلیوں کو چھپانے کی خاطر ہاتھوں کو اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی!۔ اسے خیال گزرا کہ وہ وہاں سے کھسک جائے یا ان سے کہے کہ وہ وہاں سے چلی جائیں۔ اور وہ ان سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اپنے کام سے سروکار رکھیں۔ اسلام پر وہ پہلا لیکچر سن رہی تھی اور اس میں ساری توجہ کا مرکز، سب سے ضروری معاملہ تھا سر ڈھانپنے کیلئے سکارف کی اہمیت کا۔ کیرن نے مجھ سے کہا ''کاش آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا کہ ان خواتین کی دعوت کس لئے تھی'' میں نے اسے بتایا ''میں یہ بات بالکل پسند نہیں کرتا کہ تمہیں اس طرح تکلیف پہنچے۔''

عملاً تمام مسلمان عورتیں زندگی میں کبھی نہ کبھی اسلامی لباس کی پابندی کے مسئلے پر ضرور تڑپ اٹھتی ہیں۔ ''مسلم خواتین'' سے میری مراد صرف امریکی یا مغربی دنیا کی مسلم خواتین نہیں اس لئے کہ میں نے سعودی عرب میں بھی دیکھا ہے کہ بہت سی عرب عورتیں اسلامی لباس کی پابندی صرف اس دوران کرتی ہیں جب وہ گھروں سے نکل کر عام جگہوں میں آتی ہیں اور ایسا حکومت کی طرف سے لگائی گئی پابندی کے باعث بھی کرتی ہیں اور اپنے گھروں کے اندر، اجنبی مردوں (غیر محرموں) کی موجودگی میں بھی مخصوص لباس پہنتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہی عورتیں، متفقہ طور پر اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ ایک مسلمان لڑکی کو عنفوان شباب میں، سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد اسلامی لباس کی پابندی ضرور کرنی چاہئے۔ اور اپنے لئے اسلامی لباس کے نہ پہننے کی رعایت اور معافی یہ کہہ کر مانگ لیتی ہیں کہ یہ ان کے ایمان کی کمزوری ہے۔ (۵۳) چونکہ جزیرہ نما عرب ایک نہایت روایتی، قدیم، مسلم ثقافت کا علمبردار ہے اس لئے عورتوں کی ایک محدود تعداد سے اس بات کی امید رکھنی چاہئے کہ وہ دوسرے مقامات پر روایتی لباس کی

Marfat.com

پابندی کریں گی۔

مغربی دنیا میں مسلم خواتین کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں اور خصوصاً نومسلم خواتین کی جس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مزید یہ کہ وہ ایک ایسے دینی نظام میں داخل ہوتی ہیں جسے ان کے ہم وطن اجنبی اور خطرے کا باعث سمجھتے ہیں، مسلم برادری ان کی خوصلہ افزائی کرتے ہوئے پیدائشی نام بدل کران کے عربی ناموں پر زور دیتی ہے اور روزمرہ کی گفتگو میں عربی بول چال کے بہت سے معیاری لہجوں کے استعمال پر اصرار کرتی ہے۔ ان میں سے کہیں کہیں تو ایسا محض اتفاقیہ ہوتا ہے اور کہیں کہیں مفید بھی مگر ان کا مجموعی اثر شناخت کی مشکلات پر آ کر ختم ہوتا ہے اس مسئلے کو اس حقیقت سے اور بھڑکا دیا جاتا ہے کہ بے شک مسلمان مردوں کا تکنیکی لحاظ سے ایک خاص اسلامی لباس ہے مگر عورتوں کے مقابلے میں اس لباس کی پابندی میں لچک زیادہ رکھی گئی ہے اور اس لباس کی تشریح میں بھی بڑی فراخدلانہ آزادی شامل کردی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مرد کے جسم کا وہ حصہ جسے ڈھکا ہوا ہونا چاہئے، ہمیشہ ناف اور گھٹنوں کے درمیان کا حصہ بتایا جاتا ہے۔ سعودی عرب کے علماء نے حال ہی میں قانونی ماخذ پر نظر ثانی کرتے ہوئے مرد کے جسم کے اس حصے کو ناف اور ران کے درمیان کا حصہ قرار دیا ہے۔ ایک مغربی مرد اسلام قبول کرسکتا ہے اور جب تک چاہے اپنے مذہب کو چھپا سکتا ہے مگر اس عورت کے لئے ایسا ممکن نہیں جو مذہبی ضرورت کے ساتھ مصالحت کے لئے رضامند نہ ہو۔ اس کا تو اسلامی لباس ہی بتادے گا کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔

قرآن نے بلاشبہ عورتوں اور مردوں کو پاک دامنی اور شرم وحیا کے بارے میں اظہار کے وقت مختلف اسلوب اختیار کیا ہے۔ مردوں کے شریفانہ، ستر پوشی کے یا شرم وحیات کے اصولوں پر مبنی لباس کیلئے اس میں واضح ہدایات اور احکامات کوئی نہیں مگر عورتوں کے بارے میں تین جگہ براہ راست بیان موجود ہے۔

> ''اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے ...... وہ

Marfat.com

اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ وہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔" (۲۴:۳۱)

"اور جو عورتیں جوانی سے گزر بیٹھی ہوں، نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم وہ بھی حیا داری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔" (۲۴:۶۰)

"اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔" (۳۳:۵۹)

اسلامی عہد سے پہلے عرب کی ایک قبائلی عورت کا لباس سر کی آرائشی اوڑھنی پر مشتمل ہوتا تھا جو اس کی کمر تک لٹکی رہتی تھی، اس میں سے صرف سامنے کے بال نظر آتے تھے، ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ ہوتا تھا جس میں صرف سینے کے درمیان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا، ایک سکرٹ نما ڈھیلا ڈھالا لباس کمر کے گرد باندھا ہوتا تھا، مختلف زیورات پہنے جاتے تھے مثلاً انگوٹھیاں، جھمکے یا بالیاں، بازوؤں میں کنگن اور پاؤں میں پازیب (۵۴)

اس قسم کا لباس نہ صرف دلفریب اور دلکش ہوتا تھا بلکہ صحرائے عرب کی شدید گرمی کی عین ضرورت کے مطابق ہوتا تھا، اس صدی تک بھی عرب کی کچھ بدو عورتیں یہی لباس پہنتی ہیں، یورپی سیاح ان خواتین کی تصاویر میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتے تھے (۵۵) مسلمان عورتوں کیلئے قرآن پاک میں فرمان الٰہی یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنے سروں کی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں اور ایک لباس کے اوپر دوسرا لباس یعنی چادریں وغیرہ اوڑھ لیا کریں جب وہ گھروں سے باہر لوگوں میں جائیں اور اپنے جسموں کو یوں چھپا لیا کریں جس سے انہیں کم سے کم زحمت ہو اور ان کا لباس ایسا ہو جس میں شرم وحیا کے تمام تقاضے پورے کیئے گئے ہوں۔ (۳۳:۵۹) آگے چل کر (۲۴:۳۱) بیان ہوتا ہے کہ اپنے گھروں میں واپس آ کر انہیں اجازت ہے کہ افراد کنبہ کے سامنے اور گھریلو ملازموں کے سامنے اپنا روایتی لباس پہن لیا کریں۔ ان آیات قرآنی

Marfat.com

کے ساتھ وابستہ احادیث نبویؐ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، خصوصاً وہ احادیث جو قرآن کی آیت (۳۳: ۵۹) سے وابستہ ہیں کہ یہاں اصل مقصد جنسی خرابیوں سے متعلق گفتگو ہے۔ معاشرہ چونکہ ہمیشہ جنسی طور پر مردوں کی نسبت عورتوں کا جنسی استحصال زیادہ کرتا ہے اسی لئے عورتوں کے لباس پر زیادہ خصوصی زور دیا گیا ہے۔ قانون دانوں اور فقہاء نے مسلم عورتوں کے لئے ایک خاص لباس کی پابندی پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ تاہم آیت (۲۴: ۳۱) میں ''خمر'' یعنی سر کی اوڑھنی کا ذکر ہے جس سے سر اور سینے کو ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور لباس کا ذکر (۳۳: ۵۹) کا ہے جس میں ''چادروں کے پلو'' سے جسم کو چھپا لینے کی ہدایت کی گئی ہے اور یہ بعد کے دور کا ذکر ہے اس مسئلے پر ابتدائی عہد کے فقہاء نے جو کچھ بیان کیا جس میں آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کے دور کی نسل بھی شامل ہے اور اس کے جانشین بھی۔ ان کے نزدیک مسئلہ یہ تھا کہ کیا گھروں سے باہر عورت کو چہرے پر نقاب اوڑھنا چاہئے یا نہیں یا اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھ باہر رکھ سکیں (۵۶) اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھا جا سکتا ہے اور اکثریت کے اس اتفاق پر ہی آج بھی عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی دنیا میں عورتیں ایک ہی طرح کی تراش خراش والا مذہبی ہدایت کے مطابق لباس ضرور پہنیں۔ اس لئے کہ دنیائے اسلام میں مختلف علاقوں کے پہناوے میں بڑا فرق ہے۔ مصری عورتیں اکثر اپنے سروں کو ڈھانپتی ہیں، لیکن گردن کو کھلا رکھتی ہیں، ملائشیائی عورتوں کے لباس میں کبھی کبھی پتلون بھی شامل ہوتی ہے لیکن اس کے اوپر ایپرن ہوتا ہے، سعودی عرب کی خواتین سر کی اوڑھنی کے آنچل کو گردن کے گرد بل دے لیتی ہیں اور ایرانی عورتیں اپنے سروں کے سکارف ماتھے پر اتنا نیچے لے آتی ہیں کہ بھنویں چھپی رہیں، تاہم پورے عالم اسلام میں اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ عورت کے صرف ہاتھ اور منہ باہر رہنے چاہئیں، یہ نظر آتی رہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ اس بارے میں اختلافی آراء نہیں ہیں اس لئے کہ ان مسلمان عورتوں کی مشکلات کا بھی آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو سفر میں ہوں یا غیر اسلامی معاشرے میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔

آج تک سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ روشن اور واضح استدلال جو اس بارے میں زیادہ لچک کے حوالے سے پیش کیا گیا وہ اسد کی طرف سے آیا حالانکہ اسلامی قانون

کے روایتی شارحین صدیوں سے اس ہدایت کی تشریح کو محدود کردینے کی کوشش کررہے ہیں کہ ''عورت کے جسم کا کون سا حصہ (تہذیب، وشائستگی سے) کھلا رہ سکتا ہے'' جس میں عورت کا چہرہ، ہاتھ اور پاؤں شامل ہیں۔ اور بعض اوقات اس سے بھی کم۔ ہم بلاخوف وخطر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ''الا ماظہر منہا'' کے معنی بہت وسیع ہیں اور اس میں دانستہ طور پر ابہام پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے ان ناگزیر تبدیلیوں کا راستہ کھول دیا جائے جو مرد کی اخلاقی اور سماجی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ اس حکم میں مرکزی حیثیت جس ذیلی جملے کو حاصل ہے وہ ہے مطالبہ، جو یکساں طریقے سے مردوں اور عورتوں دونوں سے کیا گیا ہے کہ ''نظریں نیچی کرلیں اور اپنی پاک دامنی کی حفاظت کریں'' اور یہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کسی بھی زمانے میں قرآنی اصولوں کے مطابق اور اخلاقیات کی حدود کے اندر رہ کر کسی انسان کی ظاہری شکل و صورت میں سے کس شے کو ''شائستہ ومہذب'' یا ''غیر شائستہ یا غیر مہذب'' کہا جائے گا۔

چنانچہ سر کی اوڑھنی کے پلو سے اپنے سینے کو چھپا لینے کے حکم کا جہاں تک تعلق ہے (یہ اصطلاح نبیؐ کے معاصرین میں بہت عام فہم تھی) ضروری نہیں کہ اوڑھنی کے پلو کو اس طرح استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہو بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ عورت کا سینا اس تصور میں شامل نہیں تھا کہ ''جو عورت کے جسم میں سے شائستگی وشرافت کے ساتھ کھلا تو رکھا جاسکے'' مگر جس کی نمود و نمائش نہ کی جائے۔

مذکورہ بالا آیت کا شان نزول (اس حوالے سے ظاہر ہو جاتا ہے جہاں نبیؐ کی بیویوں اور بیٹیوں کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے) اور اس سفارش کا دانستہ ابہام کہ عورتیں ''اپنے لباس کے اوپر کوئی ایپرن یا چادر اوڑھ لیں'' جب گھروں سے باہر غیر محرموں کے سامنے جائیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت بطور ایک عام حکم کے نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ زمان ومقام کی قید سے آزاد ایک اخلاقی رہنما اصول کے طور پر بدلتے وقت اور سماجی ماحول کے پس منظر میں نازل ہوئی تھی۔ خدا کے عفو ودرگزر اور تائید الٰہی کے آخری حوالے سے اس فیصلے کو بڑی تقویت ملی ہے۔ (۵۷)

اسد کی معقول اور قوی دلیل اس کے اس اصرار کی وجہ سے ماند پڑ جاتی ہے کہ کسی مسلم عورت پر یہ پابندی کہ وہ اپنے سینے کو برہنہ نہ رکھے ہر زمانے کیلئے ہے اس لئے کہ اگر ایک

اوڑھنی، چادر یا پوشش ہمیشہ کیلئے مقرر ہو جاتی ہے تو دوسری کیوں نہیں ہوسکتی؟ نظریات کے انتخاب کا الزام یقیناً لگایا جائے گا اور جب کبھی بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں نئی تشریح و تصریح سامنے آئے گی تو اس قسم کے الزام کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ مخصوص لمحات میں آیات کا ابہام یقیناً مختلف ثقافتی و تہذیبی باتوں کو اپنا لینے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے ایسے لمحات بہت سے آئے لیکن جو مسئلہ اس وقت درپیش ہے یہ ان بہت سے مسائل میں سے ایک ہے۔

اب تک اس قسم کے معاملات پر میں نے اور دوسرے مصنفین نے اس بات کی وکالت کی ہے کہ متعلقہ حضرات کو چاہئے کہ جب کبھی کسی قرآنی آیت کا جواب دے رہے ہوں تو قرآن کی مجموعی ہدایت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، مسلمان اب جنگ کی تیاری کیلئے گھوڑوں کے جمع کرنے پر اصرار نہیں کرتے، حالانکہ قرآن میں بڑے واضح الفاظ میں اس کا حکم موجود ہے (۸: ۶۰) اور یہ اس لئے درست ہوگا کیونکہ اس سے جنگ کیلئے تیاری کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے موجودہ معاملے میں ہمیں پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا مسلم برادری کو لباس کے بارے میں کوئی کم سے کم معیار شائستہ و مہذب لباس کا مقرر کرنا چاہئے۔ غالباً تمام مسلمان آیت (۲۴: ۳۱) کی بنیاد پر اسے ضرور تسلیم کریں گے جیسا کہ محمد اسد نے اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ وہ یقیناً اس بات پر بھی متفق ہوں گے کہ ابتدائی عہد کی مسلم برادری سے ورثے میں ملے ہوئے لباس کی پابندی جو نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی ماضی میں تو یقیناً مناسب و موزوں تھی اور قرآن کے عین مطابق تھی۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس مرحلے میں آ کر مسلمانوں کیلئے یہ زیادہ بہتر ٹھہرا کہ وہ مغربی معیار اپنا لیں۔ اس طرح کی تبدیلی کیلئے کوئی اخلاقی یا نفسیاتی جواز تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ اسد نے خود اس صدی کے ابتدائی حصے میں اپنی کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' میں مسلمانوں سے اصرار کیا کہ وہ مغربی معیارات نہ اپنائیں۔ (۵۸)

نصف صدی کے بعد جب اسی کتاب کا نظرثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا تو مصنف نے اپنے سابقہ نقطہ نظر پر کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کیا اور اس بات کو دہرایا کہ اپنے وقت میں وہی نظریہ درست تھا۔ مگر اس کے خیال میں اس گزرے ہوئے زمانے سے لے کر بعد کے

دور تک مسلمان مغربی ثقافت کو اس قدر گہرائی تک اپنا چکے تھے کہ پھر سے ابتدائی دور کے طور طریقوں کی طرف لوٹنا اسی قدر مشکل اور بے معنی تھا جس قدر مغربی طرز زندگی کو ابتداً اختیار کرنا۔ اس کی رائے میں اس کے معنے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں تھے کہ ''ایک اور بے ثمر کوشش کی جائے اور اوچھے اور نازیبا طریقے سے نقالی نہ کی جائے: یہ نقالی ایک مردہ اور نا قابل واپسی ماضی کی ہوگی'' دوسرے لفظوں میں معاشرتی طور طریقے اور رسم و رواج ایک زیادہ طاقتور تہذیب سے مقابلے کے دوران منطقی نتیجے کے طور پر بہتری یا زیادہ خرابی کے لئے تبدیل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ جس بات کو ماضی میں استحصال کا نام دیا جاتا تھا یا جسے غیر شائستہ اور غیر مہذب لباس سمجھا جاتا تھا اسے اب ویسا تصور نہیں کیا جاتا۔

بہت سے مسلمانوں کو اس دلیل سے ہم خیال بنانا مشکل ہوگا اس لئے کہ ایک مسلمان کے عقیدہ و ایمان کا یہ اہم حصہ ہوتا ہے کہ مذہب کسی معاشرے کے اخلاقی معیارات کو تعین کرتا ہے، اس کے برعکس نہیں۔ مزید یہ کہ عملی طور پر گو روایتی لباس کی پابندی نہیں کی جاتی پھر بھی لباس کی یہی پابندی مسلمان مردوں اور عورتوں کی طرف سے کم و بیش دنیا بھر میں مثالی لباس کے طور پر کی جاتی ہے۔ حال ہی مین دنیا بھر کے مسلمانوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عورتوں کے روایتی لباس نے بڑے پیمانے پر ایک بار پھر مقبولیت حاصل کی ہے۔ حرف آخر کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآنی روح کے عین مطابق ہے، جو چودہ سو سال پہلے کے رسم و رواج سے مطابقت رکھتا ہے اور مغربی دنیا میں (مسلمانوں کی رائے میں) صنف نازک کے ناواجب استحصال کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

اس لئے میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس معاملے میں کسی بھی حقیقی نظر ثانی کی بات کو زیادہ تائید حاصل نہیں ہوگی۔ جبکہ دوسری طرف اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جو لوگ اس مسئلے سے دست بگریباں ہیں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے، ان کے مسئلے کو سمجھا جائے اور خاص طور پر مغربی دنیا میں بسنے والی مسلمان عورتوں کی فکر کریں۔ ہماری یہ خواتین بڑی مشکلات اور تکالیف برداشت کر رہی ہیں جن میں جذباتی، معاشرتی، نفسیاتی اور روزگار کی مشکلات شامل ہیں اور لباس کی پابندی کے حوالے سے یہ مشکلات مختلف افراد کے لئے مختلف درجے کی ہیں اور ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان تک رسائی مصالحانہ طور پر

Marfat.com

کرے اور پر حمایت رویہ رکھے تہمت آمیز اور قابل نفرت نہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے (مذہبی پابندیوں کے دائرے میں رہتے ہوئے) مسلمان عورتوں کو رعائتیں دی جائیں تا کہ وہ مسلم برادری کی تقریباً میں شمولیت سے رہ نہ جائیں۔ مسلمان مردوں کو اس معاملے میں احساس اور معقولیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب میں نے ایک بڑا بھونڈا سا منظر دیکھا مسلم خواتین سر سے پاؤں تک مکمل لباس میں ڈھکی ہوئی تھیں اور پکنک کے دوران ایک میز کے گرد مضمحل، حسرت زدہ بیٹھی ہوئی تھیں، سخت گرمی تھی اور ساحل سمندر پر ان کے شوہر انتہائی خوش وخرم دوسرے امریکی غسل آفتابی کرنے والوں کے ساتھ ریت پر لیٹے ہوئے تھے۔

ابھی کچھ وقت لگے گا کہ امریکی اور یورپی مسلمان عورتیں ایسے فیشن اپنا سکیں جو ان کے مذہب اور ثقافت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ البتہ ان کی ضرورت جس قدر بڑھے گی اسی قدر تیزی کے ساتھ ایسے فیشن یقیناً وجود میں آئیں گے۔ اس موضوع پر مسلم برادری کے رویے کو سامنے رکھ کر میں ایک ایسی تجویز دوں گا جو بڑی مؤثر ہوگی اور آیت ۳۳:۵۹ کی روشنی میں دی جائے گی جس میں اس آیت کی تلاوت کرنے والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے عفو و درگزر اور رحم و کرم کے بارے میں یاد دلایا جاتا ہے۔ غالباً جیسا کہ اسد بھی اس بات پر زور دیتا ہے، یہ مستقبل کی ان مشکلات کا اعتراف ہے جو اس خطے کے مسلمانوں کو پیش آئیں گی اور ان میں مسلمانوں کیلئے ان پر قابو پانے کی کوششوں کی ضرورت کا اعتراف پایا جاتا ہے کیونکہ یہ سچ ہے کہ ''اللہ کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہیں ڈالتا۔'' (۲:۲۳۳)

شعبہ تعلیم اور غیر مخلوط اجتماعات

مسلمان علماء اور قانون دانوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حصول تعلیم مردوں اور عورتوں کا نہ صرف ایک حق ہے بلکہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔ عربی لفظ ''علم'' کے معنی ہیں سائنسز یا تحصیل علم، تہذیب عقل و اخلاق جس کا ذکر قرآن میں ۸۵۴ مرتبہ آیا ہے اور عورتوں کو حصول علم کی طرف راغب کرنے کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ (۵۹) اسلامی تاریخ کے بڑے حصے کے دوران، دوسرے کلچرز کی طرح مسلمان عورتوں نے طبیعی علوم کی ترقی کیلئے بہت کم کام کیا ہے

Marfat.com

لیکن ادب کے ارتقاء اور علم قانون میں ان خواتین نے خاصا اثر ورسوخ چھوڑا ہے۔(٦٠) علم حدیث کے شعبے میں جو کردار خواتین نے ادا کیا ہے اس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ صدیقی تحریر فرماتے ہیں کہ ابتدائی کئی اسلامی صدیوں کے دوران اس شعبے میں خواتین یکساں طور پر مردوں کے ساتھ شریک تھیں۔ وہ فرماتے ہیں:

علم حدیث کی پوری تاریخ میں خواتین نے اس علم کو پھیلانے کیلئے مردوں کے ساتھ مل کر ایک خاص کردار ادا کیا۔ احادیث کے مجموعے تالیف کرنے میں تمام اہم مؤلفین نے تاریخ کے ابتدائی زمانے ہی سے زیادہ احادیث خواتین شیوخ سے حاصل کیں۔ احادیث کے ہر مستند مجموعے میں ایسی بہت سی خواتین کے نام شامل ہیں جنہیں اس مجموعے کے مؤلف نے معتبر سمجھا ہے۔ تاہم احادیث کے مختلف مجموعوں کی تالیف کے بعد خواتین منقولین احادیث کو اس شعبے میں بڑی دسترس اور مہارت حاصل ہوگئی تھی، وہ علم حدیث پر لیکچر دیتی تھیں جہاں سامعین میں طلبہ کی اکثریت ہوتی تھی۔ (جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہوتے تھے) بہت سے مرد منقولین احادیث ان خواتین کے قدموں میں بیٹھتے تھے اور ان سے تصدیق نامے حاصل کرتے تھے۔(٦١)

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

> اسلام کے ان غیر جانبدار منقولین احادیث نے، جیسا کہ جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے ظاہر ہے، اپنے آپ کو صرف مطالعہ احادیث تک ہی محدود نہیں رکھا، نہ صرف چند شاگردوں کو علم حدیث پڑھانے پر اکتفا کیا بلکہ تعلیمی اداروں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ بطور استاد اور شاگرد جا کر بیٹھتے تھے۔ وہ تعلیمی اداروں کی ان کلاسوں میں بھی شرکت کرتے تھے جن میں مرد اور عورتیں دونوں زیر تعلیم ہوتے تھے۔ کئی لائبریریوں میں آج بھی بہت سے مسودات جواب تک محفوظ ہیں ان کے آخر میں طبع شدہ تحریریں (ترقیمات) یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ لیکچر سننے کیلئے کلاسوں میں بیٹھتے تھے اور کہیں کہیں طلبہ و طالبات کیلئے خود لیکچر بھی دیتے تھے۔(٦٢)

Marfat.com

سر تسلیم خم ہے

اس شعبے میں خواتین کے کام کی تفصیل کا اندازہ صدیقی کے جائزے کو سامنے رکھ کر ہوجاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب وتمدن کے عام زوال کے ساتھ ساتھ خواتین کے اس کام میں بھی کمی واقع ہوتی گئی اور دسویں اسلامی صدی کے دوران اس میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ اس تبدیلی کی تحقیق بڑی دلچسپ ہوگی خصوصاً اس کے مرتبہ اثرات کے حوالے سے جو دور جدید کے مسلمانوں کے ان نظریات پر پڑے جو خواتین کی تعلیم کیلئے طریقے ڈھونڈ رہے تھے۔ امریکہ کی بہت سی مسلم برادریوں کو درپیش اُس تذبذب پر بھی اس سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے: ایک طرف تو عورتوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ حصول علم ان کا مقدس فریضہ ہے، خصوصاً مذہبی فریضہ اور دوسری طرف انہیں تعلیم میں مردوں کی نسبت غیر مساوی اور بہت ہی کمتر مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ ایسا خاص طور پر غیر مخلوط اجتماعات پر زور دینے کی وجہ سے ہے، اس لئے کہ مغربی دنیا میں حصول علم (مذہبی) کا مسلمانوں میں بڑا ذریعہ مساجد ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسلام کے ابتدائی ایام میں تھا۔ مگر کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ اس قدیم عہد کے برعکس آج مساجد میں نمازوں کی ادائیگی میں خواتین کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کتابوں کے ذریعے علم حاصل کرسکتی ہیں جو عموماً غیر مسلموں کے لئے ویڈیو کیسٹس میں محفوظ کئے جاتے ہیں لیکن ایسے مواقع انہیں بہت کم ملتے ہیں اور اس کیلئے انہیں ذاتی سطح پر بہت کوشش کرنی پڑتی ہے مگر اس سے اس بات کی تلافی تو نہیں ہوجاتی کہ مردوں کو پوری امہ کی سطح پر اشاعت ونفاذ دین کے سلسلے میں جو مواقع میسر آتے ہیں وہ ان عورتوں کو نہیں آتے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر مخلوط اجتماعات جن میں مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ بٹھایا جاتا ہے فطری طور پر غلط ہے یا اس سے عورتوں کی محکومی یا غلامی کا کوئی پہلو نکلتا ہے کیونکہ میرے خیال میں تو اسے تہذیب وثقافت کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔ وہ کلچرز جن میں آج بھی غیر مخلوط اجتماعات پر زور دیا جاتا ہے، ان میں مردوں اور عورتوں کے کردار بالکل مختلف ہیں اور مختلف دائرہ حیات میں انہیں اپنی اپنی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اکثر اوقات تو عورتوں کی قلمرو یا دائرہ اختیار میں مردوں کو پھٹکنے کی بھی بہت کم اجازت دی جاتی ہے جبکہ اس کے برعکس عورتوں کو مردوں کی اقلیم تک رسائی کسی حد تک حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ (۶۳)

تحقیق کے دوران یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان کلچرز میں عورتوں کی اکثریت اپنے آپ

Marfat.com

کو مظلوم نہیں سمجھتی بلکہ مغرب کی عورت کی نسبت یہ زیادہ آرام میں ہوتی ہیں اور مغربی دنیا کی عورتوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر انہیں زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔ (٦٤) ایک بار میں نے جب اپنی بیوی کو بتایا کہ اس کے ملک کی ثقافت عورتوں پر اس لئے ظلم کرتی ہے کہ یہ سیاسی عمل میں حصہ دار نہیں بنتیں تو اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا: ''پھر کیا ہوا؟ ہمارے معاشرے کی بہت سی تقریبات میں مرد حضرات بہت کم حصہ لیتے ہیں یا بالکل نہیں لیتے، مثلاً شادی بیاہ کے انتظامات کرنا اور گھر گرہستی چلانے میں۔ اس کے علاوہ سعودی عورتوں کی یہ بھی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ میئرز یا گورنرز بنادی جائیں!''

اس میں دو آراء نہیں ہوسکتیں کہ ایک امریکی، یمن اور سعودی عرب میں مردوں اور عورتوں کے غیر مخلوط اجتماعات کو صحیح طور پر سمجھنے کے قابل نہیں ہوسکتا، اس لئے اس بات کو ان ملکوں کے معاشرے کے اندر رہ کر اور داخلیت پسندی کے ذریعے ذاتی سوچ بچار کے وسیلے ہی سے سمجھا جاسکتا ہے، امریکہ میں بیٹھ کر نہیں۔ تاہم میں اس بات پر استدلال پیش کرسکتا ہوں کہ کیا مغربی دنیا میں خواتین کیلئے پردہ کی پابندی غلط ہے۔ روایتی معاشروں کی نسبت مغربی باشندوں کی تاریخ اور ثقافت بہت مختلف ہے اور بے شک مغرب میں مردوں اور عورتوں کے علیحدہ علیحدہ یا غیر مخلوط اجتماعات کو عملاً رائج کرنا ممکن ہے۔ تاریخ و ثقافت اور عالمی نقطہ نظر جس سے یہ بات سامنے آئی، اسے یہاں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ متعلقہ ثقافتی متبادل صورتیں جو روایتی کلچرز میں موجود ہوتی ہیں وہ مغرب میں نہیں پائی جاتیں۔ داخلیت پسندی کے حوالے سے حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر امریکی مردوں اور عورتوں کے لئے غیر مخلوط اجتماعات، نسلی بنیاد پر ہوں یا مرد عورت کی علیحدہ علیحدہ جنس کی بنیاد پر جور وستم اور محکومیت ہے جو بہت سے امریکیوں کو، جن میں مسلم خاندانوں کے بچے بھی شامل ہیں، اسلام کو ایک سچا اور نمو پذیر نعم البدل تصور کرنے سے روکتی ہے۔

لیکن کیا یہی استدلال اور دلیل وحجت مسلمانوں کے روایتی لباس کی پابندی کے خلاف نہیں استعمال ہوسکتی؟ کچھ اہم اور بنیادی باتیں ہیں عدم اتفاق یا تفاوت کی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی ایسا واضح قانون یا حکم قرآن یا حدیث میں موجود نہیں کہ پوری امت مسلمہ کی سطح پر پردے کو اختیار کیا جانا چاہئے۔ فضل الرحمٰن اس معاملے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے

Marfat.com

ہوئے لکھتے ہیں:

اسی طرح پردے یا ''حرم'' کی اس رسم قدیم بازنطینی اور ملک فارس کے معاشرے میں رائج تھی یہیں سے یہ دربار بغداد تک پہنچی اور یہاں سے آخرکار یہ بہت سے اسلامی ملکوں میں مقبول ہوئی۔ درحقیقت کوئی ایسا مذہبی حکم نہیں ہے نہ ہی کم از کم قرآن میں کوئی ایسا اشارہ یا تذکرہ موجود ہے جس سے اس کی تصدیق ہوسکے۔

قرآن پاک میں صرف اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ عورتیں اپنے سینوں کو اوڑھنیوں سے ڈھانپ لیا کریں اور اپنی زینت کی نمائش نہ کریں۔ عورتوں اور مردوں کے غیر مخلوط اجتماعات کی رسم تاریخی طور پر اور بھی قدیم ہے اور اسلامی دور سے بھی پہلے کی ہے۔ عورتوں کے گھومنے پھرنے کے دائرہ کو محدود کرنے کیلئے جو بھی پابندیاں عائد کی گئیں وہ مقامی رسومات کے ذریعے اسلامی معاشرے میں بھی آہستہ آہستہ داخل ہوگئی تھیں اور پھر نفسیاتی، اقتصادی اور سماجی طور پر ان پر زیادہ سے زیادہ انحصار کیا جانے لگا تھا۔ اس میں مذہب کا عمل دخل کم تھا اور مردوں کا زیادہ۔ پردہ یا حرم رفتہ رفتہ طبقہ متوسط اور طبقہ بالا کے خاندانوں میں بڑائی اور سماجی مرتبے کی علامت بن گیا تھا اور یہ وہ خاندان تھے جن کی عورتیں گھروں سے باہر ملازمت یا کاروبار کے لئے اقتصادی یا معاشی مجبوری کے تحت نہیں نکلتی تھیں۔ گھر کے اندر اس طبقے کی عورت کی مصروفیت کو اقتصادی استحکام میں شامل سمجھ کر اسے زندگی کے بڑے دھارے میں اپنی صلاحیت کے مطابق شریک تصور کرلیا گیا تھا۔ (۶۵)

حدیث لٹریچر سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی عہد کی پہلی صدی کے دوران پردہ کی رسم بہت محدود تھی، غالباً جیسا کہ فضل رحمٰن کا بھی یہی خیال ہے، پردہ یا حرم صرف ان متمول خاندانوں تک محدود تھا جو بازنطینی اور ایرانی رسم و رواج سے متاثر تھے۔ احادیث کے نہایت مستند مجموعوں میں نبیؐ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ وہ ان خواتین کے ہاں جو اُن کی رشتہ دار نہ تھیں، سروں سے جوئیں نکلوانے جاتے تھے۔ (۶۶) ایک خاتون کا ذکر ہے جو آنحضرت ﷺ کی رشتہ دار نہ تھیں لیکن انہوں نے حضور ﷺ کی ایک ہی رکابی سے کھانا تناول کیا۔ (۶۷) اسی طرح ایک صحابیؓ کی اہلیہ نے مرد مہمانوں کو کھانا کھلایا۔ (۶۸) آنحضرت ﷺ اپنی برادری کے ایک نو بیاہتا جوڑے کے ہاں گئے اور دلہن سے اپنے خواب کا

Marfat.com

ذکر کیا جو آپؐ نے کچھ دیر پہلے نیند سے بیدار ہونے سے قبل دیکھا تھا۔ (۶۹) دو صحابہ کرامؓ ایک صحابیہؓ کے گھر گئے اور محمد ﷺ کی وفات پر اظہار رنج فرمایا۔ (۷۰) یہ ثبوت عبدالقادر اور آرلیوی کے درج ذیل نتائج تک لے جاتا ہے:

پردے (چہرے کو پردے میں چھپانا) اور حرم کا ابتدائی زمانے کے سعودی عرب میں کوئی وجود نہ تھا تاریخی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ عرب اور عربوں کے زیر نگیں آنے والے ملکوں میں، اسلام کے ابتدائی ایام میں عورتیں سماجی اور سیاسی معاملات میں اہم رول ادا کرتی تھیں۔ قرآن اور احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا کوئی مخصوص حکم نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ عورت چہرہ پر پردہ ڈالے یا عام عملی زندگی میں خلوت نشین رہے اور کوئی کام کاج نہ کرے...... (۷۱) آنحضرت ﷺ کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد (عورتوں کے پردے یا حرم کا نظام) یہ نظام پوری طرح تشکیل پا چکا تھا...... امیر اور صاحب ثروت طبقے کی عورتیں خواجہ سراؤں کی تحویل میں دے دی جاتی تھیں اور گھروں کے اندر وہ ایک خاص حصے میں بقیہ گھر سے منقطع ہو کر رہا کرتی تھیں۔ (۷۲)

قرآن پاک کی آیات ۳۳: ۳۳، ۵۳ اکثر مردوں اور عورتوں کے غیر مخلوط اجتماعات کی ہدایات اور احکام وقوانین کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس بات پر شک کرنے کی گنجائش نکلتی ہے کہ ان آیات کی تعمیل کے لئے نبیؐ کے خاندان کے افراد ان پابندیوں کو اس سختی کے ساتھ قبول کرتے تھے جس طرح آج کے دور کے قدامت پرست مسلمان خاندانوں کے لوگ۔ تیسری اسلامی صدی تک واپس لوٹ جائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں ان آیات کی تشریح کرتے وقت اسلامی دور سے پہلے کی طرح مردوں عورتوں کے بے حجابانہ ملنے جلنے کو اور مخلوط اجتماعات کو ممنوع قرار دیا۔ مگر نبیؐ کی بیویوں کے اسلامی برادری کے اجتماعات میں جانے پر پابندی عائد ہو جانے کی بات نہیں کی۔ (۷۳) جب قرآنی آیت ۳۳: ۳۳ کو حضرت عائشہؓ (نبیؐ کی زوجہ مطہرہ) کے خلاف استعمال کیا گیا کہ انہوں نے جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف فوج کی قیادت فرمائی تھی تو حضرت عائشہؓ نے الزام لگانے والوں کی تفسیر وتشریح کو قبول نہیں کیا تھا۔ (۷۴) اور اگر نبیؐ کے خاندان کی عورتوں نے ان آیات میں شامل حکم کی تعمیل میں سخت پردے کو اختیار بھی کر لیا تھا تب بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اِن آیات کا تخاطب

براہ راست نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے افراد سے ہے اور اسی سورۃ میں اور بہت سی ہدایات و احکامات ایسے ہیں جن میں تخاطب آپؐ سے نہیں۔ مثال کے طور پر آنحضرت ﷺ کو اجازت دی گئی تھی کہ آپؐ چار سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے تھے، ایک مرحلے پر آپ کو اجازت نہیں رہی تھی کہ آپؐ کسی بھی وقت انہیں طلاق دے سکیں اور یہ کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج مطہرات کو دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی اس قسم کے انتہائی ذاتی قسم کے احکامات کے بارے میں اس سورۃ میں بیان ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج ''دوسری عورتوں جیسی نہیں ہیں'' (۳۲: ۳۳) پس اگر افراد اپنے اوپر مرد اور عورت کے لحاظ سے جنسی علیحدگی نافذ کرلیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سنت رسول ﷺ پر عمل کر رہے ہیں، (یعنی وہ عمل جو نبیؐ نے کیا) جسے اگر کسی واضح قرآنی ہدایت و حکم سے منسلک نہ کیا جائے تو اسے عام قانون یا ضابطے کے طور پر نہیں لیا جاسکتا اور نہ ہی اسے عامتہ الناس پر نافذ کیا جاسکتا ہے۔ (۷۵)

یہ بالکل سچ ہے کہ اسلام بلا امتیاز صنف، مردوں عورتوں کے میل جول یا باہمی اختلاط کی اجازت نہیں دیتا لیکن پردے یا حرم کا الٹ اختلاط باہمی بھی نہیں ہے۔ بہت سے نومسلم دیکھتے ہیں کہ کسی لیکچر کے سننے کیلئے خاندان کے لوگ جمع ہوتے ہیں سماجی و معاشرتی جلوس اور تقریبات میں اکٹھے ہوتے ہیں مگر یہ وہ مقامات تو نہیں ہوتے جنہیں عیاشی و بدچلنی کے مقامات تصور کیا جائے۔ بیشک مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں کئی خاندان نمازوں کے دوران اکٹھے بیٹھتے ہیں اور جونہی نماز کھڑے ہونے کا اعلان ہوتا ہے مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ صفوں میں چلے جاتے ہیں اور بعد از نماز پر پھر اپنی پہلی والی جگہوں پر آجاتے ہیں۔ قرآن میں بہت سی اخلاقی نصیحتیں کی گئی ہیں، کئی روایات کا ذکر ہے، شائستہ و مہذب لباس پہننے کی تلقین کی گئی ہے اور زندگی گزارنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ کم از کم نظری طور پر......زنا کی سخت سزا کا ذکر ہے، اخلاقی پستی کی حوصلہ شکنی کیلئے یہ کافی ہے۔ خصوصاً مذہبی اجتماعات میں۔ یہ اس بات کی ضمانت تو نہیں ہے کہ اس سے ان خرابیوں کا سدباب ہو جائے گا لیکن کئی دوسری قسم کی جنسی اور شہوانی خرابیاں ایسی ہیں جو تنہائی اور خلوت میں برانگیختہ ہوتی ہیں۔

اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنسی کج روی ہی واحد یا سب سے بڑا خطرہ نہیں جو معاشرے کو درپیش ہے۔ علم و دانش کے بڑے اور اہم ذریعہ کو ضائع کرنے کے خطرات اس

Marfat.com

بات میں پوشیدہ ہیں کہ عورتوں کو حصول علم کے خاطر خواہ مواقع فراہم نہ کئے جائیں، انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا ماحول مہیا نہ کیا جائے۔ وہ اپنے حقوق سے لاعلم ہوں اور مردان کے حقوق کا استحصال کر رہے ہوں۔ دراصل یہ وہ سنگین مسائل ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ایک نومسلم خاتون نے مجھے بتایا کہ ''مغربی عورتوں نے طویل اور سخت جدوجہد کی ہے تاکہ اپنی زندگیوں پر کچھ کنٹرول حاصل کر سکیں اور میں اپنی فلاح و بہتری کو مردوں کی فطرت اور فیصلے پر تو نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ مرد جو لباس کی پابندی اور پردے کے درمیان موجود دوسرے بڑے تفاوت تک لے آتے ہیں جہاں تک شائستہ و مہذب لباس کا تعلق ہے، ان دنوں یہ کافی حد تک ایک عورت کی اپنی ذات پر منحصر ہے لیکن میں یہ بات بہت سختی سے کہہ سکتا ہوں کہ لباس کی پابندی کو عورتوں کے مذہبی اجتماعات اور تقاریب میں پوری طرح شرکت کرنے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔ اس سے اس امکان میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ بے شک ایک مسلمان عورت کا لباس جنسیت کو تو ظاہر کرتا ہے مگر شہوت انگیز تو نہیں ہوتا۔ یہ زیادہ اس کی جسمانی یا ظاہری خوبصورتی پر زور دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے ''اس کی زینت'' ......اور اس کی ذاتی اور فطری قوت پر زور دیتا ہے باہمی عمل یا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا معاملہ عورت کو مردوں کے زیادہ قریب لا کھڑا کر دیتا ہے۔

عورت کی شکایت

''لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے۔'' (۴:۱۲۷)

اور وہ لوگ اب تک یہ پوچھتے رہتے ہیں۔ پوری تاریخ میں کہیں بھی مذہب عورتوں پر مشفق و مہربان نہیں رہا۔ اس لئے کہ مردوں کی بالادستی نے ثقافتی تعصّبات پیدا کر رکھے تھے مذہبی اصولوں کے خلاف نفرت پھیلا رکھی تھی، قانون اور قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر کے ذریعے عورتوں سے ایک خاص تعصب برتا جاتا تھا۔ بیسویں صدی ان کے بارے میں پوچھنے پر مجبور تھی اس لئے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا، خدا عورت کے کردار اور مقام کے بارے میں اس قدر

Marfat.com

پست حکم کیسے دے سکتا تھا؟ مغربی مسلمانوں نے اسلامی کلچرز سے جن میں اسلام محفوظ تھا بڑی سختی کے ساتھ اس مسئلے کو علیحدہ کر کے قرآن میں اور اسلام میں عورتوں کے بارے میں اس تصویر اور نقطہ نظر کی تلاش شروع کر دی ہے جسے انہوں نے ماضی میں اپنایا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مرد اور عورتیں ایک جیسے نہیں ہیں اور دیانتداری کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو ہر شخص اسی قرآنی حکم تک پہنچتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرد اور عورت میں سے کوئی ایک دوسرے سے فطری طور پر زیادہ ذہین یا متقی و پرہیز گار ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی شخصیات ایک دوسرے کے علم و ہنر میں توازن پیدا کرتیں اور اضافہ کرتی ہیں۔ اور کسی معاشرے کیلئے وہ وسعت پیدا کرتی ہیں جس سے وہ مستقبل میں دوچار ہو سکتا ہے۔

یہ بات یکساں طور پر سچ ہے۔ اور اسے قرآن بھی قبول کرتا ہے اور احادیث نبویؐ بھی...... اور وہ بات کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے کردار میں کوئی شے ایسی ہوتی ہے جو مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں اکثر لیڈری چمکانے اور اپنی بالادستی قائم کرنے پر اکساتی ہے۔ مگر اس حقیقت کے یہ معنی بھی نہیں کہ عورتیں لیڈری کی اہل تو نہیں ہوتیں، حصول علم کے لائق نہیں ہوتیں یا وہ اس میں حصہ نہیں لے سکتیں اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس انجام کار تک پہنچنے کے لیے ذرائع و وسائل تو دونوں کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ ایک بات جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ معاشرے کو عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں چوکنا رہنا چاہیئے، اس لئے قرآن پاک میں جگہ جگہ ان احکامات کو دہرایا گیا ہے اور عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف تنبیہ کی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت ۵۸:۱ میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

> ''اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کئے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔'' (۵۸:۱)

اس آیت میں ساتویں صدی کے سعودی عرب کے مردوں کی طرف سے ہونے والی ایک ناانصافی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اگلی آیت کی عیاں ثقافتی خصوصیت کی وجہ سے اسے ایک

Marfat.com

مسلمہ انتباہ کے طور پر پڑھا جائے، جس پر ہمیشہ مسلم امہ نے عمل کرنا تھا۔ دور جدید کے مسلمانوں کی طرف سے اسلام کی جو حقیقت پسندانہ تشریح کی گئی ہے وہ بیسویں صدی کی خواتین کے ضابطے سے اتفاق نہیں کرے گی اور نہ ہی یہ تشریح ابتدائی دور کے مسلمانوں کے علم وفضل پر مبنی عورتوں کے بارے میں نظریات وتصورات سے مطابقت رکھے گی۔ ایک بار پھر، جیسا کہ بہت سے مسائل پر، مسلم امہ اپنے آپ کو اپنی جدوجہد میں یہ حساب لگانے کیلئے کہ جدید دور میں مسلمان مرد اور عورت سے کیا مراد ہے ''امت وسطیٰ'' کے طور پر تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

قانون اور ریاست

اس وقت امریکی مسلم برادری میں موضوعات برائے بحث وتمحیص ہیں: اتحاد، اخوت و بھائی چارہ، معمر مسلمان، مسلم خاندان، شادی بیاہ اور مردوں عورتوں کا دائرہ کار۔

اس بات کی تصدیق امریکی اور کینیڈین مسلم اخبارات ورسائل سے ہو جائے گی۔ چونکہ امریکی مسلمان قانون سازی کے عمل کو متاثر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لئے حالیہ بحث کا دائرہ دیوانی، فوجداری اور عالمی قانون تک محدود رہے گا اور منافقانہ ہوگا۔ اسلام نے سود (ربا) (٦٧) کو حرام قرار دیا ہے اس لئے مغربی دنیا میں اسلامی بینکاری کے شعبے میں اس کے نعم البدل کے طور پر کوئی اور طریقہ وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن آپ بڑی آسانی سے یہ تصور کر سکتے ہیں کہ نظریاتی طور پر اور عملاً دونوں طرح سے اس ضمن میں بے شمار مسائل ہیں تمام مسلم ماہرین اقتصادیات اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح معنوں میں کوئی موزوں نعم البدل ابھی تک اپنایا نہیں جاسکا۔ (٧٧) مغربی دنیا میں مسلمانوں کی توجہ چند ایسے مسائل کی جانب مبذول کرائی گئی ہے جن کا فوری طور پر ان کی زندگیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے قیام، جہاد کے لئے لاتعداد مختلف قسم کے بلاوے اور دعوت، سلمان رشدی کے خلاف امام خمینی کا فتویٰ قتل اور ایسے ہی دوسرے واقعات ایسے موضوعات ہیں جنہوں نے مغرب میں سلطنت و حکمرانی کے بارے میں اسلام کی پوزیشن، اقلیتوں، جنگوں اور ارتداد کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کو جنم دیا ہے۔ مغربی دنیا میں بسنے والے مسلمان کو اکثر یہ صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ مرد یا

Marfat.com

عورت جب ایک غیر مسلم معاشرے اور کلچر میں اسلام کے ترجمان بنتے ہیں تو مائیکروفون، ٹی وی کیمرے ایک عام مسلمان کی تاک میں لگ جاتے ہیں اور اس سے عالمی واقعات کو سلجھانے اور ان کے بارے میں تفصیلی اور وضاحتی بیان بہت تیزی اور سرعت کے ساتھ اگلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاد

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کے خبر لینے کیلئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (۹:۵)

مسلمان مقرر نے یقین دلایا ہے کہ

''ایک اسلامی ریاست صرف غیر مسلموں کے نظام ہائے سیاسی پر ہی حملہ آور نہیں ہوتی اس لئے کہ اسے بہت سخت اصولوں کی پابندی کرنی چاہیئے۔ کسی غیر مسلم ملک پر حملہ آور ہونے سے قبل اسے چاہیئے کہ ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے اپنے سفارتکار اور ایلچی بھیج کر اس سلطنت اور اس کے لوگوں کو اسلام یا اسلامی حکومت کو تسلیم کرلینے کی دعوت دے۔ اگر یہ دعوت حتمی طور پر ٹھکرا دی جائے تو صرف اور صرف اس اسلامی حکومت ایک غیر حکومت کے خلاف اعلان جنگ کرسکتی ہے۔''

''مگر اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ مجھے آپ کی تبلیغ سننی چاہیئے ورنہ آپ میرے منہ پر گھونسہ ماردیں گے۔'' یہ الفاظ یونیورسٹی میں موجود سامعین میں سے ایک خاتون کے تھے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں یہ جاننا چاہوں گی کہ کیا اسلامی حکومتیں بھی مساوی طور پر اس

Marfat.com

بات کی پابند ہیں کہ اسلامی قانون کے تحت وہ بھی دوسرے مذاہب کے مشنریوں کو اپنے ملک میں قبول کریں اور انہیں مذہبی تبلیغ کی اجازت دیں؟''

توحید پرست یا ایک خدا کے ماننے والوں کا تو صرف ایک ہی اعتقاد ہے کہ سارے انسانی ڈرامے پر ایک خدائے واحد کا کنٹرول ہے۔ یہ اللہ کے مقررہ قوانین کے ذریعے ہو جو پورے نظام میں پیوست ہیں، یا براہ راست اور ہنر مندی و سلیقہ مندی کے ذریعے، یا کسی طور پر ان دونوں کے امتزاج سے۔ مذہبی ذہن رکھنے والے لوگ خوشحالی کو اللہ کی عطا کردہ نعمت یا انعام تصور کرتے ہیں اور بدقسمتی کا شکار ہو جائیں تو سمجھتے ہیں کہ خدا ان سے ناراض ہے۔ بدبختی یا بدقسمتی کسی قوم کے اجتماعی گناہوں کی پاداش کے طور پر آتی ہے اور اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ مذہب کے پاکیزہ سرچشموں کی طرف رجوع کیا جائے۔ (جن میں سے سب سے بڑا سرچشمہ قرآن ہے)۔ قرآن میں بار بار یہ یاددہانی کرائی گئی ہے کہ اس قسم کی تشکیل غلط اور نادرست بھی ہے اور مسخ شدہ اور دھندلی بھی۔ دنیا کی کامیابی و کامرانی میں کئی بڑے اہم امتحانات درپیش ہوتے ہیں اور ان میں صبر و تحمل سے تکلیفیں برداشت کرنے اور مصائب اٹھانے کے بدلے میں بڑا انعام ملتا ہے۔ پھر بھی نبیؐ کی حیات طیبہ میں آخر کار فتح آپؐ کے مشن کی سچائی، فرض شناسی اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے اخلاص کی وجہ سے ہوئی۔ آپؐ کی وفات کے فوراً بعد امت مسلمہ نے اپنے آپ کو جنگ میں گھرا پایا، پہلے مرتد قبائل کے ساتھ اور پھر رومی اور ایرانی سلطنتوں کے ساتھ پہلے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ کی صالح اور خدا پرست قیادت میں ان کی قابل ذکر اور یکے بعد دیگرے فتوحات اور کامیابیوں نے ان کے اس یقین کو اور راسخ اور مضبوط بنا دیا تھا کہ انہیں ہمیشہ اللہ کی نصرت حاصل تھی۔ اور زمین پر خدا کی سچی حکمرانی قائم کرنے کیلئے وہ تو اللہ کے مقرر کردہ معاون و مددگار تھے۔ ان بڑی فتوحات میں شامل تمام مسلمان نہیں بلکہ یقیناً ان کی اکثریت بھی ایسی نہیں تھی جن کے عزائم خالص و پاکیزہ اور غیر مادی ہوں۔ مال غنیمت جو جنگ میں ہاتھ لگتا تھا ہمیشہ ایک بہت بڑا لالچ ثابت ہوتا تھا، اور کئی موقعوں پر قرآن اور محمد ﷺ نے کسی اچھے اور مقدس مقصد کیلئے دی جانے والی قربانی کا صلہ و انعام، روحانی انعام و اکرام کو قرار دیا۔

Marfat.com

> ''(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔'' (۴:۷۴)

> ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو، پس خوشیاں مناؤ اپنے سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔'' (۹:۱۱۱)

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً ایک نسل گزر جانے پر، اسلامی سلطنت کی سرحدیں مغربی جانب پھیل کر شمالی افریقہ سے آگے بحیرہ اوقیانوس تک جا پہنچی تھیں اور مشرق میں ایران سے گزر کر چین تک۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے پر مغلوں، ترکوں اور صلیبی جنگیں لڑنے والوں کے ہاتھوں مزاحمت ہوئی۔ پھر بھی ان میں سے پہلی دو نے تو بالآخر اسلام قبول کر لیا تھا اور عثمانیوں نے نصرانیوں کی زیادہ تر فتوحات کی نفی کرتے ہوئے سترھویں صدی میں ویانا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک ہزار سالہ ناگزیر فتوحات کا سلسلہ جو نبیؐ کے عہد تک جاتا ہے اس اعلیٰ اعتماد اور کلاسیکی مسلم مذہبی و سیاسی فکر کی یک رخی کی وضاحت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ماضی کے مسلم سکالرز نے دنیا کو دو علیحدہ علیحدہ امتیازی قلمروؤں میں تقسیم کر دیا تھا: دارالاسلام (اسلام کا گھر) اور دارالحرب (جنگ و جدل کا گھر) جسے بوقت ضرورت فتح کر کے مسلم قلمرو میں شامل کیا جا سکتا تھا حالانکہ کم از کم ایک نظریے کے طور پر غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ ایک مستقل تصادم کی صورت پیدا ہوئی تھی، امن و امان کے طویل وقفے اور تجارتی و ثقافتی لین دین، اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان عمل پذیر ہوتے تھے۔ اسلام قبول کرنا اصل مقصد نہ تھا، وہ اسے اللہ کی غلامی میں داخل ہونا سمجھتے تھے، اللہ کے قانون کی محکومی میں آنا تصور کرتے تھے۔ دراصل مسلم

حکمران عموماً جلدی میں نہ تھے کہ لوگوں کو فتح و تسخیر کے بعد مسلمان ہو جانے کی ترغیب دیتے، اس لئے نہیں کہ اسلامی قانون راستے کی رکاوٹ بنتا تھا بلکہ اس اقتصادی اور مالی منفعت کی وجہ سے جو وہ اکثر مسلمان رعایا کی نسبت غیر مسلم شہریوں پر زیادہ ٹیکس لگا کر حاصل کرتے تھے۔ مجموعی طور پر قبول اسلام کا عمل تسلسل کے ساتھ مگر رفتہ رفتہ جاری رہا۔ اور اسلامی سلطنت کے بہت سے حصوں میں مسلمان سینکڑوں برس تک اقلیت میں رہے۔ مغربی علماء نے آخر کار اس مذہبی انتہاء پسند عرب گھوڑا سوار کی گھسی پٹی تصویر کشی ترک کر دی ہے، جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن دکھایا جاتا تھا، جو یہ اعلان کرتا تھا کہ اسلام قبول کر لو یا موت کیلئے تیار ہو جاؤ۔ (۷۸) اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مذہبی تعصب ضرور موجود تھا لیکن قبل از اسلام دور میں، اس بنیاد پر اسلامی تہذیب و تمدن کا مقابلہ بہت سی دوسری تہذیبوں کے ساتھ۔ بڑی جانبداری اور تعصب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خصوصاً نصرانی یورپی تہذیب کے ساتھ اور عدم رواداری اور تنگ خیالی نے بہت کم جبر و دباؤ سے مسلمان بنانے کی صورت اختیار کی۔

اسلامی دنیا آج بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش میں ہے تاکہ یورپی نو آبادیاتی نظام کے غیر متوقع استحصال اور تذلیل سے اور تیسری دنیا میں شمار کئے جانے کے عمل سے باہر نکل سکے اور یہودی ریاست کی فلسطین کو واپسی ہو سکے ایک طویل عرصے سے اسلام کی اپنے دو بڑے پیش رو مذاہب پر برتری کے زندہ ثبوت کو پیش کیا جا سکے، یعنی یہودیت اور نصرانیت پر۔ جہاد (اللہ کی راہ میں جدوجہد) کے لئے مختلف النوع ذرائع سے آنے والی مسلسل صداؤں میں مایوسی اور بددلی ہر شب نئی نئی تدابیر کے درمیان آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑتی ہے۔ جہاد کے لئے ایسی دعوتی صدائیں تقریباً ہمیشہ مغرب یا حکومت کے خلاف دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان افراد کے خلاف جنہیں مغرب کے ''پٹھو'' تصور کیا جاتا ہے کبھی کبھی فریقین میں تصادم کے دوران دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف جہاد کی دعوت دی جاتی ہے۔ مغربی سامعین خوف و ڈر کے مارے یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، انہیں اپنی سفاکانہ اور انتہائی ظالمانہ کارروائیاں یاد آتی ہیں اور کچھ مقامات پر تو اب بھی خدا کے نام پر ایسی کارروائیاں جاری ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب یہ توقع رکھنے لگتا ہے کہ چرچ اور ریاست کی علیحدگی کبھی ختم نہیں ہوگی۔

مذہبی فوج کشی اور قدامت پرستی مغربی سامع کو ایک عجیب قسم کے ''مقدس'' تشدد اور

Marfat.com

سر تسلیم خم ہے

جارحیت کی جانب کھینچ لاتی ہے، جو غم و غصے اور اشتعال انگیز نعرے ''امریکہ مردہ باد''! ''اسرائیل مردہ باد''! ''برطانیہ مردہ باد''! ''جارج بش مردہ باد''! ''موت'' ''موت'' اور ''موت''! ۔ کو جنم دیتی ہے۔ سننے والوں کیلئے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ یہ نعرہ بازی ان لوگوں کی طرف سے کی جارہی ہے جنہوں نے ماضی کی مغربی استعماریت اور نو آبادیاتی نظام اور نئے نو آبادیاتی نظام کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ بہت سے تو اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر وہ باخبر بھی ہوتے تو وہ گہرا دماغی خلل جسے یہ جنم دیتے ہیں وہ شاید کسی طرح اس ماضی کے لئے کوئی جواز پیش کرسکتا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ہم انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ خدا کے نام پر ہمیں تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں، ہمیں اپنا محکوم بنانا چاہتے ہیں'' وہ اسلام جسے مغرب نے دیکھا ہے اور جو ٹی وی سکرین پر پیش کیا جاتا ہے اس کا امن وسلامتی اور رحم دلی و ہمدردی سے برائے نام تعلق ہے۔ اس مرد یا عورت کیلئے ایسا اسلام موت کی مانند نظر آتا ہے اور سنائی دیتا ہے۔

ہمیں مغربی ذرائع ابلاغ کا جزوی طور پر ممنون ہونا چاہئے اور زیادہ ممنون اس اصطلاح کا ہونا چاہئے جو ان دنوں مسلمانوں کی اکثریت استعمال کرتی ہے۔ ''جہاد'' کا تقریباً تقریباً ایک ہی انگریزی ترجمہ کیا جاتا ہے ''مقدس جنگ'' یا ''مذہبی جنگ۔'' زمانہ قدیم کے عربوں کے لئے اور موجودہ دور کی لغات میں ملنے والے جہاد کے اصل معنی، جنگ و جدل یا قتل و غارت نہیں ہیں۔ عربی لفظ ''قتال'' سے اس کا اصل مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ فعل ''جاہد'' ہے۔ جہاد جس کا فعلی اسم بنتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کوشش اور جدوجہد کرنا، تھک کر چور ہو جانا، سخت کوشش کرنا، کسی شے کیلئے تگ و دو کرنا، اپنی قوت کا بھرپور استعمال کرنا۔ مثال کے طور پر اجتہاد جس سے یہ مشتق ہے کے معنی ہیں کوشش یا محنت و جانفشانی۔ قرآن میں فعل جاہد کس طرح استعمال ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ خصوصاً ان آیات میں جو جنگ و جدل کے آغاز سے قبل مکہ میں نازل ہوئی تھیں تو اس کی زیادہ واضح تشریح سامنے آتی ہے:

> ''جو لوگ ہماری خاطر معاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔'' (۲۹:۶۹)

''جو شخص بھی معاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کیلئے کرے گا، اللہ یقیناً دنیا جہاں والوں سے بے نیاز ہے'' (۶:۲۹)

''ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کرو'' (۸:۲۹)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔'' (۲۲:۷۸)

''پس اے نبیؐ کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔'' (۲۵: ۵۲) (۷۹)

آخری آیت اس سورۃ میں آئی ہے جہاں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جب کفار سے کوئی جھگڑا یا تنازع کھڑا ہو جائے تو قرآن سے مدد لو، رہنمائی حاصل کرو۔

بہت سی احادیث جہاد کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ عموماً ان میں جنگ و جدل کے کئی ایک نعم البدل بتائے گئے ہیں۔ وہ حدیث نبویؐ جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ''حج تمام جہادوں میں سے سب سے افضل ہے'' منفرد ہے (۸۰) آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک سے منسوب قول اس نظریے کی وسعت کی تشریح نہایت خوبصورت انداز میں کرتا ہے۔ یہ صحابی رسولؐ جنگ سے اپنی فوجوں کو واپس لانے کے بعد، اپنے ان سپاہیوں سے، جو قریب تھے یوں مخاطب ہوئے: ''اب ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف جاتے ہیں'' جب سپاہیوں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی مزید مشکل دفاعی فریضہ درپیش تھا۔ صحابی رسولؐ نے جواب دیا کہ ''جہاد کبیر'' سے ان کی مراد ''جہاد النفس'' تھا (اپنے آپ سے جنگ) (۸۱) یہاں اس تصور کا ایک واضح خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں کسی فرد کی دنیاوی زندگی کو اپنی ذات کے خلاف ایک مسلسل جنگ قرار دیا گیا ہے۔

ہجرت مدینہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان موجود عبوری تعلقات کی نہایت نازک

Marfat.com

مثال پیش کرتی ہے۔ صبر و تحمل کے ساتھ کفار کے ہاتھوں تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد اب مسلمان مشتعل ہونے والے تھے۔ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ فریقین اس کے مہلک نتائج سے باخبر تھے۔ کفار نے فیصلہ کیا کہ مدینے پہنچنے سے پہلے ہی وہ راستے میں آنحضرت ﷺ کو ختم کر دیں۔ (۸۲) مسلمانوں کے لئے قطعی اور فیصلہ کن جہاد کا صحیح اندازہ کفار کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں ہوتا ہے جسے قتال کا نام دیا جاتا ہے۔ فوری مسئلہ جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ نئے نظریے کی خاطر ان مسلمانوں کو جن میں ابھی عقیدے کی پختگی نہیں آئی تھی کیسے اس بات پر ابھارا جائے کہ وہ اپنی جانیں تک خطرے میں ڈال کر جہاد کیلئے تیار ہو جائیں، جب کہ صورتحال بھی یہ ہو کہ حالات کا رُخ ان کے خلاف ہو اور مال غنیمت ملنے کا بھی یقین نہ دلایا گیا ہو۔ اور اسلامی عہد سے پہلے کے عرب عموماً ان حالات میں لڑنے پر رضامند نہ ہوتے تھے جب ان کی عزت و آبرو یا مال و دولت خطرے میں نہ ہوتی۔

> ''تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔'' (۲:۲۱۶)

> ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔'' (۴:۷۵)

> ''اے نبیؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔'' (۸:۶۵)

> ''جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ

Marfat.com

ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا ''اس سخت گرمی میں جہاد کیلئے نہ نکلو'' ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔'' (۹:۸۱)

''مگر جب ایک محکم سورۃ نازل کردی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔'' (۴۷:۲۰)(۸۳)

قرآن اہل ایمان سے جنگ کا تقاضا تو کرتا ہے مگر آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ جنگ و جدل میں پابندیاں کیا کیا عائد کرتا ہے:

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (۲:۱۹۰-۱۹۲)

''تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔'' (۲: ۱۹۳) ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے'' (۲:۲۵۶)

''ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے

اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو، ان پر ہاتھ اٹھانے کیلئے ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے۔" (۹۱:۴)

"اور اے نبیؐ اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" (۶۱:۸)

"اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے۔" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں، گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں۔" (۳۹:۲۲_۴۰)

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لڑائی صرف اپنے دفاع کیلئے لڑنے کی اجازت ہے یا مظلوموں کی مدد کیلئے، ان مظلوموں کی جو اس قدر کمزور ہوں کہ اپنی حفاظت نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بات اہم ہے کہ ان میں سے تین کا ذکر دوسری سورۃ میں ہے جس کے متعلق بہت سے سکالرز کا خیال یہ ہے کہ قرآن پاک کے اہم موضوعات کا خلاصہ اس میں پیش ہوا ہے۔ آخری حوالہ قرآن کے جنگ کے بارے میں رویے کو بہترین طریقے سے بیان کرسکتا ہے:
اس میں چوکس، محتاج رہنے اور حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن میں اس بارے میں بہت کم حمایت ملتی ہے کہ غیر اسلامی ریاستوں کو اسلامی حکومت کو تسلیم کر لینے پر بذریعہ طاقت مجبور کیا جائے۔ اس حصے کا عنوان بننے والی آیت کو کبھی کبھی حوالہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن سیاق و سباق پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت ان کے خلاف

Marfat.com

نازل ہوئی ہے جو غداری کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے معاہدے توڑ دیتے ہیں۔ پچھلے آیت اس طرح ہے:۔

''بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔'' (۹:۴)

''تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔'' (۹:۷) (۴۷)

ماضی میں مسلم سکالرز نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کردیا تھا جس سے موجودہ حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے عہد میں کوئی نہ کوئی اہم اور قابل ذکر قوت ایسی صورت حال سے دوچار تھی کہ یا تو فتح کرلو یا مفتوح بن جاؤ۔ (۵۸)

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورتحال تبدیل ہورہی ہے لیکن غالباً ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ لفظ ''فتح کرلو'' کو تبدیل کر کے ''بالادستی قائم کرلو'' یا ''کنٹرول کرلو'' کو عام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بیداری کے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں جس میں ان دو میں سے کوئی سا تصور یا نقطہ نظر ہمیں اچھا نہیں لے گا اور یہ جنگ کے بارے میں قرآنی تصور یا ضابطہ اخلاق کے عین مطابق ہے۔

ایمان اور قوت

''مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہیں کہ امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کام کریں، محنت کریں اور اگر ضرورت پڑے تو یہاں اسلامی ریاست کے قیام کیلئے جدوجہد کریں۔''

Marfat.com

یہ الفاظ مڈل ایسٹرن یونیورسٹی کے ڈین کے تھے، جو یہ جانتا تھا کہ روایت اور علم و فضل دونوں اس کی حمایت میں تھے۔

''کسی ریاست کو کون سی شے اسلامی ریاست بناتی ہے اس بارے میں میرا نقطہ نظر آپ کے تصور کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مثال کے طور پر کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا ملک ایک اسلامی ریاست ہے؟''

اس نے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے کہا:

''بیشک یہ ایک مکمل اسلامی ریاست نہیں ہے لیکن ہمیں اپنے عقیدے کے مطابق اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہے اور شریعت کا زیادہ حصہ نافذ کیا جاچکا ہے۔''

''لیکن جمہوریت میں تو اکثریت کی مرضی چلتی ہے جبکہ قرآن وسنت کے مطابق اسلامی ریاست میں حاکم اعلیٰ کو مانا جاتا ہے!''

''ہوسکتا ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں اکثریت کے خیال میں حاکم اعلیٰ خدا کو مانا جاتا ہو اور لوگوں کا ایمان یہ ہو کہ حاکمیت اعلیٰ خدا کی ہے اور محمد ﷺ اس کے نبیؐ ہیں وہاں یہ دونوں جمع نہ ہوسکیں؟'' اگر اکثریت کا یہ نظریہ نہ ہو تو کسی ملک کو اسلامی ریاست یا کسی مذہب کو ریاست کا مذہب قرار دینے سے کیا مقصد حاصل ہوسکتا ہے؟''

''جس چیز کی وکالت تم کر رہے ہو وہ تو سیکولرزم (لادینیت) ہے!''

معاصر مسلم سیاسی مسائل پر استدلال پیش کرنے کیلئے ہماری گفتگو میں کئی باتیں ایسی تھیں جن پر ہم نے بحث کی،: مثلاً ایک اسلامی ریاست کے قیام کا فریضہ، ایک اسلامی ریاست حقیقت میں ہے کیا، اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی تشریح اور اسلام، جمہوریت اور سیکولر

Marfat.com

زم (لادینیت) کے درمیان رشتہ وتعلق کیا ہے اور یہ کہ ان سب پر الٹ سمت میں ترتیب کے ساتھ غور وفکر ہونا چاہئے۔

اسلام اور سیکولرزم میں مصالحت نہیں ہوسکتی۔ سیکولرزم کی تعریف یہ ہے کہ یہ دین سے لاتعلق ہوتا ہے یا یہ کہ اس میں سے مذہب کو خارج کردیا جاتا ہے۔ اس میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد غیر مذہبی ہونی چاہئے اور یہ اصول ایک مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن سیکولرزم اور جمہوریت ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ اور جمہوریت اسلام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ جمہوریت میں عوام کی حکمرانی ہوتی ہے یا اکثریت کی حکمرانی۔ بہت سے مسلم مفکرین کو جمہوریت اور شوریٰ (باہمی مشاورت) کے اصولوں کے نظریے میں قریبی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ جمہوریت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکومت کی پالیسی وضع کرتے وقت اس میں سے مذہبی عقائد کو نکال دیا جائے۔ دور حاضر کی جمہوری اقوام کے قانونی اور سیاسی عقائد ونظریات اخلاقی نظریات کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں جن میں فوقیت مذہبی بنیاد کو دی جاتی ہے۔ اور جمہوریت میں مذہبی گروہوں کو اپنے مقاصد کیلئے حمایتی بنانے کی ممانعت نہیں ہوتی: امریکہ میں اسقاط حمل کے خلاف چلنے والی تحریک، پیٹ رابرٹسن کا صدارتی انتخاب لڑنا اور امریکی رومن کیتھولک چرچ کی طرف سے خلیجی جنگ کے خلاف کیا جانے والا حالیہ احتجاج سبھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی لئے لفظ ''سیکولر'' کو جب زیادہ تر مغربی جمہوریتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اسے یہ نام دینا غلط سمجھا جاتا ہے۔

ایک جمہوری نظام میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر فرد کے سیاسی نظریات کو یکساں اہمیت دی جائے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تمام شہری ایک اقلیتی نقطہ نظر کے پابند بنا کر نہ رکھے جائیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جو بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ ہو، اسے اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو کسی دوسرے نظام حکومت کے مقابلے میں چیلنج نہیں کرنا چاہئے۔ لوگوں کی اجتماعی مرضی خدا کی مرضی ومنشاء سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں اس کا دارومدار عوام کی سمجھ بوجھ، عزم وارادے اور ان کے منتخب نمائندوں کی اپنے عقیدے سے وابستگی پر منحصر ہے۔

کثیرالوجود معاشرے میں، جمہوریت، مذہبی اور سیاسی آزادی کی حفاظت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ مدد تو ضرور کرتی ہے مگر اس بات کی ضمانت مہیا نہیں کرتی کہ جو نقطہ نظر حاوی

ہوگا قدرتی طور پر اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر امریکہ میں بسنے والے مسلمان شادی بیاہ کے قوانین کے پابند ہیں اس معاملے میں عیسائیت کی جانب ان کی رغبت عقائد سے متصادم ہوتی ہے۔ تاہم انہیں یہ موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا معاملہ پورے استدلال کے ساتھ پیش کرکے حکومتی پالیسی میں تبدیلی لے آئیں۔ اسی طرح سے تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلم حکومتیں مذہبی معاملات میں کافی حد تک قوت برداشت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ دوسرے نظاموں سے ان کا مقابلہ کرکے دیکھا جائے۔ تاہم غیر مسلم افراد کو گروہی صورت میں کبھی کبھی مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی نہ ہی وہ اپنے عقائد کے مطابق اسلامی قانون کی رو سے نئی عبادت گاہیں تعمیر کرسکتے تھے۔ (۸۶) عیسائیوں کے لئے یہ دونوں مذہبی فرائض میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ جس بات کو کوئی اقلیت اپنا حق تصور کرتی ہو اسے ناراض کرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ لیکن یہ دور جدید کی عوامی جمہوریت ہے جو آج افراد کے حقوق کی حفاظت کی پوری کوشش کرتی ہے۔ درحقیقت کسی بہتر متبادل صورت کے بارے میں سوچنا بہت مشکل لگتا ہے۔ بیشک مسلمان خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغرب میں انہیں کئی طرح سے اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی جس قدر آزادی اب حاصل ہے وہ انہیں ان ممالک میں بھی حاصل نہیں تھی جہاں سے وہ ہجرت کرکے آئیں ہیں۔

میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ مغربی عوامی جمہوریت کو ایک اسلامی ریاست کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے یا مغرب میں مسلمان برادری کی تعداد میں یوں ہی اضافہ ہوتا رہا تو یہ قلب ماہیت خود بخود عمل میں آجائے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کسی بھی ایسے عملی نمونے کے بارے میں نہیں جانتا جو اس وقت موجود ہو، نہ ہی کسی ایسی اسلامی ریاست کی تعریف سے پوری طرح واقف ہوں جو مسلمانوں کی اکثریت کو قابل قبول ہو۔ سعودی عرب کے شہری عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حکومت اسلامی ہے یا کم ازکم اسلامی قانون کے لحاظ سے جائز اور صحیح ہے لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو جزیرہ نما سعودی عرب سے باہر کوئی مسلمان اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسلامی جمہوریہ ایران کی ابتدائی منزل امام خمینی کے دیئے گئے نقشے کے مطابق ''فقہاء کی حکمرانی'' تک رسائی تھی (۸۷) لیکن اس کی حمایت کرنے والوں کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایران ابھی اس منزل کی راہ میں ہے اور ایران میں طرز حکومت

Marfat.com

ابھی تک ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ ایسا ممکن ہے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ تمام تر شیعہ اہل فکر وعقیدہ لوگوں کی توجیہہ وتاویل کے مطابق ہے اس کے بعد پہلا اور آخری نام پاکستان کا آتا ہے جو اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا تاہم پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس میں اس کی آزادی کے بعد زیادہ عرصے تک مختلف قسم کی آمریت مسلط رہی، اور اسے سعودی عرب جیسا دعویٰ نہیں کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہے اور سیاسی عمل میں اسلام کو جو کردار ادا کرنا چاہئے اس بارے میں پاکستانی لیڈروں اور دانشوروں کے درمیان ایک طویل تنازع مسلسل چلا آرہا ہے۔ (۸۸)

جدید دور میں حکومت کے مثالی نمونوں کی کمی کے برعکس، اسلامی ریاست کے تصور پر حال ہی میں مسلم اہل قلم نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں جس میں ایک سرے پر حکومت الٰہیہ یا مذہبی حکومت کے ساتھ ساتھ نظریاتی حکومت ہے تو دوسرے سرے پر جمہوریت۔ (۸۹) اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کو خدا کی مرضی ومنشاء کے مطابق ہونا چاہئے لیکن اس سے آگے طرز حکومت کی تشریح مختلف ہے اور نظریاتی طور پر بڑی حد تک اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دو دائرہ کار ایسے ہیں جن میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست میں مذہبی سکالر کو کون سا رول دیا جائے اور غیر مسلم شہریوں کو کیا درجہ دیا جائے۔ دوسرے سوال پر تو سبھی متفق ہیں کہ ہر شہری کو زندگی گزارنے کے حق کی ضمانت حاصل ہے، وہ آزاد شہری ہوگا، اسے جائیداد بنانے کی آزادی حاصل ہوگی لیکن اس کی سیاسی اور مذہبی عقیدہ پر عمل کرنے کی آزادی پر کچھ پابندیاں ضرور عائد کردی جاتی ہیں۔ چند ایک اصولوں کے مطابق غیر مسلموں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ صرف غیر مسلموں تک ہی محدود رکھیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کی اپنی مذہبی عدالتیں ہوتی ہیں لیکن عام قانون میں غیر مسلم افراد کو کمتر سمجھا جائے گا (ان کی گواہی یا شہادت قابل قبول نہیں ہوتی اور اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اس کی سزا اس سزا کی نسبت زیادہ ہوتی ہے جو اس مسلمان کو ملتی ہے جو کسی غیر مسلم کو قتل کردیتا ہے) اور سیاسی عمل میں غیر مسلم شہریوں کو بھرپور شرکت کی اجازت نہیں ہوتی۔ (۹۰) (پاکستان میں ایسا نہیں ہورہا، غیر مسلموں کو سیاسی عمل میں اس حد تک شامل کیا گیا ہے کہ وہ انتخابات میں اپنا ووٹ دے کر اپنے نمائندے چن لیتے ہیں اور یہ غیر مسلم منتخب

نمائندے صوبائی اور وفاقی اسمبلیوں تک پہنچتے اور مختلف وزارتوں کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے ہیں۔ (مترجم)

اس نقطہ نظر پر غور وفکر کرتے ہوئے کہ مسلمان، مسلم ممالک میں قائم حکومتوں کو اسلامی نہیں سمجھتے اور اسلامی طرز حکومت کے پروگراموں میں نظری اور اصولی یکسانیت نہیں پائی جاتی یہ بات بڑی حیرت انگیز محسوس ہوتی ہے کہ مسلمان ایک اسلامی ریاست کی بات یوں کرتے ہیں جیسے یہ نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ بڑی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوئی اور اس تصور اور نقطہ نظر پر سب کا اتفاق ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک اوسط درجے کا مسلمان جب اس اصطلاح کو استعمال کرتا ہے تو اس میں مسترد کر دینے کا عمل اور ایک خواب دونوں شامل ہوتے ہیں: وہ مسترد کرتا ہے مغربی بالادستی کو اور ان ظالم حکمرانوں کو جو آج اسلامی ممالک میں حکمران بنے بیٹھے ہیں اور ایک دھندلا سا خواب دیکھتا ہے کسی تصوراتی اور ماورائی حل کا...... نبیؐ کے شہر مدینہ کو ایک مثالی ریاست کے طور پر قبول کر لینے کا تصور ایک مسلمان کے ذہن کے کسی کونے میں موجود ہوتا ہے لیکن اس بات پر بہت کم غور وخوض کیا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اس ماڈل اور مثالی ریاست کے تصور کو کیسے اپنایا جائے۔ اسے عملی شکل دینے کی صورت کیا ہو۔ بیشک ایک عام انسان سے تو ہمیں زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہئے اس لئے کہ وہ تو کبھی بھی سیاسی سائنس سے واقف نہیں رہا، وہ تو علم سیاسیات سے واقف ہی نہیں اور کوئی ماہر اور عالم فاضل اسلامی ریاست کے بارے میں بات کر رہا ہو تو اس سے پہلے کہ اسے معلوم ہو کہ کوئی مرد یا عورت اپنے ذہن میں اسلامی ریاست کا کیا تصور رکھتے ہیں انہیں اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں مفصل گفتگو کریں۔ آئی ایس این اے (اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ) کے ایک بہت بڑے عہدیدار نے حال ہی میں میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر امریکی کل تک مسلمان ہونا چاہیں تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ لوگ اس کے بعد کیا کریں گے۔

باوجود اس حقیقت کے کہ آراء کا اختلاف اور غیر یقینی صورتحال موجود ہے پھر بھی تمام اصول پسند مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد مذہبی ہونی چاہئے ایک عام تصور تو یہ پایا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کے بڑے بڑے سیاسی اور ثانوی اداروں کے سربراہ

Marfat.com

مسلمان ہونے چاہئیں۔ میں اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ اس بات کو تو تسلیم کرلیا جانا چاہئے ورنہ پھر لفظ ''اسلامی'' استعمال کرنے کا کیا جواز بنتا ہے؟ کچھ مسلمان اصول پسند ایسے بھی ہیں جنہیں جمہوری ماڈل میں بھی کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے پروگرام جوں جوں مغربی جمہوریتوں کے قریب آتے جاتے ہیں توں توں لفظ ''اسلامی حکومت'' اصل اہمیت کھونے لگتا ہے (۹۱) اور یہ دوسری وجہ ہے کہ میں جدید عوامی جمہوریت کو ممکن حد تک ''اسلامی'' ماڈل تسلیم کرنے سے ہچکچاتا ہوں اس لئے کہ یہ سیاسی منصب کو ایک مخصوص مذہبی وابستگی تک محدود نہیں کرتا۔

ایک یورپی یا امریکی مسلمان ایک نئے تذبذب اور معمے میں پھنس جاتا ہے کہ کیا اس مسلمان مرد یا عورت کو یہ خواہش کرنی چاہئے کہ ان کی حکومت کی موجودہ شکل تبدیل ہو جائے جس کے بظاہر بہت سے فائدے اور کئی صورتیں ہیں جو اس مرد یا عورت کے اسلام کو سمجھنے سے مطابقت رکھتے ہیں اور یہ کہ کیا وہ ایسا اس لئے چاہیں گے کہ وہ موجودہ حکومت کو تبدیل کرکے ایک ایسا نظام حکومت لے آئیں جس کی آج بھی صحیح تشریح ہی نہیں ملتی۔ یہ مایوسی یا ہزیمت ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت کی طرف اشارہ کرسکتی ہے۔

نبیؐ کے دور نبوت کے مختلف مراحل میں مسلم سکالرز نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی برکتیں نازل ہوئیں اس لئے کہ یہ ان مسلمانوں کی مدد کرتا ہے جو مختلف مشکلات سے گزر رہے ہوں اس لئے یہ بات بڑی فطری محسوس ہوتی ہے کہ وہ نبیؐ کی آزمائشوں میں اور ابتدائی دور کے مسلمانوں کی زندگی کی آزمائشوں میں اپنی آزمائشوں کی مثالیں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن اسے اس حد تک مبالغہ آمیز بنایا جاسکتا ہے کہ مسلمان زبردستی وہاں مماثلت اور مشابہت ڈھونڈنے لگتے ہیں جہاں دراصل محض مضحکہ خیز مشابہت نظر آتی ہے۔ قرآن اور احادیث نبویؐ اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ محمد ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام نے حیرت انگیز صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکہ کے اس معاشرتی ماحول میں اسلام کو عملی طور پر پیش کیا اور اس کی وہاں تبلیغ کی جہاں ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے تھے۔ جب تمام راستے مسدود ہوگئے تب مسلمانوں نے انتہائی ظلم و ستم اور ایذا رسانی میں سیاسی خود مختاری کے حصول کی خاطر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہ تصور کرنا بے سود ہوگا کہ اگر یہ مسلمان کسی ایسے طرز حکومت میں زندگی گزار رہے ہوتے جہاں اسلام پر عمل کرنے اور اس کی اشاعت کے لئے انہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا تو

Marfat.com

سر تسلیم خم ہے

پھر یہ کس سمت رخ کرتے اس لئے کہ ان کی صورتحال بالکل مختلف تھی۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور اس میں برنارڈ لیوس بھی میرا ہمنوا ہے کہ "محمد ﷺ بطور پیغمبر خدا اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر سیاسی لیڈر بنے تھے اور معاملہ اس کے برعکس نہ تھا۔" (۹۲)

مغربی دنیا میں مسلمان مردوں کی نسبت ایسی عورتیں زیادہ ہیں جنہوں نے نقصان اٹھایا اور تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ لیکن ابتدائی دور کے مسلمانوں کے مقابلے میں انہوں نے کم ظلم وستم اور اذیتیں برداشت کی ہیں۔ اپنے مذہبی ایمان وعقیدے کے مطابق جب تک یہ اس قابل ہیں کہ معاشرے کے سیاسی ارتقاء میں ایک دوسرے کے شریک رہیں، مجھے کوئی بھی ایسا فرمان یا منشور نظر نہیں آتا جو موجودہ جمہوری طرز ہائے حکومت کو ختم کر سکے۔ مسلم مصنفین پورے وثوق کے ساتھ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلام ہمیشہ جبر سے نہیں بلکہ پرامن محبت کے ماحول میں پھیلا اور ایسے آثار پہلے ہی سے نظر آ رہے ہیں کہ مغربی ممالک کی سرزمین اسلام کے پھلنے پھولنے کیلئے نہایت زرخیز ہے ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ (۳:۱۱۰)

"اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کیلئے۔" (۳:۳۲)

اور یوں بہترین لوگوں میں شامل ہو جائے۔ وہ تو دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ موقع انہیں مغربی ممالک میں میسر آتا ہے اور اس وقت بھی مسلم ممالک سے زیادہ بہتر فضاء ان ملکوں میں موجود ہے میں صاف بات کہہ دوں کہ مجھے تو سب سے بڑی فکر اور تشویش یہ ہے کہ اگر صورتحال بدل جائے تو مسلمان تو یہ مراعات دوسروں کو فراہم کرنے سے انکار کر دیں۔

ارتداد (۹۳)

"کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں کہ سلمان رشدی ارتداد کی قرآنی سزا کا مستحق ہے؟"

Marfat.com

اس کے سوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ اس کا دوسرا حملہ تھا۔ سامعین میں سے نصف غیر مسلم تھے اور بی بی سی کے کیمرے ہر لفظ پکڑ رہے تھے۔ کیا اس نے یہ نہ سوچا ہوگا کہ اس کے الفاظ کیا اثر چھوڑیں گے اور تصادم کی کیا صورت پیدا ہو سکتی تھی؟ اسلام کے بارے میں ان لوگوں کے بدترین شکوک وشبہات کی تصدیق کئے بغیر آپ ایسے چیلنج کا جواب کیسے دے سکتے ہیں؟

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ مرتد ہے اور کیا سننا چاہتی ہو؟'' میں نے نہایت سختی سے جواب دیا مہربانی کر کے چلی جاؤ! تم حاصل کیا کرنا چاہتی ہو؟ تم نے یوسف اسلام (قبول اسلام سے قبل کیٹس سیٹونز، مشہور گلوکار) کے لئے ذرائع ابلاغ کا ردعمل نہیں دیکھا؟ یہ ایک ایسی خبر تھی جو پوری مغربی دنیا میں پھیل چکی تھی! خبر کا متن تھا:

''موت کی ریل پر سوار ہو جاؤ!'' ''قاتل کا گیت!'' ''پھول جیسے معصوم بچے سے لے کر انتہائی خوفناک دہشت گرد تک!'' یہ خبر شہ سرخیوں میں چھپی تھی انہوں نے پرانی دوست لڑکیوں سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ اس میں یہ بات ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس نے پوچھنا چاہا کہ ''کیا اسے قرآن کی رو سے موت کی سزا دی جا سکتی ہے؟'' اس خاتون کی آنکھوں میں غصے کے شعلے دیکھے جا سکتے تھے! خدا کی منکر استعماری قوتوں نے دو سو سال تک جو ظلم وستم ڈھائے تھے ان کے خلاف غم وغصہ ان آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ انتقام کی آگ کے سرد شعلے اس کی آنکھوں میں بھڑک اٹھے تھے۔ انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر ایک سرد آہ بھری!

''ہاں اسے ارتداد کے جرم میں قرآن کے مطابق سزائے موت ملنی چاہئے۔''

''السلام علیکم''، اس خاتون نے رسماً اعلان کیا اور مائیک سے دور چلی گئی اور پھر سیٹوں کے درمیان کے راستے سے ہوتی ہوئی اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔

''اللہ اکبر!!!'' انہوں نے نعرہ بلند کیا ''اللہ اکبر!!!''

اسلام قبول کرنے پر تقریباً ہمیشہ ہی بڑے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ محض ایک عقیدے کا بیان یا اعلان نہیں بلکہ اس سے تو مسلم برادری کے ساتھ اپنی گروہی اور سیاسی شناخت وابستہ کرنی ہوتی ہے اور پھر اس کے نتائج کیلئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ جب کوئی کلمہ شہادت

پڑھ کر عام اعلان کر دیتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے تو اسے مسلمانوں کے تمام مذہبی اصولوں تک رسائی اور یکساں حصہ داری کی رعایت حاصل ہو جاتی ہے اس پاک وصاف اعلان کے فوراً بعد ایک نومسلم کی زندگی، جائیداد اور عزت مقدس ہو جاتی ہے: "یہ تصور کرنا بہت آسان ہے کہ اس فارمولے پر کس قدر آسانی سے اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمل کیا جا سکتا ہے: میدان جنگ میں کسی کی جان بچا کر یا کوئی مادی یا سیاسی فائدہ اٹھا کر، یا دھوکہ وفریب، سے مسلم برادری میں چھپ کر، نفوذ کر کے۔ ایسی خرابیوں کا ذکر تاریخ کے صفحات میں بہت ملتا ہے۔ ابتدائی دور کے قانون دانوں کے لئے اس خطرے سے بچنے کا طریقہ یہ تھا کہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے والے کو واجب القتل قرار دیا جائے۔ غیر مسلموں کو اجازت تھی کہ وہ جس مذہب میں جانا چاہیں اپنی مرضی سے چلے جائیں لیکن اس شرط پر کہ انہوں نے ابھی اسلام قبول نہ کیا ہو۔ اس لئے کہ جو ایک بار مسلمان ہو جائے اسے ہمیشہ مسلمان رہنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام سے نکل کر ارتداد کا ارتکاب کر لے تو اس کی سزا موت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وجہ سے نومسلموں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن قانون دانوں کا اصل مقصد یہ بھی تو نہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کریں بلکہ چوری چھپے دخول کو روکنا تھا۔

ایمان وعقیدے کا بحران ہمیشہ سیاسی بحران نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ جنہیں غیر یقینی صورتحال کی تکلیف کا تجربہ ہوتا ہے وہ کوئی دنیاوی ترغیب نہیں ہوتی وہ اکثر ان کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں جو بن دیکھے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شکوک سے انسان کے ایمان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور وہ اسے رد کر دینے کے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے اور ایسا اس وقت زیادہ ہوتا ہے اگر اس کی ممانعت ہو جائے لیکن اس سے زیادہ گہرے اور پختہ ایمان تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے خصوصاً اس وقت جب کوئی انسان اپنے عقیدے سے خود لڑتا رہے یہاں تک کہ وہ پختہ اور راسخ ہو جائے۔ کچھ علمائے دین مثلاً غزالی نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ سچے ایمان اور یقین محکم تک پہنچنے کیلئے اس راہ کا پہلا قدم شک سے شروع ہوتا ہے (۹۴) چند ابتدائی دور کے قانون دانوں اور فقہاء نے شک وشبے اور مکروفریب میں فرق معلوم کیا۔ مثال کے طور پر حنفی مسلک میں مرتد عورت واجب القتل نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ کسی طرح بھی اسلام کے خلاف لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتی۔ اور یہی بظاہر وجہ ہے جس پر کسی مرتد کو

Marfat.com

سزائے موت دی جاسکتی ہے۔'' (۹۵) لیکن اسلام میں اکثریتی نظریہ یہی تھا کہ خواہ حالات کچھ بھی ہوں اسلام چھوڑنے والے مرتد کی سزا موت ہی ہے۔

مقرر کے اعتراف کے برعکس قرآن نے کبھی بھی سزائے موت یا کسی اور سخت سزا یا سخت سزا کے اقدام مثلاً ارتداد کے بارے میں وضاحت وصراحت نہیں کی۔ قرآن پاک میں ارتداد کا ذکر تیرہ بار آیا ہے لیکن ان تمام آیات میں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ مرتد کو اس جرم کی سزا آخرت میں ملے گی۔ (۹۶)

''(اور یہ خوب سمجھ لو) کہ تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔'' (۲: ۲۱۷)

''مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں'' (۳: ۹۰)

''رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا۔'' (۴: ۱۳۷)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔'' (۵: ۵۴)

''جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضا مندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (۱۶: ۱۰۶) (۹۷)

Marfat.com

ریاست مدینہ کے دور نبویؐ میں ارتداد کے دو مقدمات آئے تھے، ان دو تاریخی مقدمات کا حوالہ قرآن پاک میں آتا ہے ان میں سزا کوئی نہیں دی گئی تھی۔ ان میں سے ایک تو نبیؐ کے یہودی مخالفین کا تھا جو دوسروں کو دین چھوڑنے کی ترغیب دے کر کھلی نظیر قائم کرتے تھے۔ دوسرے مقدمے میں چھ مسلمانوں کی بیویاں ملوث تھیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد کفار کی برادری میں دوبارہ شامل ہونے کا انتخاب کر لیا تھا۔

''اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی ﷺ کو ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔'' (۳:۷۲)

''..........جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔'' (۶۰:۱۱)

حکم باری تعالیٰ ہے کہ:

''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔'' (۲:۲۵۶)

اس میں کھلی سیاسی بغاوت کے عمل سے باہر ارتداد کی سزا کے خلاف استدلال اور بحث و حجت کا پہلو نکلتا ہے۔

ارتداد کے واقعات سے متعلق آنحضرت ﷺ کی احادیث کا زیادہ جھکاؤ بھی اسی نتیجہ کی طرف ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی ﷺ کی مستند احادیث ایسی ہیں جن کے مطابق ارتداد کے مرتکب افراد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث اس شخص سے متعلق ہے جس نے آنحضرت ﷺ سے اپنی وفاداری کا عہد توڑ لیا تھا اور پھر بھی اسے کوئی سزا نہیں دی گئی تھی (۹۸) اسی طرح ایک اور واقعہ ایک عیسائی کا ہے جو مسلمان ہو گیا تھا اور مدینہ میں تھوڑے عرصے تک آنحضرت ﷺ کے محررین میں شامل رہا تھا پھر وہ دوبارہ عیسائی

Marfat.com

ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں اکثر یہ سننے میں آتا تھا کہ وہ کفر کے یہ کلمات بکتا پھرتا ہے ''محمد ﷺ تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے تھے سوا اس کے جو میں ان کے لئے لکھتا تھا۔'' اس کے راوی انس آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ وہ شخص بعد میں طبعی موت مرا تھا (۹۹) (یعنی اسے سزا کوئی نہیں دی گئی تھی)۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسی بہت سی احادیث موجود ہیں جن میں ارتداد کو بہت بڑی بغاوت یا سازش کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ ان میں ایک واحد مستند مقدمہ جس میں مرتدین کو سزا دیئے جانے کا ذکر ہے، قبیلہ عقول کے ایک گروہ کا مقدمہ ہے جس نے قتل کیا تھا اور جن کو آخر کار پکڑ کر سزائے موت دی گئی تھی۔ (۱۰۰) آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے کہ ''ایک مسلمان کی زندگی تین موقعوں پر لی جاسکتی ہے: ایک شادی شدہ زانی کی دوسرے اس کی جس نے کسی انسان کو مار ڈالا ہو اور تیسرے اس شخص کی جس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا ہو اور اپنے آپ کو اپنی برادری سے جدا کرلیا ہو۔'' آگے چل کر ابو داؤد سے روایت میں اسے مزید واضح طور پر یوں بیان کیا گیا ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ ان تینوں میں سے آخری تیسرا شخص وہ ہے ''جو اپنی برادری سے نکل کر اللہ اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کرنے نکلا۔'' (۱۰۱)

مستند قانونی احادیث کے متن میں یہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''جو کوئی اپنا مذہب تبدیل کرلے، اسے قتل کردو'' اسے اس استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں ارتداد کے عام واقعات میں سزائے موت دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ (۱۰۲) محمد علی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس بیان کی تشریح وتصریح کی بڑی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر اس کے لغوی معانی لئے جائیں تو وہ یہ بنتے ہیں کہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے، اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں چلے جائیں تو واجب القتل ہیں۔ اس کی رائے میں صرف ایک ہی راستہ ایسا ہے جس کے ذریعے اس بیان کو دوسرے ثبوت یا شہادت کے ساتھ منطبق کیا جاسکتا ہے، جس کا زیادہ حصہ تو اوپر آچکا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ لی جائے کہ وطن سے غداری یا سازش کے بارے میں مسئلہ زیر بحث ہے۔ (۱۰۳) محمد العوا کو یہ اعتراض ہے کہ علی کا استدلال بڑا معذرت خواہانہ ہے اور قواعد کے لحاظ سے اس بیان کو سولہ میں سے جس طریقے سے چاہیں اس کی تشریح کرلیں۔ ان سولہ میں سفارش یا اجازت دونوں پائی جاتی ہیں لیکن

ضروری نہیں کہ اس کے معنی حکم کے ہوں (۱۰۴) اس بات کا خیال کئے بغیر کہ وہ کون سے عقلی و معنوی معیار تھے جو علی پر اثر انداز ہوئے، مجھے ذاتی طور پر اس کا استدلال صحیح اور موزوں نظر آتا ہے۔ قرآن اور مستند احادیث سے نظیر پیش کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کسی بھی حدیث نبویؐ کا بظاہر نامکمل حصہ اسے تو کالعدم قرار نہیں دے سکتا جسے آپ کا ضمیر یا ایمان درست اور صحیح مان رہا ہو۔ العواء، تو علی کے دعوئی کو صرف بڑھا چڑھا کر یوں پیش کرتا ہے کہ یہ خاص حدیث ناکافی ہے۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ایسے معاملات پیش آسکتے ہیں جہاں تمام صحیح اور درست امور معلومہ کو ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں ایسی مثالوں میں ہمیں چاہئے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ ہم آہنگی یا مطابقت تلاش کئے بغیر قابل ادراک شہادت و گواہی پر انحصار کرلیں۔

مثال کے طور پر جہاں تک نبیؐ کی حدیث کی بات ہے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ احادیث کے سکالرز اچھی طرح جانتے تھے کہ احادیث کے راوی، خصوصاً چند ابتدائی ادوار میں ہمیشہ لفظ بہ لفظ وہ کچھ بیان نہیں کرتے تھے جو انہوں نے سنا ہوتا تھا بلکہ جو مفہوم حدیث وہ سمجھ پاتے تھے وہ بیان کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے احادیث کے مستند مجموعوں میں فرق پایا جاتا ہے اور احادیث کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں۔ ہم احادیث کو معلومات کا ایک نہایت لازمی اور بنیادی ذریعہ سمجھ کر انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ ان میں جو نقائص پائے جاتے ہیں ان کا تجزیاتی اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں، دوسری متعلقہ معلومات کے ساتھ ان کا موازنہ کریں اور اس بات کو تسلیم کرلینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں کہ ان میں عدم جامعیت اور کوئی کمی رہ جانے کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔

ارتداد کے لئے سزائے موت کے مسئلے پر مسلم ممالک مثلاً ایران، سعودی عرب اور غالباً پاکستان میں بھی اہم مضمرات پائے جاتے ہیں اور ان مغربی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے یہ فوری اہمیت کا حامل مسئلہ نہیں، جہاں کسی شخص کو اس لئے قتل کردینا کہ اس نے اپنے مذہب کے چھوڑنے کے بارے میں کیوں سوچا اور اپنا مذہب کیوں چھوڑا نہایت قابل اعتراض بات سمجھی جاتی ہے۔ مستند احادیث کے متون میں موجود ثبوت اور گواہی پر عمل کرتے ہوئے محض

Marfat.com

مذہب تبدیل کرنے پر سزائے موت دینے کا جواز پیش کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ یہ تجویز کیا جائے کہ وطن کے دشمن کی مدد کرنے اور وطن سے غداری کے مرتکب کو سزائے موت دی جانی چاہئے۔قرآن پورے وثوق کے ساتھ اعلان کرتا ہے:

> ''دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔'' (۶: ۱۰۴)

مسلمانوں کو اس کے بدلے میں یقین دہانی کرائی جانی چاہئے کہ ان کا دین تو اس ماحول اور گرد و پیش میں غالب آئے گا جہاں واقعی ''مذہب میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔''

حواشی

(۱) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان، (۷۸: ۲۷)
(۲) ایضاً (۶:۳)
(۳) اسد، دی روڈ ٹو مکہ، ص (۲۹۷)
(۴) صحیح بخاری ترجمہ محمد محسن خان (۴۶: ۴)
(۵) ویڈی، دی مسلم مائنڈ (لندن: لانگ مین، نیا ایڈیشن) ۱۱۳-۱۱۶
(۶) مے اینڈ میز جر: نیو آکسفورڈ اینو یسٹڈ بائبل۔ میسیحو۶: ۵-۸ میں دیکھئے ''سرمن آن دی ماؤنٹ''
(۷) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۱۰: ۳۰)
(۸) جمال بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام (امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز ۱۹۷۲ء) ص ۱۸ یہ حدیث نبوی وہ ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر بدوی نے دیا تھا۔
(۹) ترمذی سے حوالہ دیا گیا ہے (۱۰: ۱۱) جو محمد علی کی کتاب ''اے مینویل آف حدیث'' میں شامل ہے (لندن، کرزن پریس ۱۹۷۷ء)
(۱۰) ایسپوزیٹو، اسلام: دی سٹریٹ پاتھ (صراط مستقیم) (۸۸-۸۹، ۱۴۹-۱۵۲)
(۱۱) واٹ، محمد ﷺ ایٹ مکہ، (۹۶-۹۹)
(۱۲) امام نووی کی ریاض الصالحین، ترجمہ محمد ظفر اللہ خان ص ۷۳-۷۶
(۱۳) بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام، فضل الرحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی (لندن: سیرۃ فاؤنڈیشن ۱۹۸۶ء) نابیا ایبٹ، عائشہؓ: دی بیلوڈ آف محمد ﷺ (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو، ۱۹۴۲ء)

(۱۴) صحیح بخاری ترجمہ محمد محسن خان (۷۸:۲)

(۱۶) بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام، ۱۵

(۱۷) ایضاً ۱۵

(۱۸) علی، دی ریلیجن آف اسلام ص ۶۰۳

(۱۹) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۱:۱)

(۲۰) مے اور میز جر، دی نیو آکسفورڈ اینو ٹیٹڈ بائبل، ۱۱۶۹

(۲۱) گارڈن ڈی نیوبائی، دی میکنگ آف دی لاسٹ پرافٹ (یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولینا پریس، ۱۹۸۹ء) ص ۱۔۲۸

(۲۲) مارگریٹ سمتھ، رابعہ دی مسٹک (کیمبرج، یو کے، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴ء) ص xxvii xx ۔ xxvi دیباچہ

(۲۳) عبدالوہاب بودیبا، سیکشویلٹی ان اسلام ترجمہ ایلن شیریڈن (لندن ۱۹۸۵ء) ۱۱۶۔۱۴۰، مارگریٹ سمتھ، رابعہ دی مسٹک (کیمبرج، یو کے، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴ء) ۱۱۱۔۱۳۶

(۲۴) فضل الرحمٰن، ہیلتھ اینڈ میڈیسن ان دی اسلامک ٹریڈیشن، ۱۰۵

(۲۵) جمال بدوی، اسلامک ٹیچنگ سریز، ہیلی فیکس این ایس، کینیڈا

(۲۶) فضل الرحمٰن، ہیلتھ اینڈ میڈیشن ان دی اسلامک ٹریڈیشن، ص ۱۰۵۔۱۰۶

(۲۷) آیات (۱۲:۲۹) اور (۴۳:۱۶۔۱۸) میں حوالے کے طور پر کبھی کبھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے عقل و دانش اور اخلاقی سطح پر عورتوں کو مردوں کی نسبت کم درجے پر رکھا ہے۔ آیت کے الفاظ یوں ہیں:

''اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی'' (۱۲:۲۹)

''کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پائی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کرسکتی؟ (۴۳:۱۶۔۱۸)

بدقسمتی سے میں نے مسلمان مردوں کو اکثر موقعوں پر یہ استدلال دیتے ہوئے سنا ہے عربی لفظ ''قاذ'' جسے ترجمہ کرکے ''مکروفریب'' کے معنی دیئے گئے ہیں اس کا مطلب ہے عقل و دانائی میں مات دینا، ذہانت میں شکست دینا یا نکتہ رسی کے ذریعے فریب دینا۔ دوسری آیت میں عورت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جو جب کبھی بحث و حجت میں حصہ لیتی ہے یا زبانی بحث مباحثے میں

Marfat.com

شریک ہوتی ہے تو اپنے مؤقف کی وضاحت کر کے دوسروں کو ہم خیال نہیں بنا سکتی۔ اس طرح عورت کی ذہانت کے بارے میں ہمارے سامنے دو متضاد بیانات آتے ہیں۔ ان بیانات کے ظاہر پر جانے سے تو ان سے مصالحت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اگر ان کے سیاق وسباق پر غور کر لیا جائے تو اس سے کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا ہے۔ پہلا بیان فوطیفار کا ہے جس کی بیوی نے یوسفؑ کو بدکاری کی طرف بہکاوے کی کوشش کی ہے۔ اور دوسرا بیان عرب بت پرستوں کے عیارانہ تصور پر مبنی ہے جسے ایک اور آیت (۱۶: ۵۸-۵۹) میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دینے کے جرم سے منسلک کیا جاتا ہے۔ ان کے سیاق وسباق کو نظر انداز کر دینے کے معانی یہ ہوں گے کہ قرآن کو محض شاعری مان لیا جائے۔ کیونکہ متن کے اندر غیر مسلموں کے اس دعویٰ کا ذکر ہے۔

حضرت یوسفؑ کے قصے میں جب انہیں بہکانے والی عورت کے خاوند کو یوسفؑ کی بے گناہی اور معصومیت کا پتہ چلتا ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قصوروار اس کی بیوی ہے تو وہ بیوی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھا۔ بلکہ عوامی سکینڈل سے بچنے کیلئے جس میں اس کی اور اس کی بیوی کی بے عزتی کا امکان تھا اور معاشرے میں اس کے مقام و مرتبے کو بٹا لگنا تھا وہ مندرجہ بالا بات کہہ کر سارے قصے کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ بعد میں اس کی بیوی کے جذبات کا یوسفؑ کے بارے میں، خاوند کو پتہ چل جاتا ہے تو وہ خجالت سے بچنے کیلئے یوسفؑ کو قید خانے میں ڈال دیتا ہے۔ طبری جیسے ابتدائی مسلم شارحین اور مفسرین نے جو فوطیفار کو اخلاق و کردار کی محض کمزوری کی ایک مثال سمجھتے ہیں، بعد میں یہ دیکھا کہ اس کا کردار تو بے حد قابل ملامت تھا اور مردانگی سے کوسوں دور تھا۔ چنانچہ وہ اکثر اس قصے کے گرد ایسی افسانوی باتوں کا تانا بانا بن دیتے ہیں جس سے اس قابل نفرت شخصیت کے بارے میں تفاصیل مہیا کر سکیں۔ ان تفاصیل میں اکثر جگہ اس کی جنسی کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تشریحات میں فوطیفار (۲۸۔الف) کی بیوی سے ہمدردی بھی ظاہر کی گئی ہے اور اس کے خاوند کی مردانہ کمزوری کی آڑ لے کر اس عورت کے یوسفؑ پر فریفتہ ہونے کے عمل کا دفاع بھی کیا گیا ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو قرآن دو عام اور متضاد رجحانات اور رویوں کو پیش کرتا ہے جو مرد عورتوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کی اپنی اخلاقی کمزوریاں چھپی رہیں دونوں بیانات ناانصافی پر مبنی کاموں سے پیوستہ ہیں اور جب ان کی تشریح کی جائے تو اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کس قدر بدقسمتی ہے کہ مسلمان مرد آج بھی عورتوں کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے مواقع پر ان قرآنی آیات کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

(۲۸) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان، ۶۲: ۹۱

Marfat.com

(۲۸)۔ الف) صحیح بخاری، فوطیفار بائبل میں استعمال ہوا ہے قرآن میں یہی عزیز مصر کے لقب سے استعمال کیا گیا ہے، عزیز کے معنی بڑے اقتدار کا مالک یا کسی بڑے عہدیدار کے ہیں۔ (مترجم)

(۲۹) اسد، صحیح بخاری، گولڈ زیہر، مسلم سٹڈیز ۱!

(۳۰) بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام، ۵۔۱۱، فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی (معاشرے میں مسلمان خواتین کا کردار) ص ۲۳۷۔۲۴۷)

(۳۱) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، صف (۴۰۷: ۴۰۸)

(۳۲) اے آر آئی دوئی، شریعہ ان دی ففٹینتھ سینچری آف دی ہجرہ (اسلامک ٹرسٹ پبلی کیشنز) نیا ایڈیشن۔ وراثت پر لکھا گیا باب دیکھئے۔

(۳۳) اس موضوع پر بحث کیلئے دیکھئے فضل الرحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، کیتھ ہوڈکنسن، مسلم فیملی لاء (لندن: کروم ہیلم لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء)

(۳۴) اس موضوع پر بحث کیلئے دیکھئے فضل الرحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی سیرۃ فاؤنڈیشن، لندن ۱۹۸۶ء اور ہوڈکنسن کیتھ: مسلم فیملی لاء کروم ہیلم لمیٹڈ، لندن ۱۹۸۴ء

(۳۵) ہوڈکنسن، مسلم فیملی لاء، ۱۵۰۔۱۵۱

(۳۶) علی، اے مینول آف حدیث نمبر ۲۸۴، ابوداؤد کے مرتبہ مجموعہ سے۔

(۳۷) ہاکنسن، مسلم فیملی لاء، ۲۷۵۔۲۷۶

(۳۸) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، ۱۵۰۔۱۵۲

(۳۹) امام نوی، ریاض الصالحین ترجمہ ظفر اللہ خان ۹۴

(۴۰) بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام، ۲۱، النسائی، ابن ماجہ اور احمد سے حوالہ دیا گیا۔

(۴۱) اسد، دی میسج۔

(۴۲) ہاکنسن، مسلم فیملی لاء ص ۹۵۔۱۰۰

(۴۳) مسلمانوں کو کبھی کبھی یہ مسئلہ بھی درپیش رہا ہے کہ کنوارے مردوں کی تعداد کنواری عورتوں کی نسبت زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر ہجرت مدینہ کے وقت اور مسلمانوں کی فتوحات کے دوران مفتوحہ علاقوں میں نام کو بھی کوئی مسلمان عورت نہ تھی۔ اگر ضرورت وقتی اور عارضی ہوتی تو آنحضرت ﷺ اپنے مرد ساتھیوں کو روزے کی تلقین کرتے تاکہ شہوانی خواہش کو دبایا جا سکے اور اگر یہ مسئلہ طویل المدت نظر آتا تو مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ صاحب کتاب خاندانوں کی عورتوں سے شادی کر لیں (یعنی یہودی، عیسائی اور برصغیر) کے علماء کے خیال کے مطابق ہندو لڑکیوں سے) لیکن غیر مسلموں کے ساتھ عموماً شادی کر لینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ (جینفر لینگ کو میرے خیال میں غلط فہمی ہوئی ہے برصغیر کے علماء بھی صرف اہل کتاب

Marfat.com

خاندانوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں سے شادی کو جائز سمجھتے ہیں جن میں صرف یہودی اور عیسائی شامل ہیں، ہندو اہل کتاب نہیں تصور کیے جاتے۔ مترجم)

(۴۴) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، صف ۲۶۰۔۲۷۰، ۳۴۷۔۳۵۷

(۴۵) بدوی، دی سٹیٹس آف وومن ان اسلام، ص ۲۲۔۲۵، فضل رحمٰن، دی رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، ۲۶۰۔۲۷۰

(۴۶) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، ۲۶۶۔۲۷۰

(۴۷) فضل رحمٰن، حدیث اینڈ میڈیسن ان دی اسلامک ٹریڈیشن، ۱۰۵۔۱۰۶

(۴۸) ایبٹ، عائشہؓ: دی بلوڈ آف محمد ﷺ، (۱۷۶)

(۴۹) جان ایل ایسپوسٹیو، اسلام اینڈ پالٹکس، (۲۶۔۲۹)

(۵۰) ایبٹ، عائشہؓ: دی بلوڈ آف محمد ﷺ (۱۷۵۔۱۷۶)

(۵۱) ایضاً ص (۱۷۵)

(۵۲) احسان یار شاطر، دی کیمبرج ہسٹری آف ایران، جلد ۳ (۱) (کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۸۳ء) ص (۱۷۰۔۱۷۱)

(۵۳) ثریا الترکی، ویمن ان سعودی عربیا (کولمبیا پریس، ۱۹۸۶ء) (۳۵۔۳۸)

(۵۴) القرضاوی، یوسف، دی لافل اینڈ دی پروہبٹڈ ان اسلام (اسلام میں حلال وحرام کا مسئلہ) (امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز، نیا ایڈیشن) (۱۶۰)، اسد، دی میسیج ص (۵۳۸۔۵۳۹)

(۵۵) ولفریڈ تھیسیج، عریبین سینڈز (نیویارک، ای پی ڈٹن اینڈ کمپنی ۱۹۵۹ء) ص ۱۹۲

(۵۶) القرضاوی، دی لافل اینڈ دی پروہبٹڈ ان اسلام، ص ۱۵۵۔۱۵۹

(۵۷) اسد، دی میسیج ص ۵۳۸۔۵۳۹ (نوٹس ۳۷، ۳۸ ص ۶۵۱ (نوٹ ۷۵)

(۵۸) اسد، اسلام ایٹ دی کراس روڈز، ص ۷۸۔۷۹

(۵۹) عدنان، اے اے، یوٹی لائزیشن آف ہیومن ری سورسز، دی کیس آف ویمن ان سعودی عربیا (سیکرامنٹو، کیلی فورنیا سٹیٹ یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء) ص ۵۶

(۶۰) فضل رحمٰن، دی رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، ۵۶۔۶۴، عبدالقادر، سوشل سائنس ریسرچ اینڈ ویمن ان دی عرب ورلڈ (پیرس، یونیسکو، ۱۹۸۴ء) ۱۴۰۔۱۴۱

(۶۱) صدیقی، حدیث لٹریچر، ۱۸۴

(۶۲) ایضاً، ۱۵۲۔۱۵۳

(۶۳) عبدالقادر، سوشل سائنس ریسرچ اینڈ ویمن ان دی عرب ورلڈ، ۱۴۷۔۱۴۸، کارکا مخلوف، چینجنگ ویلز (آسٹن، یونیورسٹی آف ٹیکساس پریس ۱۹۷۹ء) ۲۵۔۲۸، ۴۴، ۹۶۔۹۷) اہل رسام، سوشل

Marfat.com

سائنس ریسرچ اینڈ ویمن ان دی عرب ورلڈ (پیرس: یونیسکو۱۹۸۴ء) ۱۲۴۔۱۲۸ (۶۴) مخلوف، چینجنگ ویلز، ۲۵۔۳۰

(۶۵) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی ص (۳۴۲۔۳۴۳)

(۶۶) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان، (۵۲: ۳)

(۶۷) ایضاً۔(۶۵: ۱۰)

(۶۸) ایضاً۔(۶۲۔۷۸)

(۶۹) ایضاً۔(۴۔۷۔۴۱)۔

(۷۰) صحیح مسلم از امام نوی سے حوالہ دیا گیا۔ ریاض الصالحین، ترجمہ محمد ظفر اللہ خان۔

(۷۱) عبدالقادر، سوشل سائنس ریسرچ اینڈ ویمن ان دی عرب ورلڈ ص (۱۴۵: ۱۴۶)

(۷۲) آر لیو، ''دی سٹیٹس آف ویمن ان اسلام'' ان دی سوشل سٹرکچر آف اسلام (نیویارک کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۶۵ء) ص (۹۱: ۱۳۴)

(۷۳) فضل رحمٰن، رول آف مسلم ویمن ان سوسائٹی، (۳۴۲)۔

(۷۴) ایبٹ، عائشہ: دی بلوڈ آف محمد ﷺ، ص (۱۲۸۔۱۷۶)

(۷۵) یہاں اس بات کا تذکرہ کر دیا جانا چاہئے کہ مردوں اور عورتوں کا نماز کے دوران علیحدہ علیحدہ صفوں میں کھڑا ہونا ہی عام غیر مخلوط اجتماعات کی دلیل ہے۔ صرف یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ دوسری اسلامی رسومات مثلاً مناسک حج میں علیحدہ علیحدہ رہنے کی تلقین نہیں کی گئی۔

(۷۶) محمد این صدیقی، مسلم اکنامک تھنکنگ (لیسٹر، یوکے: دی اسلامک فاؤنڈیشن ۱۹۸۱ء)

(۷۷) ایضاً

(۷۸) برنارڈ لیوس، دی جیوز آف اسلام (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴ء) ص ۳۔۴

(۷۹) قرآن کی آیت ۶۱: ۱۱۔۱۲ بھی دیکھئے۔

(۸۰) صحیح بخاری ترجمہ، محمد محسن خان (۲۶: ۴۰)

(۸۱) سید ایچ نصر، ٹریڈیشنل اسلام ان دی ماڈرن ورلڈ (کے پی آئی لمیٹڈ ۱۹۸۷ء) ۲۷۔۳۳ یہ حدیث ابراہیم ابن عائلہ سے منسوب کی جاتی ہے اور علم حدیث کے سکالر اسے ضعیف سمجھتے ہیں۔

(۸۲) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۲۱: ۱۔۲۴)

(۸۳) قرآن کی آیت ۴۸: ۱۱۔۱۶ بھی دیکھئے ۹۰

(۸۴) ایضاً نویں سورۃ سے لی گئی آیات مثلاً ۹: ۱۲۳ اور ۹: ۲۹ کو اس استدلال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہ ایسی ریاستیں جن کے عزائم جارحانہ نہ تھے ان کو فتح کر کے اسلامی ریاست میں شامل کر لینا جائز تھا۔ جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے نہ صرف یہ کہ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے بلکہ اس

Marfat.com

طرح کی فرضی یا قیاسی باتوں کو بڑے پیمانے پر منسوخ کردینے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے لیکن جیسا کہ علی نے اپنی تصنیف ''دی ریلیجن آف اسلام'' میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، یہ تاریخی اور الہامی دونوں حوالوں کونظر انداز کرجاتی ہے۔

(۸۵) حضرت عمرؓ کی فتوحات کے ذریعے اس کی مثال پیش کی گئی ہے۔ علی اپنی تصنیف ''دی ریلیجن آف اسلام'' میں لکھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کئی قبیلوں نے بغاوت کردی تھی اور یوں اسلامی ریاست کی سیاسی حیثیت کوفوجی چیلنج پیش کردیا تھا۔ اس ساری کارروائی کا مرکزی نکتہ کسی حد تک شام سے ملا ہوا مغربی سرحدی حصہ اور مشرق میں بحرین سے جڑا ہوا علاقہ تھا۔ ان باغیوں کی حمایت رومی اور ایرانی سلطنتیں اسلحہ اور افواج سے کررہی تھیں۔

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر ہمیں پہلے ہی یہاں مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت بھی ملی ہوئی ہے اور جمہوری طریقے سے قانون اور حکومت پر اثر انداز ہوکر یوں ایک نئی وجود میں آنے والی مسلمان قوم نے اپنے آپ کو ان دو سلطنتوں سے متصادم پایا۔ مثال کے طور پر ایران کے معاملے میں میور بھی اپنی کتاب ''ہسٹری آف دی کیلفیٹ'' (تاریخ خلافت) میں اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ صورتحال ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے لئے اپنے دفاع کے طور پر ایران کو فتح کرلینے کے سوا کوئی دوسرا رستہ نہ تھا۔''

(۸۶) برنارڈ لیوس، دی جیوز آف اسلام، ص ۲۵۔۲۶

(۸۷) آیت اللہ روح اللہ خمینی، ولایت فقیہہ (تہران: ۱۹۷۸ء)

(۸۸) اشتیاق احمد، دی کانسیپٹ آف این اسلامک سٹیٹ (لندن: پی پٹر، ۱۹۸۷ء)

(۸۹) ایضاً۔ ۱۸۷۔۱۹۴ نیز دیکھئے: محمد اسد، دی پرنسپلز آف سٹیٹ اینڈ گورنمنٹ ان اسلام (کیلی فورنیا، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ۱۹۶۱ء) ڈیوڈ ڈی کومنز، اسلامک ریفارم (لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۰ء) اصغر خان، اسلام، پالٹکس اینڈ سٹیٹ (لندن: زید بکس ۱۹۸۵ء) متین ہیپر اینڈ رافیل اسرائیلی، اسلام اینڈ پالٹکس ان دی مڈل ایسٹ (سڈنی: کروم ہیلم ۱۹۸۴ء) طارق وائی اسماعیل اینڈ جیکولین ایس اسماعیل، گورنمنٹ اینڈ پالیٹکس ان اسلام (لندن فرانسز پنٹر، ۱۹۸۵ء) ایس ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دی اسلامک لاء اینڈ کانسٹی ٹیوشن (لاہور: اسلام آباد پبلی کیشنز لمیٹڈ ۱۹۸۰ء)

(۹۰) احمد، دی کانسیپٹ آف این اسلامک سٹیٹ، ۸۷۔۱۱۶، لیویز، دی جیوز آف اسلام ص ۲۷۔۴۰

(۹۱) احمد، دی کانسیپٹ آف این اسلامک سٹیٹ، ۱۲۱۔۱۶۲

(۹۲) لیوز، دی جیوز آف اسلام، ص ۱۲

(۹۳) اس موضوع پر دو جدید کتابوں میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جن میں روایتی حکمرانی کو چیلنج کیا گیا

ہے: محمد ایس ایل اے، پنشمنٹ ان اسلامک لاء (اسلامی قانون میں سزا کا تصور) (امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز، نیا ایڈیشن) ص ۴۹۔۶۸ علی، دی ریلیجن آف اسلام، ص ۵۹۱۔۵۹۹

(۹۴) گولڈزیہر، انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیالوجی اینڈ لاء (پرنسٹن یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء) ۸۷۔۸۸

(۹۵) العوا، پنشمنٹ ان اسلامک لاء، ص ۵۳

(۹۶) العوا، پنشمنٹ ان اسلامک لاء، ص ۵۰

(۹۷) میں یہاں محمد اسد کے فعل کفر کے ترجمے کو ترجیح دیتا ہوں جس کے معنی ہیں ''سچائی کو جھٹلانا'' یا ''سچائی کو رد کرنا'' بجائے اس کے کہ عمومی مفہوم ''شک کرنا'' یا ''یقین نہ کرنا'' لیا جائے۔ اس کے اصل معنی تو ہیں ''ڈھانپنا'' یا ''چھپانا'' اور اسلامی عہد سے قبل اس کا مفہوم ''احسان فراموشی'' یا ''کسی شے کا انکار یا رد کرنا'' لیا جاتا تھا۔ (یعنی کوئی مہربانی یا تحفہ) میری رائے میں اسد کی تشریح اس اصطلاح کے زیادہ عام فہم معنوں کے قریب تر آ جاتی ہے اور قرآن میں بھی اس کا استعمال اسی طرح ہوا ہے۔ بدقسمتی سے قرآن کی بہت سی اصطلاحات اور ترکیبات کے قریب ترین مترادفات انگریزی میں نہیں ملتے۔ توشی ہیکو نے اپنی کتاب ''گاڈ اینڈ مین ان دی قرآن'' میں اس فعل کا بہت خوبصورت اور دلچسپ تجزیہ کیا ہے۔

(۹۸) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۹۳:۴۸)

(۹۹) ایضاً (۶۱:۵۲)

(۱۰۰) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۵۶:۱۵۲)

(۱۰۱) ابوداؤد، السنن، جلد چہارم ص ۲۲۳، صحیح بخاری ترجمہ محمد محسن خان (۸۷:۶) العوا، پنشمنٹ ان اسلامک لاء، ص ۵۲

(۱۰۲) صحیح بخاری، ترجمہ محمد محسن خان (۸۸:۱)

(۱۰۳) علی، دی ریلیجن آف اسلام، ۵۹۶

(۱۰۴) العوا، پنشمنٹ ان اسلامک لاء، ص ۵۲۔۵۳

Marfat.com

پانچواں باب

اہل کتاب

وحی اور تاریخ: ایک تشریح

میں نے دوسرے باب میں لکھا ہے کہ قرآن میں دیئے گئے ان بہت سے حوالوں سے انسان فوری طور پر حیران ہوتا ہے جو انجیل میں مذکور پیغمبروں کے بارے میں ہیں۔ ایک مناظرے کے دوران جو جمال بدوی اور عنیس شوروش کے درمیان تھا، میں نے دیکھا کہ عنیس شوروش یہ کہہ رہا ہے کہ قرآن کی ستر فیصد آیات یہود و کرسچین تصورات ونظریات کے متعلق ہیں۔ حالانکہ یہ مبالغہ آمیز بیان ہے، جب تک کہ وہ اس میں ایک خدا کو ماننے والے تمام عقائد کے مشترک نظریات کو شامل نہ کرلے، اس کے بیان میں معقول حد تک سچائی نہیں مل سکتی۔ یقیناً بائبل میں مذکور پیغمبروں کی کہانیاں، یہود و کرسچین روایات میں سے لی گئی داستانیں اور یہودیوں اور عیسائیوں کی تنقید قرآن میں دیئے گئے دوسرے مذاہب کے مباحث پر غالب ہیں۔ مستشرقین قدرتی طور پر متشکک تھے اور انہوں نے محمد ﷺ پر یہ الزام لگایا ہے کہ آپؐ نے یہودی اور نصرانی ماخذ سے چیزیں مستعار لی ہیں۔ قرآن میں دی گئیں مماثلات کے بارے میں حوالہ دیا جاتا ہے کہ یہ انجیل، تلمود (یہودیوں کی فقہ کی کتاب) تلمودی تبصروں، باطنی علم کے حامل نصرانیوں کی جعلی اناجیل اور قدیم نصرانی اور یہودی مکاتیب اور شاعری سے لی گئی ہیں۔(۱) ان میں سے بہت سی مماثلات کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ بہت ہی سطحی مماثلتیں ہیں جو کوئی بھی دو مذاہب کے درمیان مل سکتی ہیں لیکن جہاں کہیں معقول مماثلتیں ہیں

Marfat.com

بھی تو ان ماخذ کا ابہام اور جداگانہ رنگ متشککین کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ محمد ﷺ نے اگر واقعی کچھ مستعار لیا ہوتا تو وہ بہت کچھ لیتے، یہودیت اور نصرانیت میں محض ایک سطحی سی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے جن پر انہوں نے پوری دسترس حاصل کر لی تھی یا جن سے وہ کم از کم واقف ہو گئے تھے، بے حد وحساب معلومات ایسی تھیں، جو بظاہر آپ کے پیروکاروں کے علم میں نہ تھیں اور جن تک عام حالات میں صرف ماہرین کو رسائی حاصل ہوتی ہے۔

بے شک ایک دوسری صورت بھی ہے: حجاز میں اس وقت زیادہ قابل ذکر یہودی اور نصرانی علم وفضل کا چرچا تھا، ایسا اس سے پہلے کبھی نہ تھا، عرب ثقافت نے اس کی زیادہ روایات کو موزوں بنا لیا تھا۔ قرآن اسے تسلیم نہیں کرتا کہ انجیل کی داستانوں سے عربوں کی معمولی سی بھی شناسائی ہو سکتی ہے لیکن اس سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ورثہ میں حصہ ہے۔ سالانہ تجارتی میلوں میں اہل مکہ نے یہودی اور نصرانی سوداگروں کی بیان کردہ کہانیوں میں عارضی دلچسپی کا اظہار ضرور کیا ہوگا لیکن اس سے زیادہ نہیں جس کا ثبوت اسلامی عہد سے قبل کی شاعری میں ملتا ہے جہاں انجیل میں مذکور شخصیات کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے دو سو سال بعد تک مسلم مفسرین یہود و نصرانی ماخذ (یعنی اسرائیلیات) کے جزیرہ نما عرب سے باہر دیکھنے پر مجبور تھے تاکہ متشابہہ قرآنی تحریروں کی تشریح کر سکیں۔ اس سے نہ صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حجاز کے عرب یہودی اور نصرانی روایات سے بڑی حد تک ناواقف تھے بلکہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس موضوع پر بہت کم اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس مشاہدے سے اس معمے میں صرف اضافہ ہوتا ہے جو قرآن میں انجیلی اشاروں کنایوں کی شکل میں شامل نظر آتا ہے۔ متشککین اب تک کوئی بھی قابل اطمینان بات پیش نہیں کر سکے جس سے یہ ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ کے علم کے ماخذ کی بنیاد یہود و نصاریٰ کی روایات پر ہے اور قرآن میں جگہ جگہ یہی استعمال ہوا ہے۔

اس بات کو ایک مسلمہ سچائی کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد عرب کو بت پرستی سے نجات دلانا تھا اور یہودیوں اور نصرانیوں کے چند ایک حوالوں کے سوا تمام آیات قرآنی جس اصل جنگ سے متعلق ہیں وہ کفار کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ہے۔ خود قرآن میں بھی کفار کے اصل اعتقادات اور اعمال کے بارے میں بہت کم واضح حوالے ملتے

Marfat.com

ہیں۔ مثلاً بت پرستوں کے خداؤں کے ناموں کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے۔ (۵۳:۱۹) یہ بات بالکل قدرتی معلوم ہوتی ہے کہ وہ شخص جو ایک دشمن کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہو وہ فوری خطرے کے خلاف اپنے تمام ذرائع استعمال کرے گا۔ لیکن مکہ میں ابتدائی سالوں سے، مدینہ کے یہودیوں سے چھ سالہ تصادم سے بہت پہلے اور اس دھمکی کے ختم ہوجانے کے بعد بھی یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایت قرآن کے دوسرے عقائد پر حملے میں اصل ہدف ہونی چاہئے تھی۔

اس بات کا احساس بھی ہونا چاہئے کہ اس خطے میں دوسرے بڑے مذہبی اثرات بھی موجود تھے۔ محمد ﷺ کی زندگی میں ایران کو عرب میں مضبوط ترین سیاسی قوت کی حیثیت حاصل تھی اور حجاز کے ہندوستان کے ساتھ بہت گہرے اقتصادی و تجارتی مراسم تھے اس لئے قرآن میں اہل فارس کے قدیم مذہبی نظام، ہندومت اور بدھ مت پر جائز طور پر کچھ تنقید ہونی چاہئے تھی۔ بیشک یہودی نظیر پر ایک سخت نظریہ توحید کی بنیاد تعمیر کرنا زیادہ آسان ہوگا لیکن اس کا اطلاق نصرانیت یا عیسائیت پر نہیں ہوتا۔ سیاسی تناظر سے کون پیش بینی کرسکتا تھا خصوصاً آنحضرت ﷺ کے مشن کے ابتدائی برسوں میں کہ ایران نہیں روم اسلامی دنیا کا آخری ناقابل شکست حریف ہوگا؟

تاریخ خود ہمیں بتاتی ہے کہ صرف مغربی نصرانیت سے اس اسلامی دنیا کو مسلسل خطرہ لاحق ہے جو پوری دنیا پر غالب آسکتی ہے۔ ایران اور شمالی افریقہ کی اچانک فتح نے محمد ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اسلامی سلطنت کو نمایاں مادی اور عقلی دولت سے مالا مال کردیا تھا اور یہ بہت جلد مشرق میں ہندوستان کے راستے چین تک نفوذ کرجانے والی تھی۔ مسلم فاتحین بارہا یورپ کو مار بھگانے کے قریب پہنچ چکے تھے مگر فی الحقیقت ایسا ہو نہ سکا اور آخرکار یورپ تقریباً مکمل شکست و پسپائی سے ابھرا اور اس نے اسلامی دنیا کو چیلنج کردیا جیسا کہ یہ آج بھی اسلامی اور مغربی ثقافتوں کے مرکزی تصادم میں چیلنج دے رہا ہے۔ اسے آپ محض حسن اتفاق کہیے حضرت محمد ﷺ کی ذہانت و فطانت سمجھئے یا آپؐ کی غیر معمولی دانائی کہ قرآن جو اہمیت یہودیت اور نصرایت کو دیتا ہے اس سے تاریخی حقائق کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں۔

اگر مسلمانوں نے یورپ کو فتح کرلیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ انہیں پوری دنیا پر غلبہ

Marfat.com

حاصل ہو گیا ہوتا اور انہیں اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہوتی کہ وہ اپنے مذہب کی اصل طاقت کو ازسرنو حاصل کریں اور اسے اس میں شامل ہو جانے والی ثقافتی افزودگی سے پاک و صاف کریں، جیسا کہ وہ آج کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کے معاشرتی مقام و مرتبے کے بارے میں ازسرنو جائزہ لینے کی ضرورت یا غلامی کے دستور پر اشتعال اور برانگیختگی کا اظہار کیا گیا تھا اور اسلامی دنیا کا یہ معرکہ اس مغربی دنیا کے ساتھ تھا جس نے خود ایسی اصلاحات حال ہی میں کی تھیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان معاملات کے بارے میں اصلاحات کو ثقافتوں کے اس طرح گڈ مڈ ہوئے بغیر سمجھنا ناممکن تھا، اس لئے کہ مغربی تجربہ مختلف استدلال پیش کرتا ہے لیکن فوری تبدیلی کے لئے یہ عمل حیرت انگیز ثابت ہوا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ چند مشہور مغربی اسلامیان، مثلاً گب اور واٹ نے اس مڈھ بھیڑ میں مغربی دنیا کیلئے ایک ایسا موقعہ دیکھا ہے جس سے وہ کھوئی ہوئی روحانیت واپس حاصل کر سکتی ہے، یہ موقعہ بہت دھندلا جاتا اگر مسلم معاشرے نے مکمل طور پر وہ مغربی اقدار اور ثقافت اپنا لی ہوتی جو استعماریت کے ساتھ آئی تھیں۔ (۲) ان کے ذہن میں جو بات تھی وہ یہ نہیں تھی کہ مغرب میں لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے بلکہ دونوں مذاہب کے درمیان مکالمے کے ذریعے ان کے اپنے اپنے مذہبی حلقے میں حیات نو اور اصلاح کے ایک نئے مرحلے کی آمد کی توقع ہو سکتی تھی۔

مختلف وجوہ کی بنیاد پر تقریباً ''ماہرین'' اس بات پر متفق ہیں کہ انسانیت ایک بڑے نازک موڑ پر پہنچ چکی ہے: جس میں اسلامی معاشرہ مغربی معاشرے کے ساتھ متصادم ہے۔ دونوں جانب سے وہ لوگ موجود ہیں جن کے خیال میں مستقبل میں انسانیت کی نجات یا تباہی درمیان میں لٹکی ہوئی ہے۔ اب تک یہ مڈھ بھیڑ اصولاً مذہبی نوعیت کی نہیں تھی۔ لیکن مذہب اس میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور ادا کرتا رہے گا، یہ ایک ملاپ ہے جس کا تصور قرآن یوں پیش کرتا ہے: یہ مسلمانوں اور اہل کتاب کا (یعنی یہود و نصاریٰ) ملاپ ہے اور انجیل میں دیئے گئے پیغمبروں کا ملاپ اور یوں یہودیت ایک مسلمہ مشترکہ بنیاد بنتی ہے۔

Marfat.com

اہل کتاب

مسلمانوں کے طاقتور دشمنوں میں یہودی اور بت پرست شمار ہوتے ہیں اور ان سے محبت کرنے والے اور ان کے قریب ترین میں ان کا شمار ہوتا ہے جو کہتے ہیں: ''ہم عیسائی ہیں۔'' اس لئے کہ ان میں ایسے لوگ ہیں جو اپنی زندگی علم حاصل کرنے کیلئے وقف کر چکے ہیں یا دنیا ترک کر چکے ہیں اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے۔ اور یہ لوگ جب اس کلام کو سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور وہ بول اٹھتے ہیں: ''پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں یں لکھ لے''۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ''آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آتا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں مں شامل کرے۔'' ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کیلئے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا، تو وہ جہنم کے مستحق ہیں'' (۵: ۸۲۔۸۶)

قرآن میں یہود و نصاریٰ دونوں کو مجموعی طور پر اہل کتاب (یعنی حاملین کتاب) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان دونوں مذاہب کی بنیاد آسمانی صحیفوں پر رکھی گئی ہے، یہ عرف عام اسلام میں بیک وقت ان کے غیر معمولی اور ممتاز مقام و مرتبے کی تصدیق کرتا ہے۔ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان ان کی حیثیت بڑی مشکوک اور غیر واضح ہے۔ مثال کے طور پر شادی بیاہ اور نظام غذا سے متعلق غیر مسلموں پر عائد کئی پابندیاں ایسی ہیں جن کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر نہیں ہوتا۔ (۵:۶)

قرآن میں کئی مقامات پر یہودیت اور نصرانیت کو ایک معقول قدر و منزل دی گئی ہے (۲: ۶۲، ۳: ۱۱۳۔۱۱۵، ۵: ۷۲، ۲۲: ۱۷) اور مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب کو

Marfat.com

مکالمے کی دعوت دیں جس میں وہ ان کے ساتھ نہایت شائستگی اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئیں۔ (۱۶: ۱۲۵، ۲۹: ۴۶) قرآن میں عہد نامہ جدید و قدیم کی شخصیات کے بہت سے حوالے ملتے ہیں اوراس میں شامل بہت سے قصص کی نظائر انجیل اور دوسرے قدیم یہود ونصرانی ماخذ میں ملتی ہیں۔ (۳) مزید یہ کہ قرآن میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ یہ آخری آسمانی کتاب گذشتہ دونوں آسمانی صحیفوں کے بنیادی پیغام کی تصدیق وتوثیق کرتی ہے۔(۲: ۸۹،۳: ۸۱) ان کی تحقیق وتفتیش کی دعوت دیتی ہے تاکہ خاص خاص تفصیلات کی تائید ہوسکے۔ (۳: ۹۳،۱۰: ۹۴) اور کچھ باتوں کی اصلاح کرتی ہے (۵: ۱۶۔۱۷) اور کئی اور دوسرے نکات پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے (۳: ۴۴، ۵: ۳۰۔۳۴، ۲۸: ۴۴) قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سابقہ تمام پیغمبروں نے خصوصاً جن کا ذکر یہود ونصاریٰ کی روایات سے لیا گیا ہے ایک جیسی سچائی اور حق کی تعلیم دی، اس لئے یہ یہودیت اور نصرانیت کو منہا نہیں کرتا بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان پیغمبروں کی اصل تعلیمات سال ہا سال گزر جانے کے بعد ابتدائی دوسرے مذاہب کے ساتھ ملنے سے مسخ کردی گئیں تھیں چنانچہ قرآن نے آگے آکر ان کی پاک وصاف اور حقیقی تعلیمات کو بحال کیا۔ مگر یہود ونصاریٰ کے ساتھ قرآن کا رویہ ہمیشہ موافق اور خوشگوار نہیں رہا۔ ایک بات جس کی توقع کی جاسکتی تھی، عرب اور گردونواح میں بسنے والے دونوں مذاہب کی طرف سے مخالفت ہوئی، البتہ یہود ونصاریٰ نے زیادہ مخالفت کی۔ اس تصادم کا انکشاف بہت سی آیات میں ہوتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب جب تک اپنے مذہب پر کاربند رہیں گے وہ مسلمانوں کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتے (۲: ۱۲۰) وہ مسلمانوں کے خلاف اکثر بت پرستوں اور کفار کا ساتھ دیتے ہیں۔ (۲: ۱۰۵،۵: ۸۳،۳۳: ۲۶) اور مسلمانوں کو چوکس کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں اپنے حلیف یا اتحادی کبھی نہ سمجھیں۔ (۵: ۵۴،۶۰) ان میں سے بہت سے ''کافرون'' (سچائی اور حق کو جھٹلانے والے) ہیں (۹۸: ۱،۶) بیشک دوسرے بہت مخلص اور قابل بھروسہ ہیں (۳: ۷۵،۱۱۳۔۱۱۴) بہت سے تو بدترین مخلوق میں شامل ہیں (۹۸: ۶) جبکہ دوسرے بہترین مخلوق میں سے ہیں (۹۸: ۷) غزوہ تبوک سے قبل مسلمانوں کو

ہدایت کی جاتی ہے کہ اہلِ کتاب کے خلاف جنگ کریں یہاں تک کہ وہ جزیہ دینے لگیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ بیشک قرآن سابقہ مذاہب کی روایت کے ساتھ اسلام کے رشتہ وتعلق پر زور دیتا ہے اس لئے بہت جلد یہ بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلم برادری کو اہل کتاب سے ایک فاصلے پر رکھا جائے تاکہ یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ اسلام، یہودیت ونصرانیت کی کوئی شاخ ہے یا کفر والحاد کی۔ اسی لئے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے حوالے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی ظاہری شکل وصورت، رویے اور عمل کے معاملات میں امتیاز برقرار رکھیں۔ قرآن پاک کی وہ آیات جن میں حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے بارے میں انکار پایا جاتا ہے (۴: ۱۵۷) اور قبلہ کے یروشلم سے مکے کی طرف تبدیل کرنے کا ذکر ہے (۲: ۱۴۲) بالکل واضح حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہت سے عذر خواہ مسلمان بڑے تجسّس کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دو آیات اہل کتاب سے بڑی حد تک تعلقات منقطع کر لینے سے منسوب نہیں تھیں تاکہ سابقہ مستشرقین کے اس دعویٰ کا توڑ پیش کیا جا سکے کہ آنحضرت ﷺ جب اپنی رسالت کے بارے میں مدینہ کے یہود و نصاریٰ کو یقین دہانی نہ کرا سکے تو یہ آپؐ کی اپنی اختراع تھی لیکن اس دعویٰ کو اس بات سے انکار کئے بغیر رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات اسلام کو بطور ایک آزاد اصلاحی اور مخصوص مذہبی تحریک کے طور پر تشکیل دینے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن خود آیت (۲: ۱۴۳-۱۴۵) میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس طرح کے واضح اور صاف صاف انحراف نئی مسلم برادری کی مختصر تعداد کے پیش نظر اپنے دو پیش رو مذاہب سے بہت ضروری تھے۔

قرآن یہودیت اور نصرانیت کے چند اصولی اور عملی پہلوؤں کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ ان دونوں مذاہب میں اہل کلیسا کو جو اہمیت دی جاتی ہے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے (۹: ۳۱) جنہیں یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ انہیں ایک خاص امتیاز اور اختصاص حاصل ہے (۲: ۱۱۱، ۱۳۵) اور اپنے مذاہب میں انہوں نے جو غلو کیا ہے اس کو بھی ناپسندیدگی سے دیکھا

ہے۔(۴:۱۷۱، ۵: ۸۰) جیسا کہ عیسائیت میں رہبانیت ہے (۵۷: ۲۷) اور جیسا کہ حضرت محمد ﷺ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے ''جائز اور مباع باتوں کو غیر قانونی اور ناجائز ٹھہرایا۔'' (۴) قرآن کئی نظریاتی اور اعتقادی بیانات کی سختی سے مذمت کرتا ہے یہود و نصاریٰ جو ''خدا کا بیٹا'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں قرآن اسے رد کردیتا ہے مثال کے طور پر قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے'' (۹: ۳۰)

اس سے عیسائیت الگ ہوجاتی ہے خاص طور پر تثلیث کے نظریے کو اپنانے کی بنیاد پر۔

''نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آجاؤ یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔'' (۴: ۱۷۱)

اور عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو مسیحیت کے بہت سے بڑے بڑے فرقوں نے خدا بنا کر ان کی پرستش شروع کردی تھی، ان کے اس فعل کے خلاف قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

''غرض جب اللہ (یہ احسانات یاد دلا کر) فرمائے گا کہ ''اے عیسیٰؑ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟'' تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا۔ اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔'' (۵: ۱۱۶)

بہت سے معاصر مسیحی مذہبی سکالر اس بات پر متفق ہیں کہ ''خدا کا بیٹا'' ایک علامتی

اصطلاح ہے اور تثلیث کا نظریہ تو ان تین ذرائع کے بارے میں کچھ بتاتا ہے جس سے خدا اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کرتا ہے اور ہماری دنیوی زندگی میں خدا کا جو عمل دخل ہے اس بارے میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے ان دنوں مسیحی نقادان اسلام میں یہ عام بات ہے کہ وہ ان مذکورہ آیات قرآنی کی بے قدری یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ محمد ﷺ خدا کے بیٹے اور تثلیث کے تصورات کی نزاکت کو سمجھتے ہی نہ تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ تثلیث کے تینوں وجودوں کی پیچیدگی سے واقف ہی نہ تھے اور خدا کے بیٹے کی علامت میں جو متصوفانہ اصول اپنے تمام تر الجھاؤ کے ساتھ شامل تھا آپؐ اس سے بھی ناواقف تھے اور حضور نے تو غلطی سے مریم کو تثلیث میں شامل تین نفوس میں سے ایک سمجھ لیا تھا۔ ایسا بھی عین ممکن ہے اس لئے ہو کہ پیغمبر ﷺ خدا کا رمزیہ عقائد کے بارے میں ذاتی علم بہت کم تھا۔ مگر یہ نتائج تو ان کے لگائے گئے محض اندازوں پر مبنی ہیں اور انہیں قرآن کی رو سے ثابت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

متن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کے لئے جو مسئلہ اہم ٹھہرتا ہے وہ اس کٹر مذہبی عقیدے پر مبنی بیانات کا استعمال ہے جنہیں بڑی آسانی کے ساتھ غلط سمجھا جاتا ہے اور جو صحیح راستے سے ہٹا دیتے ہیں اس میں کسی کے خاص علم سے کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کا اصل مسئلہ الفاظ کے استعمال سے وابستہ ہے یہ زور دیتا ہے کہ ''یہودیوں کا کہنا ہے کہ'' ''عیسائی کہتے ہیں'' اور ''یہ مت کہو'' مندرجہ بالا آیات میں کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ ترکیبات بت پرستی کی ''نقل'' کرتے ہیں اور بہتر ہوگا کہ اس قسم کی زبان استعمال نہ کی جائے۔ حالانکہ دونوں مذاہب ''خدا کا بیٹا'' کی ترکیب مختلف مفہوم میں استعمال کرتے ہیں لیکن انہیں ان الفاظ میں چھپے خطرات سے چوکنا کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ''وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں'' کی جگہ ''وہ کہتے ہیں'' کبھی استعمال نہیں کرتا۔ ان حوالوں میں قرآن استدلال کرتا ہے کہ اس بارے میں لوگوں میں اس بات کا علمی شعور ہونا چاہئے کہ علامات تو مذہبی تشریحات کے ایک وسیع دائرے کی جانب جانے والے راستے کو کھولتی ہیں۔ ہمیں قرآن میں وہ آیات بھی مل جاتی ہیں جن میں اس بات کا ذکر بھی شامل ہے کہ کچھ عیسائی اور یہودی اللہ

Marfat.com

پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن یہاں بنیادی مذہبی اصولوں کو زیادہ اہم نہیں سمجھتا بلکہ ایک عام انسان پر ان بیانات سے اثر کیا پڑتا ہے یہ اسے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ان ترکیبات کے استعمال کے نتیجے میں یا اس اسلوب کی وجہ سے ایک اوسط درجے کا یہودی تو ضرور سمجھنے لگتا ہے کہ صرف یہودی ہی اللہ کے چہیتے ہیں (۵: ۲۰) اور ایک عیسائی بڑی آسانی کے ساتھ ان نظریاتی بیانات کو غلط معنی پہنا کر یہ سمجھنے لگے گا کہ حضرت عیسیٰؑ خدا ہیں یا خدا کا بیٹا ہیں اور یہ کہ عیسیٰؑ اور ان کی ماں دونوں پرستش کے لائق ہونے چاہئیں۔ آج بھی اگر آپ کسی عیسائی سے یہ سوال پوچھیں کہ کیا عیسیٰؑ خدا ہیں یا خدا کا بیٹا ہیں اور یہ کہ عیسیٰؑ اور ان کی ماں دونوں پرستش کے لائق ہونے چاہئیں تو اس بات کا پورا پورا امکان موجود ہے کہ اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ کیتھولکوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کہیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ، حضرت مریم کی بھی پرستش کی جانی چاہئے۔ پس (۵: ۱۱۹) میں تثلیث کا حوالہ نہیں ہے بلکہ اس میں تو ایک بہت بڑے حقیقی خطرے سے باخبر کیا گیا ہے۔ قرآن میں خود جو حوالے عیسیٰؑ کے بارے میں آئے ہیں، ان میں انہیں ''ایک مسیحا (نجات دہندہ)'' ''ایک روح'' اور ''ایک کلمہ'' خدا کی طرف سے، بتایا گیا ہے جو درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہی مسیحی تشریحات قابل قبول تو ہیں لیکن یہ صرف عیسیٰؑ کے لئے استعمال نہیں کی جاسکتیں۔

قرآن میں یہود و نصاریٰ کا ذکر صرف معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے یا ان کی سرزنش کرنے کیلئے نہیں ہے۔ یہ تو ان انسانی رویوں اور رجحانات اور کمزوریوں کی تصویر کشی کرتا ہے جو کسی بھی مذہب کے لوگوں کی عبادت کی پاکیزگی کی جڑیں کاٹتا ہے اور اس بات کی وضاحت بھی پیش کرتا ہے کہ پیغمبرانہ منصب کیوں ختم کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے یہی کچھ کہہ دینا کافی ہوگا کہ مسلم سکالرز نے بار بار اس بات پر تنقید کی ہے کہ ایمان والوں نے بھی وہ غلطیاں کیں جو ان کے پیشرو کرتے آئے تھے۔ بارسلونا کے ابن حزم نے شکایت کی کہ تقلید کی رسم (ابتدائی تین اسلامی صدیوں کے دوران طے پانے والے عالمانہ فیصلوں کو بے چوں و چرا، آنکھ بند کر کے قبول کر لینا) تو اس کی واضح نقل ہے:

Marfat.com

''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔''

(۳۱:۹)

آج بھی ایسے مسلمان موجود ہیں جو اولیائے کرام کے مزارات پر جا کر منتیں مانگتے ہیں اور ان کی مدد کے خواستگار ہوتے ہیں اور بہت سے مسلمان اسی دعویٰ کو دہراتے ہیں کہ اللہ کا رحم وکرم اور اس کی بخشش تو صرف مسلمانوں کیلئے ہے۔

دوسرے مسئلہ پر اگر یہ سوال کیا جاتا ہے: ''نبی الزماں ﷺ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' آنحضرت ﷺ کو آخری نبی کے طور پر کیوں بھیجا گیا؟ ابتدائی دور کے مسلمانوں کیلئے یہ سوال نظریات کے اس اختلاف تک پھیلا ہوا تھا جو محمد ﷺ کی قیادت و رہنمائی کو اس موجودہ فاسد نظام سے جدا کرتا تھا جس کی ان پر حکمرانی تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اسے جلد ہی اللہ کے عدل و انصاف اور رحم و کرم کے سوال کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا کیونکہ پوری تاریخ میں خدا براہ راست انسان کی رہبری و رہنمائی کیوں کرتا۔ پھر اس نے انسان کو اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا کہ وہ اس دنیا کے فنا ہونے تک ایسا ہی رہے؟ اس کے دو جوابات ہیں۔ اور بھی بہت سے جوابات ایسے تھے جو تشکیل دیئے گئے تھے اور آج تک امت مسلمہ کے دو بڑے گروہوں یا فرقوں میں موجود ہیں: یعنی سنی اور شیعہ۔ ان پر تبصرہ کرنے کے بجائے ہم ایک نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جو مخالفانہ نہیں ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے صحیح عقیدہ، خدا کو ایک ماننے کا ہے یعنی توحید۔ اس کا منطقی نتیجہ، جو ایک بڑا اور اہم اسلامی عقیدہ ہے وہ ہے وحدت انسانی کا اساسی تصور۔ توحید کی بنیاد پر قائم ہر مذہب کو ان دونوں کے ساتھ رشتہ و تعلق استوار کر لینا چاہئے جو کاروبار حیات سے ہمیشہ بڑی حد تک ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اسرائیل کے بچوں کی کہانی ایک ایسی قوم کی کہانی ہے جو اپنی تاریخ کے زیادہ عرصے کے دوران بے مثال طور پر خدا کی وحدانیت کی قائل رہی ہے مگر وہ بھی آج ایک ایسے معاشرے میں زندہ ہے جو بت پرستی کے زیر اثر ہے۔ ان اثرات کے باہر

جو بڑی تیزی کے ساتھ ان کے مذہب میں نفوذ کر رہے ہیں انہیں ان پیغمبروں کی تعلیمات سے کبھی کبھی متزلزل کر دیتے ہیں۔ قرآن میں ان کا ذکر ایک ایسی قوم کی حیثیت سے کیا گیا ہے جو خالص وحدانیت اور الحاد و بت پرستی کے دباؤ کے درمیان مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے۔ جو جزوی طور پر ان کی اس ضروریات کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے معاشرتی و سماجی گرد و پیش سے کس طرح جدا کریں اور ان کی نسلی اور ثقافتی پاکیزگی کو محفوظ کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کی کوشش کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ خدا کے منتخب اور چہیتے لوگ ہیں اور باقی لوگ ان میں شامل نہیں اور عہد نامہ قدیم کی زبان و اسلوب کی رو سے یہ خدا کے بیٹے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اللہ کے آخری پیغمبر کو کبھی تسلیم نہیں کیا، اس لئے کہ آپ غیر یہودی نسب سے تھے۔ حالانکہ آپ نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ وحی کے بنیادی پیغام کے وہ مالک تھے۔ اس بارے میں ان کے انکار پر قرآن انہیں بار بار قصوروار ٹھہراتا ہے۔ مختصر یہ کہ بیشک یہودیت ایک خدا پر ایمان کے تصور کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئی لیکن خدا کی حاکمیت میں وحدت انسانی کے تصور کو قبول کر لینے کے قابل نہ تھی۔

نصرانیت کا منبع بھی وہی انجیل کے ماخذ ہیں لیکن یہودیت کے برعکس یہ ایک عالمی مذہب ہے اس کا باہمی ربط ایک شدید روحانی آرزو سے حاصل ہوتا ہے، کہ خدا کو پہچانا جائے اور خدا کی محبت حاصل کی جائے۔ پس جب جزیرہ نما عرب کے یہودی اور بت پرست ایک ایسے پیغام سے خودسری کا مظاہرہ کر رہے تھے جو ان کی روایات سے نکل چکا تھا، عیسائیوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ اس پیغام کی روحانی قوت سے زیادہ آسانی کے ساتھ متاثر ہو رہے تھے۔ (۴: ۸۵۔۸۹) وہ مشکل جس کا سامنا عالمی مذاہب کو کرنا پڑتا ہے وہ ان لوگوں کی عدم مشابہت ہے جو یہ مذہب اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے ساتھ ایسی زبانیں، تصورات، علامات اور اپنی اپنی تہذیبی و تمدنی رسومات لاتے ہیں جو اصل مذہب کو امکانی طور پر مسخ کر دیتی ہیں۔

Marfat.com

مسلمانوں کے نقطہ نظر سے عیسائیت کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ حالانکہ یہ پوری بنی نوع انسان کو قبول کر لیتی ہے مگر عقائد کے لحاظ سے خالص وحدانیت کے ساتھ مصالحت کرتی ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ دوسروں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اس طرح یہود و نصرانی تجربہ اس پریشان کن صورتحال کی نظیر پیش کرتا ہے جس سے دنیا بھر کے بڑے مذاہب دوچار ہیں: وحدانیت یا عالمگیریت میں سے ایک یا دوسرے کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں ان کے ساتھ یکساں طور پر مفاہمت کر لی گئی تھی۔

اسلام نے بھی اس اندرونی کھچاؤ کے مقابلے میں جدوجہد کی اور آج بھی کر رہا ہے اور توحید کے دونوں مضمرات کو بچانے کیلئے انتہائی اقدامات اصل یا مقبول رجحان کی طرف سے کئے جائیں گے۔ فلسفیانہ اور متصوفانہ قیاس آرائیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو مذہبی قوانین کے پابند نظام کر دیا گیا تھا۔ بے شک مختلف قسم کے دباؤ مسلسل سر اٹھاتے رہے لیکن زیادہ حصہ کیلئے اسلامی رجعت پسندی اسلام کے بڑے دھارے کے اہم ذرائع تصورات کو مجمد کر دینے میں کامیاب ہوئی، جو ایک معطل شدہ جوش و جذبے میں محفوظ کر لی گئی تھی۔ جو آخر کار صحیح و سالم حالت میں جدید دور کے انسان کو منتقل کر دیا جائے گا۔ ان ابتدائی دور کے علماء نے جو انتہائی اقدام اٹھائے اس کی جو بھی قیمت اسلامی تہذیب و تمدن کو ادا کرنی پڑی، توحید کے دو بڑے عناصر (اللہ کی وحدانیت اور وحدت انسانی) اسلام میں یکجا ہو گئے تھے اور پھر انہیں مستقبل کی نسلوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کیلئے یہ ایک مثال ہے کہ اسلام کے ذریعے خدا نے بنی نوع انسان کیلئے اپنی نعمت تمام کر دی (۵:۳)

مسلم کرسچین مباحثہ

''اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔ اور ان سے کہو کہ ''ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری

طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔" (۲۹:۴۶)۔

"اے نبیؐ اپنے رب کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔" (۱۶:۱۲۵)

"افسوس ہے تم نقل نویسوں اور خود پسند و منافق انسانوں پر! تم ایک شخص کو تو عیسائی بنانے کے لئے پہاڑوں اور وادیوں میں سرگرداں رہتے ہو اور جب تم اسے عیسائی بنا لیتے ہو تو اس کا مسکن بھی تمہاری طرح جہنم بنتا ہے!" (بائبل، متی) (۲۳:۱۵)۵

یہ زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ مسلمان، عیسائیوں کے بجائے یہودیوں کے ساتھ مباحثہ کریں گے اس لئے کہ کم از کم یہودیت اور اسلام کے مذہبی اصولوں پر مبنی معاملات ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ تقریباً ساری بین المذاہب حالیہ گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کا ایک ممکنہ سبب تو عرب اسرائیل تصادم ہوسکتا ہے اور قرآن میں مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں جو معاندانہ رویہ پایا جاتا ہے اس سے بھی مسلمانوں کا میلان عیسائیوں کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی طرف لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مائل کرنے کے معاملے میں عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ اس لئے بھی کہ یہودیت کو چھوڑ کر یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کو اپنے لئے ایک خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ماضی میں یہودی سکالرز نے مقابلے پر آمادہ ان دونوں مذاہب کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کیا۔ پھر چند مشہور یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جن میں محمد اسد اور جمیلہ مریم قابل ذکر ہیں، ان دونوں نے اسلامی فکر میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ (۶) لیکن فلسطین کے مسئلے کی وجہ سے سیاسی فضاء نے موجودہ مسلم یہودی مباحثے کو محدود کر دیا ہے اور دونوں کے درمیان اس میں بھی براہ راست افہام و تفہیم کی راہیں مسدود ہوگئی ہیں۔ اس باب کے موجودہ اور آنے والے عنوانات اس قابل افسوس صورتحال پر روشنی ڈالتے ہیں۔

Marfat.com

مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرنا بہت آسان ہے تا کہ ایک قسم کی مذہبی جنگ کو ختم کیا جا سکے۔ کوئی ایسی شے جس میں ہم ذاتی طور پر ملوث ہیں اسے بڑھانے یا اس کا دفاع کرنے کیلئے استعمال کئے جانے والے پروپیگنڈے اور ہتھکنڈوں کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن یہ اکثر ہمیں دھوکہ وفریب اور بداعتمادی تک لے جاتا ہے اور یوں سچے دل سے افہام وتفہیم کے عمل کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ ہمارے دوسرے عزائم سے اجتماعی طور پر سچائی تک پہنچنے کی منزل دور ہو جاتی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں عیسائیوں کے انتقامی جذبے کی حمایت یورپی ممالک کرتے تھے اور یہ ایک طرح سے پوری دنیا پر تسلط قائم کرنے کے پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ جبر وتشدد اور دھوکہ فریب کی داستانیں ناقابل فراموش ہوگئی ہیں۔ مسلمانوں کو نسبتاً بہتر ہونا چاہئے تھا مگر یہ بھی قصوروار نکلے جیسا کہ برنابس کی نام نہاد انجیل سے ثابت ہوتا ہے جو بارہویں صدی کے مسلم اسپین میں ایک واضح جعل سازی کے ساتھ سامنے آئی اور جو آج بھی اسلامی دنیا میں بڑی حد تک پھیلی ہوئی ہے۔ صورتحال کافی حد تک بہتر ہوئی ہے کیونکہ ہم جس دور میں رہتے ہیں یہ زیادہ صبر وتحمل اور قوت برداشت کے مظاہرے کا دور ہے اور مغرب میں اسلام سے متعلق تحقیق چرچ اور ریاست سے آزاد ہوگئی ہے۔ منٹگمری واٹ اور کینتھ کریگ جیسے پادریوں کے غلبہ تسلط میں قابل تعریف حد تک غیر جانبداری، منصف مزاجی اور بصیرت افروزی دکھائی دیتی ہے۔ مسلم مصنفین نے عیسائیت کے لئے جتنی منصف مزاجی اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس بات کا صحیح صحیح جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ آپ کس قدر قریب سے جائزہ لے رہے ہیں اور آپ کہاں تک غیر جانبدار رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اس مباحثے میں عیسائیوں کی طرف سے بات کافی آگے تک بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ اسلامی فکر کو، یہ مسلمانوں کی طرف سے عیسائیت کو سمجھنے کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں۔ ماضی کی تمام رغبت اور تحریک سے قطع نظر اس علم وآگاہی کا حصول اس وقت بہت مفید ثابت ہوتا ہے جب اسے باہمی تناظر میں دیکھا جائے۔ وہ مسلمان جو یہ جانتے ہیں کہ وہ اس مباحثے سے خاطر خواہ نتائج حاصل کریں انہیں مسیحی فکر کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف انجیل کے مطالعہ سے بات

Marfat.com

نہیں بنتی نہ قدیم مذہبی مناظروں سے خیالات مستعار لے کر ثمر آور مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ مسیحی نقطہ نظر سے عیسائیت کا مطالعہ کریں اور فریقین کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہو گیا ہے کہ ہر روایت کے اندر اندر مذہبی تناظر میں تنوع اور تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

ایک دوسرے میں باہمی رضا مندی کا موجود ہونا ضروری ہے جس کی مدد سے دیکھا اور سکھایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ دونوں میں سے ہر کوئی دوسرے کے تجربات سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ عیسائی جدید عقلیت پسندی اور سیکولرزم سے زیادہ طویل عرصے تک دست و گریباں رہے ہیں۔ اور اپنے مذہب کی ترقی اور نشوونما میں انہیں سائنسی، تاریخی معلومات اور روایات اور داستانوں کے استعمال کے درمیان امتیاز کرنیکی ضرورت تھی۔ وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس کا اثر یقیناً مسلمانوں پر پڑے گا اس لئے کہ اسلامی اور مسیحی ماخذ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا مطالعہ احتیاط اور تنقیدی نظر سے کریں اور اس سیکولر دور کے ساتھ اچانک تصادم کے باوجود اسلام میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ جمہور مسلمانوں پر جن میں اسلامی دنیا کے دانشور لیڈروں کی ایک بھاری اکثریت بھی شامل ہے، اپنی گرفت قائم رکھ سکے۔ یہ ایمان والوں کے لئے ایک بڑھتی ہوئی میکانیاتی اور غیر شخصی دنیا میں مسلسل ایک روحانی پناہ گاہ مہیا کرتا ہے اور بڑے بڑے صنعتی شہروں میں اپنے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہے۔ اسلام کی تسلسل کے ساتھ قائم لچک اور ابھرنے کی قوت میں عیسائیوں کے سیکھنے کے لئے بڑے اہم سبق ہیں۔

اس موضوع کے ساتھ کچھ انصاف کرنے کیلئے زیادہ تفصیل اور بہت مہارت کی ضرورت ہوگی۔ میں نے حال ہی میں جو دو مباحثے سنے میں ان کے بارے میں اپنے چند تاثرات میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہوں گا۔ دراصل یہ مباحثہ دو حصوں میں ہوا۔ پہلے پروگرام کا عنوان تھا ''عیسیٰؑ خدا یا انسان؟'' اور دوسرے کا عنوان تھا ''اللہ کا کلام بائبل یا قرآن؟''۔ دونوں عنوانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس پروگرام کا اہتمام مسلم تنظیموں نے کیا تھا۔ مسلم اخبارات اور رسائل میں جو اعلانات شائع ہوئے ان سے اندازہ ہوا کہ امریکہ میں مسلمانوں میں یہ موضوعات بہت مقبول ہیں مگر شروع ہی میں وہ چند بنیادی باتوں کو مبہم بنا دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر مسیحی مذہبی عقائد کے علم کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عیسیٰؑ نہ خدا ہیں نہ انسان بلکہ ان میں دونوں فطرتیں جمع ہوگئی ہیں۔ عیسائیوں کے لئے بھی اصلی اور حقیقی وحی نہ قدیم عہد نامہ ہے نہ جدید بلکہ یسوع مسیح خود ہیں۔ بائبل کو اب زیادہ تر عیسائی علماء پاک و خالص کلام الٰہی نہیں سمجھتے۔ یہ کردار عیسیٰؑ کا ہے۔ لیکن اپنے الہامی اسلوب، تشریحات و تصریحات، تبصرے اور گواہی و شہادت کے لحاظ سے۔ عہد نامہ قدیم کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ یہ عیسیٰؑ کی آمد کی خبر دیتا ہے اور عہد نامہ جدید اس کی شہادت دیتا ہے اور اس کی تشریح کرتا ہے۔ مسیحی تناظر میں دیکھا جائے تو زیادہ موزوں تقابل بائبل اور قرآن کے بجائے عیسیٰؑ قرآن اور عہد نامہ جدید کا بنتا ہے۔ جس کی حدیث نبویؐ کے ساتھ بھی مماثلت و مشابہت بنتی ہے مثلاً ایک عنوان ''عیسائیت اور اسلام میں نزول وحی'' عیسائیوں کے نقطہ نظر سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

ایک عیسائی اس بات پر بحث کرسکتا ہے کہ جس طرح قرآن، کم از کم مسلمانوں کیلئے ایک ایسا ابدی کلام الٰہی ہے جسے کسی انسان نے تخلیق نہیں کیا اور جو ایک آسمانی صحیفے کے طور پر نازل ہوا اسی طرح عیسیٰؑ ایک ایسا ابدی، کلام الٰہی ہیں جسے کسی انسان نے تخلیق نہیں کیا بلکہ عیسیٰؑ کی انسانی ہستی کی صورت میں نازل ہوا۔ ان کے نظام عقائد میں عیسیٰؑ نے نہ صرف وحی کو زبانی پہنچایا بلکہ اس مقصد کے لئے ان کے ہر فعل، جذبے، کلام اور قوت محرکہ نے خدا کے لافانی کلام کا اظہار کیا اور بتایا۔ وحی مستند طور پر انسانی شکل میں تھی، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو مکمل طور پر ایک سچا انسان سمجھتے ہیں اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کلام الٰہی ان کی انسانی ہستی کے ذریعے ظاہر ہوا یہ بھی سچ ہے کہ وہ صفات ربانی کے حامل ہیں۔

بعض اوقات محمد ﷺ کی نبوت کی اسراریت کے بارے میں مسلمانوں کے قیاسات سے اسی قسم کے رجحانات سامنے آتے ہیں۔ قرآن کی حمایت اس بارے میں یوں حاصل ہوتی ہے: ''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا'' (۵۳: ۳) حالانکہ اس سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حوالہ نزول قرآن کے بارے میں ہے۔ لیکن اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ محمد ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور پھر آپ کا ہر فعل خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، آپ پر بنی نوع انسان کی رہنمائی کیلئے نازل ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت کے باوجود قرآن بار بار اس پر زور دیتا

Marfat.com

ہے، جو تنبیہ بھی کرتا ہے اور معلم بھی ہے۔ یعنی اللہ نے آپ ؐ کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ (۲۵:۵۶، ۲۷:۹۱-۹۲) اس کے نتیجے میں محمد ﷺ کی نہایت معمولی معمولی عادات کی نقل اور پیروی پر بھی بہت سے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اعلیٰ روحانی اجر اور انعامات ملتے ہیں۔ روایت پسندی اور کٹر پن، وحی اور اس ہستی کے درمیان جس پر وحی نازل ہوئی گہرے نظریاتی غور و فکر سے اجتناب کیا جاتا ہے لیکن کچھ پہلو ایسے ہیں جن میں مسلمان محمد ﷺ کی تعظیم و تکریم اور تقلید و پیروی کے قابل رشک جذبے میں آپ ؐ عیسائیوں سے عیسیٰؑ کو ملنے والی تعظیم و کریم سے سبقت لے جاتے ہیں۔ عیسائی اور مسلمان دونوں دیکھیں گے کہ عیسیٰؑ و قرآن اور عہد نامہ جدید اور حدیث کے درمیان مماثلت و مشابہت کے کئی پہلو بہت تشنہ ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کا اختصار ممکنہ حد تک مسیحی علم دین کے ارتقاء کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جو فلسفیانہ مشکلات زیر بحث آئی ہیں یہ ان پر روشنی نہیں ڈالتا۔ نہ ہی یہ ان مہلک نتائج کا ادراک کرتا ہے جو مسیحی مذہبی اصول و عقیدے کی تشکیل کے پیچھے کارفرما تھے۔ یہ عیسائیوں کے خدا کے بارے میں اس نظریے کو بھی پوری طرح پیش نہیں کرتا کہ وہ عیسیٰؑ میں وحی کی شکل میں آ کر بنی نوع انسان کی جدوجہد میں داخل ہوا۔ مسلمانوں کے اعتراضات ہوسکتا ہے زیادہ غیر استدلالی ہوں۔ ایک مسلمان یہ نقطہ نظر پیش کرے گا کہ مسلمان خدا، اس کے کلام اور آنحضرت ﷺ کی نبوت میں ایک قریبی ربط باہمی کو تسلیم کرتے ہیں مگر عیسائی وجود حیات کی مختلف سطحوں کو پیش کرتے ہیں جس طرح ایک مسلمان اللہ کی تخلیق کردہ کسی شے کی پرستش نہیں کرتا جس میں بے شک اللہ کا عکس ہی کیوں نہ نظر آتا ہو، حالانکہ انسان کی خدا تک رسائی ان میں سے ہر ایک کی وساطت سے ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس بات کی بھی مخالفت کرتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے جو معتبر وحی ہے اسے وہ سب تنقیدی نظر سے دیکھ سکتے ہیں لیکن عیسائیت میں ایسا نہیں، ایک عیسائی کو ثانوی ماخذ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ہم براہ راست عیسیٰؑ کی انسانی ہستی کو نہیں پرکھ سکتے ہیں لیکن ہم قرآن کو پرکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں اختیار ہے کہ ہم اسے تسلیم کرلیں یا رد کردیں۔ اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ فرض کرلیں کہ قرآن کا اب کوئی وجود نہیں مگر اس کے باوجود اس پر ایمان لانا پڑتا تھا کہ یہ الہامی کتاب ہے جس کی بنیاد احادیث نبویؐ اور بعد کی تحریروں پر تھی۔

Marfat.com

تثلیث کے مذہبی اعتقادات اور یسوع مسیح کا خدا کا بیٹا ہونا وحی نہیں ہیں اس لئے کہ یہ تمام مذہبی اعتقادات اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہ وہ اعلانات ہیں جو مستند مذہبی حلقوں کی طرف سے وقت گزرنے پر آتے رہے۔ ایک مذہبی اصول یا اعتقاد پر مبنی بیان ایک ایسی شے ہے جس تک پہنچنے کے بعد ایک ایسا فارمولا پیش کیا جاتا ہے جس کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جنہوں نے اسے تشکیل دیا ہو اور جس کے لئے ہر فرد کو یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اسے سمجھ سکے۔ حالانکہ ایک مذہبی اصول کسی مذہب کے لوگوں کیلئے حدود کا تعین کرتا ہے مگر ان لوگوں کے درمیان اس کی مختلف تشریح و تصریح کرنے کی کھلی اجازت ہوتی ہے۔ اسے صحیح صحیح بنظر تحسین دیکھنے کے لئے یا اس پر درست تبصرہ و تنقید کے لئے ایک شخص کو ماضی میں اس شعور و عقل اور سماجی ماحول میں جانا پڑے گا جس نے اسے جنم دیا تھا۔ عیسائیت کے معاملے میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ واپس ابتدائی صدیوں کے فلسطین، روم، اسکندریہ اور انطاکیہ میں جانا پڑے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان قدیم یونانی اور صیہونی کلچرز کا مطالعہ کرنا پڑے گا جنہوں نے اس پر اپنے اثرات چھوڑے، یونانی فلسفیوں کے تصورات اور ان کے اسلوب کے طریقے سیکھنے ہوں گے اور از سر نو ایفسیوس نیسے اور کالسیڈن کے مباحثوں میں داخل ہونا ہوگا۔

وہ ماحول جس میں عیسائیت نے جنم لیا وہ نمایاں طور پر اس ماحول سے مختلف تھا جس میں ظہور اسلام ہوا تھا۔ ابتدائی دور کے پادری ترقی یافتہ تہذیبوں کے ادغام کے وارث تھے۔ ابتدائی عہد کے مسلمانوں کے برعکس، ان پادریوں کو قومی حکومت اور قانون سازی سے سروکار کم تھا کیونکہ وہ تو ایک ایسے ماحول کے اندر جو مذہبی اور نظریاتی میلانات کے مقابلے کا ماحول تھا، ابھرتے ہوئے مذہب کی فلسفیانہ راستبازی کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ مذہبی علمیت سے اصولی طور پر، مسلمانوں کی مراد تھی قانون اور عیسائیوں کیلئے اس کا مطلب الہیات یا علم دین تھا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیاتی یا الہیاتی تحقیق بمشکل سانس لے رہی تھی لیکن مسلم قدامت پسند اس کی حوصلہ شکنی کررہے تھے اس لئے کہ ان کے خیال میں اس سے وحدانیت کو خطرہ درپیش تھا، خاص طور پر ایک ایسے عام مسلمان کی سطح پر جو منطق اور رمزیت کی نزاکت اور نکتہ رسی کا مقابلہ کرنے کیلئے علم سے لیس نہ تھا اسلام کافی حد تک قیاس آرائی کو قربان کر کے صحیح عبادت اور عمل کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف، نصرانیت کی تاریخ پر چرچ کونسلوں کا غلبہ رہا ہے جس

Marfat.com

میں نہایت گہرے اسرار الہیات کی بھی تشریح کرتے ہوئے ان پر بحث وتمحیص ہوئی جبکہ ایک مسلم سکالر ایک عام انسان کے بہت قریب رہا اور اس پر واضح کرتا رہا کہ ایک مومن کی زندگی میں رہبری و رہنمائی کے ایک جامع نظام کی اہمیت کیا ہے۔ مسیحی مذہبی علماء نے فلسفے کے پروں کی مدد سے ان بلندیوں کو جا چھوا تھا جہاں تک ایک عام انسان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ آج تک ایک مسلم سکالر اور ایک عام مسلمان کے علم دین میں زیادہ فرق نہیں ہے جبکہ عیسائی علمائے مذہب اور ایک عام عیسائی میں، باہر سے یوں لگتا ہے کہ بہت زیادہ فرق ہے۔

مسلم مدرسہ ہائے فکری مذہبی مسائل پر بحث کرتے رہے لیکن نہ تو ان کی کوئی مجلس کلیسا کی طرح کی کونسل تھی نہ ہی انہوں نے پادریوں جیسے اختیارات حاصل کر رکھے تھے لیکن بحث و مباحثے سے بڑے پیمانے پر تجسس پیدا ہوتا تھا اور کسی خاص مذہبی قانون کے تحت کچھ سزائیں دیجاتی تھیں۔ چند مذہبی اصول ناگزیر حد تک تشکیل پا گئے تھے اور انہیں محفوظ کر لیا گیا تھا جیسے: قرآن کا انسانی تخلیق نہ ہونا، کائنات کی تخلیق، تقدیر کا مذہبی تصور، قرآنی آیات کی منسوخی کا تصور اور العشری کا آمرانہ اصول ''بی لا کیف'' (یہ پوچھے بغیر کہ ایسا کیوں ہے) (۷)۔ مسلم سکالرز جو ان جھگڑوں میں پھنس گئے تھے انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وحدانیت کو ہر قیمت پر تحفظ دیا جائے۔ اس کے برعکس مسیحی علماء نے تہیہ کر لیا تھا کہ نہ صرف یہ کہ وحدانیت کا تحفظ کریں گے بلکہ اس نظریے اور اعتقاد کا بھی کہ خدا عیسیٰؑ کے روپ میں تاریخ کے اوراق میں داخل ہوا تا کہ بنی نوع انسان کو بچا لے۔ انہوں نے ایک ایسے پیچیدہ اور نازک مذہبی مسئلے کی تفصیلات بیان کیں جو منطقی لحاظ سے کسی طور پر بھی مبہم اور مضحکہ خیز نہیں ہے۔ ایسی رائے کسی ایسی نابغہ شخصیت کو کم اہمیت دیئے جانے کے مترادف ہے جو صدیوں پر مشتمل مسلسل غیر جانبدار اعلیٰ استدلال پیش کرنے میں مصروف رہی ہو۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ کیا ایک مکمل مربوط نظریاتی نظام تک بروقت رسائی حاصل ہوئی یا حاصل ہو سکے گی اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ منطقی طور پر ایک مربوط نظام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن یہ اس پیغام کے کس قدر قریب تر ہے، جس پیغام کی ابتداء تبلیغ واشاعت ہوئی اور یہ مسلمانوں کو ایک خدائے واحد کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کیلئے رہنمائی مہیا کرنے میں کس قدر مؤثر ثابت ہوا ہے یہی سوال کسی بھی مذہب کی ہر مطلق العنانہ تشکیل کے بارے میں پوچھا جانا چاہئے اور اس میں اسلام بھی شامل ہے۔

Marfat.com

ہم اکثر ایک ایسے مرحلے میں پہنچتے ہیں جب کوئی مذہبی اصول یا نظریہ اپنی ابتدائی شکل سے اس قدر دور ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ مفید مطلب اور برمحل نہیں رہتا، یا بہت مسخ ہو جاتا ہے اور غلط راہ پر ڈالنے لگتا ہے۔ اسے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی اپنی کوشش میں ہم اس شخص کی آواز بن جاتے ہیں جو ایک غلط بیان دیتا ہے اور پھر بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرے اپنے اصل مقولے پر اڑ جاتا ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتا ہے جو الفاظ کے قابل قبول معانی و مفہوم کے خلاف ہوتی ہے۔ جب صورتحال یہ ہو جائے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یا تو اسے بالکل مسترد کر دیا جائے یا اسے کسی جامع اور نئی صورتحال سے بدل دیا جائے؟ مسلم برادری کے اندر یہ اور اس سے متعلقہ سوالات مختلف ماخذ کے متن کی اختیاری اور جامع اصولی شکل اور سند سے متعلق پوچھے جاتے ہیں لیکن اس قدر تکرار اور تاکید کے ساتھ نہیں پوچھے جاتے جس قدر جدید دور کی عیسائیت میں پوچھے جاتے ہیں، جو آج کل ایک بحرانی شکل اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ جن مناظروں اور مباحثوں کو دیکھنے کا مجھے اب تک موقع ملا ہے، ان میں ہر فریق اندرونی تنازع کی موجودگی کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنے سے بھی انکار کر دینے کی طرف مائل نظر آتا ہے یا اسے غلط معانی و مفہوم دینے کا میلان رکھتا ہے۔ لیکن جس وقت ان دونوں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو بہتر جاننے لگیں گے اس وقت یہ صورتحال یقیناً بدل جائے گی۔

اسرائیلی فلسطینی تنازع

بچپن میں ذہن نشین ہونے والی باتوں میں سے ایک تاریک ترین بات نسل پرستی کا نظریہ ہے۔ میں جن دنوں برج پورٹ کینکٹیکٹ میں پروان چڑھ رہا تھا، ان دنوں یہ بہت سی غیر مماثل ثقافتوں کا گڑھ تھا۔ یہ ایک ایسی کٹھالی یا برتن کی مانند تھا جس میں ابھی ابال نہیں آیا تھا۔ یہاں تعصب اور عدم رواداری اس مغربی وسطی علاقے کی نسبت کہیں زیادہ تھی جہاں میں آج کل رہائش پذیر ہوں اس لئے کہ یہاں رہنے والے کو اپنے تعصب کی چیزوں سے ہر روز واسطہ پڑتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف نسلی الزام تراشی کرتے تھے اور ایک دوسرے پر تہمتیں باندھتے تھے۔ ''یہودی'' بے مثال ہے اس میں کسی ایسے لفظ کو ترک کرنے یا اسے

Marfat.com

بگاڑنے کی نیت شامل نہیں ہوتی تھی، جو حسب ونسب کی تشریح کرتا ہے اور اس لئے بھی کہ یہ ڈکشنری کی ایک اصطلاح ہے۔ ایک اور وضاحت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ صرف یہودیوں کا تمسخر اڑانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو تنہا اور کبھی ملا کر استعمال ہوتا تھا۔ کسی نسل کے انسانوں کے خلاف ملحدوں اور لا مذہب لوگوں کے لئے اس کے معنوی رنگ میں فرق ہوتا تھا، جن میں کنجوسی، بزدلی اور گندگی کے معنی بھی شامل تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے پڑوس میں نوجوان لڑکے کس طرح ان یہودی لڑکوں کی گھات میں بیٹھ جاتے تھے جو یہودیوں کے عبادتی اجتماع سے گھروں کو واپس آ رہے ہوتے تھے۔ یہ بلند آواز میں انہیں للکارتے ہوئے کہتے: ''یہودی کو پکڑ لو!'' ''یہودی کو مار ڈالو!'' اور پھر ان کے تعاقب میں سڑک پر نشیبی سمت بھاگتے جاتے تھے۔ اور دوسروں کے برعکس ان کے والدین نے ہم سے شاید ہی کبھی شکایت کی ہو۔ میں حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ کیا یہ ان کی تربیت اور پرورش کا حصہ تھا۔ کیا ان کا تعلق ہی کسی ایسے حسب ونسب سے تھا جس کے لوگوں کو یوں کھلے بندوں ستایا جاتا اور نشانہ تضحیک بنایا جاتا تھا؟ وہ لفظ جس سے آپ کی نسل کا اظہار ہوتا ہو اس کے ذریعے کس قدر ذلت آمیز اور سخت سزا دی جاتی ہے۔ بعد کے برسوں میں اپنے ان بالغ دوستوں کی زبانی جو کچھ عرصے سے مجھے پہچانتے تھے، نجی نشستوں میں اس بات کا اعتراف سنا کہ وہ یہودی ہیں، گویا وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ سزا یافتہ تھے۔ کچھ تو اپنے یہودی ہونے کا بھی یہ کہہ کر انکار کر دیتے تھے ''یہ ایک ایسا مذہب ہے جس میں اب میرا یقین و ایمان نہیں رہا۔''

مجھے اپنی پہلی شادی کے ذریعے ایک یہودی خاندان کی درون خانہ زندگی دیکھنے کا موقع ملا تھا یہ میری توقع اور اندازے سے کچھ زیادہ انوکھی نہیں تھی۔ صرف ایک بات جس نے مجھے چونکا دیا تھا اور وہ یقیناً عجیب وغریب تھی کہ انہیں اپنا وجود کس قدر غیر یقینی محسوس ہوتا تھا اور اس پر انہیں کتنا اعتماد تھا۔ اور ان کے دوستوں اور عزیزوں کو بھی۔ کہ ماضی میں جو کچھ ہوا وہ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا اور یہاں تک کہ امریکہ میں بھی سیاسی ہوا بہت جلد بدل سکتی تھی۔ بیشک چند یہودی

تنظیمیں اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتی ہیں کہ نازیوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کو کبھی نہ بھولنے دیا جائے، اپنی بیوی کے خاندان میں سے کسی کو میں نے نہ سنا کہ وہ اس کا نام لے کر ذکر کر رہا ہو مگر اشاروں کنایوں سے وہ اسے اکثر دہراتے رہتے تھے۔ یہ کافی حد تک سچ ہے کہ صیہونی اس ناگفتہ بہ ٹریجڈی کو پروپیگنڈے کی خاطر زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن اس سے اس حقیقت کی طرف سے نظریں نہیں ہٹتی ہیں کہ نازیوں کے مقتل یہودی روح میں بہت گہرے اتر چکے ہیں اور ان کی مذہبی رسومات میں صدیوں بعد بھی ان کے جور و ستم اور اذیت کی داستانیں ایک گردشی صورت میں ازسرنو زندہ ہوگئی ہیں۔ جہاں بعض اوقات ان کی تاریخ کی افسردگی کو دور کرنے کیلئے تحریر میں ظرافت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

طلاق کے تین سال بعد کی ایک گفتگو جو میرے اور میری بیوی کے درمیان ہوئی یاد آتی ہے اس میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے حال ہی میں دوبارہ شادی سے پہلے کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا بہت پہلے کیوں نہ کیا، خصوصاً اس صورت میں جبکہ طلاق کی خواہش کا اظہار بھی اس کی طرف سے ہوا تھا اور پھر ہم دونوں میں ایک دوسرے کے لئے طلاق کے بعد بھی نفرت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جواب میری سابقہ بیوی نے یہ دیا کہ جب اس کے نام کے آخر میں لینگ استعمال ہوتا تھا تو لوگ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے اس لئے کہ ان کے خیال میں ''میں جرمن تھی''۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تلخی حزن و ملال یا پچھتاوا ظاہر نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے کہ اس نے یہ بات نیم مزاحیہ انداز میں کہی تھی۔ پھر بھی جس بات کو مجھے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہئے تھا وہ میرے لئے چشم کشا ثابت ہوئی، اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ جو بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ دیتی ہے۔ اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ امریکی یہودی اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ فکر مند ہیں کہ ان کا ہولناک ماضی کہیں دوبارہ نہ لوٹ آئے۔ لیکن اس کی بات نے میرے اندر ایک اثر پذیر تشویش پیدا کر کے ایک ایسے احساس کو جنم دیا جس سے مجھے خیال آیا کہ شاید یہودیوں کے لئے کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں جب ان کی اکثریت اپنی شناخت کو چھپا لینے میں اپنی بہتری

Marfat.com

سمجھتی ہے اور انہیں توقع ہوتی ہے کہ بہت سے اجنبی ان کے راز تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور میں حیران تھا کہ ایسے حالات میں ایک شخص احساس جرم اور اپنے آپ کو ملامت کرنے کے احساس سے کیسے بچ سکتا ہے۔ شاید میری طرف سے یہ مبالغہ آمیز بات ہو لیکن اگر اس قسم کے اندیشے امریکی یہودیوں میں بھی پائے جاتے ہیں تو یورپ اور روس میں یہودیوں نے جو ظلم و استبداد جھیلے ہیں ان کی ایک لمبی فہرست یقیناً ان کے خدشات کی تائید کرے گی۔

مسلم قارئین یہ احتجاج کر سکتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں یہودیوں کی حالت عیسائی ممالک کی نسبت زیادہ بہتر تھی۔ اس رائے کی حمایت برنارڈ لیویز کی حالیہ تصنیف ''دی جیوز آف اسلام'' (۸) سے ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یورپ کے سنہری عہد سے قبل یہودیوں کے لئے قابل برداشت ماحول تلاش کرنے کا بہترین موقعہ تھا اور جہاں وہ جا سکتے تھے وہ اسلامی دنیا تھی۔ لیکن اس کتاب کا مصنف یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اسلامی دنیا میں یہودیوں کو مساوی حقوق اور مواقع میسر نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانون میں کسی اسلامی عدالت میں ایک یہودی یا عیسائی رعایا کے کسی فرد کی (ذمی) گواہی قابل قبول سمجھی جاتی تھی۔ کسی زخم کے بدلے میں جب قصاص ادا کیا جاتا تھا تو یہودیوں کی زندگی کی قیمت ایک مسلمان کے مقابلے میں کم تھی۔ (۹) مسلمانوں کی بہت سی قانون کی کتابوں میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو کئی طرح سے تذلیل اور اہانت کے تابع رکھا جانا چاہئے: مثلاً یہ کہ ایک ذمی کے لئے گھوڑے کی سواری ممنوع ہو وہ گدھے کی سواری کرے، وہ اپنے سواری کے جانور پر دونوں پاؤں ایک طرف لٹکا کر نہ بیٹھے بلکہ دونوں رکابوں میں پاؤں ڈال کر سواری کرے، جس طرح عورت سواری کرتی ہے، وہ اسلحہ لے کر نہ چلے، اس کا لباس مسلمانوں کے لباس سے مختلف ہو اور رہائشی گھروں کے بارے میں پابندیوں کا ذکر تو اکثر کیا جاتا ہے۔ (۱۰)

مختلف قسم کے اظہار کمتری کے باوجود اسلامی قانون نے یہودی اور عیسائی باشندوں کو کافی حد تک خودمختاری کی ضمانت دے رکھی تھی اور ''کئی لحاظ سے روایتی اسلامی طرز حکومت میں غیر مسلموں کی حالت غیر عیسائیوں کی نسبت زیادہ بہتر تھی یا عہد وسطیٰ کے یورپ کے نسلاً بعد

نسلاً آنے والے عیسائیوں سے بھی بہتر، جدید یورپ کے چند واقعات کا تو ذکر ہی کیا۔'' (۱۱) لیویز ان کے قانونی درجے کا ذکر کرتے وقت انہیں دوسرے درجے کے شہری قرار دیتا ہے لیکن وہ خبردار بھی کرتا جاتا ہے کہ ایسا کہنے سے قبل اس پر قریبی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی شہریت بیشک کم تر ہو مگر ہے تو ایک قسم کی شہریت۔ اس میں کچھ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں، بیشک سارے حقوق نہیں ملتے مگر کوئی حق بھی نہ ملے اس سے تو یہ بہتر ہے۔ بہت سے ملکوں میں آج کل جو صورتحال پائی جاتی ہے اس سے یقیناً یہ بہتر ہے جہاں اقلیتیں ہی کیا اکثریتی باشندوں کو بھی شہری یا انسانی حقوق حاصل نہیں ہوتے حالانکہ وہاں کے قانون میں بڑے خوبصورت اصول شامل کئے جاتے ہیں (لیکن نافذ نہیں کئے جاتے) ایک ایسا درجہ جسے قانون تسلیم کرتا ہے، اگرچہ یہ کمتر درجہ بمقابلہ غالب گروپ ہوتا ہے جسے روایت بھی تسلیم کرتی ہے اور اس بات کی توثیق وتصدیق کی جاتی ہے کہ اسے پست اور ذلیل نہ سمجھا جائے۔ (۱۲) یہ بات ہمارے لئے قابل توجہ ہے کہ یہودی اور عیسائی شہریوں کے ساتھ اسلامی قانون کے تحت تقریباً یکساں سلوک کیا جاتا تھا اور کسی بھی اقلیت کی سزائیں حکومت بہت کم معاف کرتی تھی۔

اسلامی حکومت میں رہنے والے یہودی عموماً ان سے بہتر تھے جو عیسائی حکومت کے ماتحت تھے، بیسویں صدی کے نقطہ نظر سے ان کی زندگی ہر دور میں سے کسی بھی ایک صورت میں بڑی نازک تھی۔ ان کی فلاح و بہبود اور بقاء وسلامتی اکثریت کے رحم وکرم پر منحصر تھی کیونکہ باہر سے کوئی ایسی سیاسی قوت نہ تھی جو ان کی نمائندگی کرتی یا ان کی خاطر دباؤ ڈالتی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سیاسی صیہونیت کو اس تشکیک سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا اور اس سے اس غیر مشروط حمایت کی دلیل بھی حاصل ہوتی ہے جو اسرائیل کی ریاست کے قیام کو امریکی یہودیوں سے حاصل ہوئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ حمایت جو یہودی اکثریت سے اسے حاصل ہوئی وہ کسی لالچ، نسلی تفاخر یا مبالغہ آمیز جذبہ حب وطنی کی بنیاد پر تھی، مجھے یقین ہے کہ یہ بہت گہرے خوف وڈر اور ابتلا وآزمائش سے حاصل ہوتی ہے۔ طنزاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسرائیلی ریاست کا قیام آخر کار اس تباہی وبربادی کے منطقی انجام کو پہنچے گا جسے یہ روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

فلسطینیوں کی صیہونیت اور جدید اسرائیلی ریاست کی تواریخ سے متعلق ان جذبات کو تحسین سے دیکھنے کی ضرورت ہے جو حالیہ فلسطینی اسرائیلی تصادم کے دوران پیدا ہوئے۔ میں اس کا ایک بہت مختصر سا خاکہ یہاں پیش کروں گا اور اپنی تحریر میں شامل مکمل گفتگو کی جانب اپنے قاری کو لے جاؤں گا۔ (۱۳)

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ فلسطین میں بسنے والے عربوں کی اکثریت کے آباؤ اجداد اسلامی فتح کے ساتھ فلسطین نہیں آئے تھے بلکہ وہ تو بنیادی طور پر سامی الاصل ہیں جو کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں فلسطین میں آباد تھے اور ''یہ زمانہ دنیا میں غالباً سب سے کم پیچیدہ اور طویل ترین زمانوں میں سے ایک ہے۔'' (۱۴)

قدیم عبرانی تو فلسطین میں بہت بعد میں آئے۔ تقریباً ۱۴ سو سال قبل مسیح میں۔ پہلے تو یہ پہاڑیوں میں چھوٹی چھوٹی نو آبادیوں کی شکل میں رہتے تھے اور ہمسایوں کے ساتھ بہت پرامن طور پر زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا جب ان لوگوں نے اسلحہ اٹھا لیا تھا اور ان کے جنگ و جدل کا تذکرہ عہد نامہ قدیم میں ملتا ہے۔ فلسطین میں اسرائیلیوں کی قائم کردہ ریاست یا ریاستیں آشوریوں (قدیم ایشیائی علاقے کے لوگ) اور بابلیوں نے ۷۰۰ ق م اور ۵۵۰ ق م میں تباہ کر دی تھیں۔ فلسطین کے مقبوضات پر قدیم یہودیوں کا قبضہ عارضی تھا۔ صرف حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد حکومت میں فلسطین پر یہودی قبضہ موجود تھا۔ آٹھ سو سال بعد میکابی شہزادوں نے اس یہودی طاقت کو از سر نو بحال کیا جو سلیمانؑ کے ساتھ ہی کمزور پڑ گئی تھی لیکن پھر ایک بہت مختصر عرصے کے لئے یہ ریاست حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد کی وسعت کو چھو سکی۔ داؤدؑ سے قبل یوشع کے بارہ قبیلوں کی آبادی محض برائے نام تھی۔ (۱۵)

بیکر لکھتا ہے کہ اسپین ''ایک ایسا ملک ہے جہاں یہودیوں نے (۲۰۰۰ سال زائد عرصے پہلے) تاریخی اعتبار سے ایک مختصر سی مدت کیلئے ایک ریاست قائم کی تھی۔ یہی ریاست آگے چل کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔'' (۱۶)

فلسطین پر یہودیوں کا تاریخی دعویٰ اس لئے کمزور اور بلا دلیل ہے کہ دو ہزار سے زیادہ

Marfat.com

برس پہلے کسی قلمرو کے منتشر حصوں پر طاقت کے زور پر چند صدیوں تک قبضہ کر لینا آج یہودیوں کو اس سرزمین کا مالک نہیں بنا دیتا، اگر ایسا ہوتو آج کے عربوں کو اسپین کو اپنی ملکیت ٹھہرانے کا جواز ہاتھ آتا ہے جہاں عرب صدیوں تک حکمران رہے اس کے علاوہ بیکر اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ

وہ یہودی جو آج فلسطین پر قابض ہیں وہ خود ریزہ ریزہ ہیں اور جن قدیم عبرانیوں نے کبھی کنعان کی سرزمین کو فتح کیا تھا ان سے ان یہودیوں کا کسی طرح بھی کوئی رشتہ و تعلق نہیں ملتا.......... وہ فلسطینی عرب جو آج بھی فلسطین میں بستے ہیں وہ صحیح معنوں میں اصل سامانی باشندوں کی اولاد ہیں۔ ان کی جڑیں شام، لبنان، اُردن اور مصر میں نہیں بلکہ صرف ایک ہی ایسا ملک جسے یہ لوگ اپنے وطن کے طور پر جانتے ہیں اور وہ ہے فلسطین۔ (۱۷)

اور مزید یہ کہ

''وہ یہودی جنہوں نے ۱۸۹۷ء میں یہ چاہا کہ ایک بار پھر فلسطین پر اپنے وطن کے طور پر قبضہ جمالیں، ان کا کسی طور بھی ۲۵۰۰ سال پہلے کے سامانی یہودیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، باہمی شادیوں کے ذریعے آمیزش خون کی نسبت سے ایسا دعویٰ کیا جارہا ہے۔ لیکن یہ ان لاتعداد غیر سامانی باشندوں کی وجہ سے بھی ہے جو اپنا مذہب تبدیل کر کے یہودی ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کی مستند مثال خضر قبیلے سے ملتی ہے جو آج بھی روس میں بستا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا اور اس دور کے یہودیوں میں سے بہت سے اس قبیلے کی نسل سے ہیں۔ (۱۸)

تاہم اس ''تاریخی تعلق'' کے استدلال کو بنیاد بنا کر بیسویں صدی کے آغاز میں صیہونیوں نے پہلے فلسطین کے اندر اور بعد ازاں اس کے گردونواح میں یہودیوں کے ایک قومی وطن کے قیام کیلئے اپنے دعویٰ پر زور دیا۔

صیہونیت، جس کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی ایک یہودی تحریک تھی جو یہودی قوم کو از سر نو مضبوط بنانا چاہتی تھی۔ کچھ یہودیوں کیلئے یہ ایک روحانی بحالی اور اپنے مذہب کی

Marfat.com

طرف واپسی کا مفہوم لئے ہوئے تھی، ان دونوں میں بظاہر خطہ زمین یا علاقے کی خواہش شامل نہیں تھی۔ ان دو کے درمیان فرق اس طرح واضح کیا جاتا ہے کہ اول الذکر روحانی صیہونیت تھی اور موخرالذکر سیاسی صیہونیت۔ آگے چل کر ہم جہاں بھی صیہونیت کا ذکر کریں گے اس سے مراد سیاسی صیہونیت ہوگی۔

حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۵ء میں یہ عہد و پیمان کیا تھا کہ حسین میکموہن معاہدے کے مطابق ''شریف مکہ کی تجویز کردہ سرحدوں کے اندر اندر عربوں کی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی حمایت بھی کرے گی۔'' ان سرحدوں میں شریف مکہ نے ''عربوں کے نمائندے'' کی حیثیت سے اور حکومت برطانیہ نے باہمی اتفاق سے فلسطین کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اس کے بدلے میں عربوں نے حسین کی قیادت میں پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے خلاف جنگ میں اتحادی فوجوں میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ عربوں نے اپنا عہد نبھایا اور قابل تعریف حد تک یہ جنگ لڑی۔ (۱۹) فرانسیسی اور برطانوی حکومتوں نے ۱۹۱۹ء میں مشترکہ اینگلو فرنچ اعلان میں شریف حسین کے ساتھ کئے جانے والے سابقہ معاہدے کی شرائط کی تصدیق وتوثیق کردی تھی۔ اور فلسطین اور دوسرے علاقوں میں عربوں کی حکومت کی واضح ضمانت دے رکھی تھی۔ (۲۰) تاہم ان دو تاریخوں کے درمیان برطانیہ نے دو دوسرے معاہدے ختم کردیئے تھے جو عربوں کے ساتھ کئے گئے وعدے سے متضاد تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے ۱۹۱۶ء میں سائیکس پکٹ معاہدے میں بذریعہ گفت وشنید اس سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کردیا تھا جو اب تک غیر مفتوحہ تھی اور اس میں عرب کے علاقے بھی شامل تھے انہیں تقسیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کے ''اثر ورسوخ والے علاقے'' بنا دیا گیا تھا، حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۷ء کے مشہور بالفور ڈیکلریشن کے مطابق اس بات کا ذمہ لیا کہ وہ ''فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی سطح پر ایک دیس کا قیام عمل میں لائے گی۔'' بالفور ڈیکلریشن جاری ہوا یہ اعلان اس طرح سے تھا:

شہنشاہ برطانیہ کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی سطح پر ایک وطن کے قیام کی حمایت کرتی ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے وہ تمام تر کوششیں کرے گی، یہ بات بالکل واضح

Marfat.com

ہے کہ کوئی بھی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو فلسطین کے موجودہ غیر یہودی باشندوں کے شہری اور مذہبی حقوق کو نقصان پہنچائے یا کسی بھی دوسرے ملک میں بسنے والے یہودیوں کے سیاسی مقام و مرتبے کے لئے ضرررساں ثابت ہو۔(۲۱)

یہ اعلان وہ تھا جس کی حکومتی سطح پر منادی کرائی گئی تھی اور آئندہ اکتیس سال کیلئے یہ حکومت برطانیہ کی پالیسی کی بنیاد کا اعلان تھا جس میں کئی اہم نکات پوشیدہ تھے اس کا اختصار بتاتا ہے کہ اسے بہت تیزی سے لکھا گیا، حالانکہ یہ محض ایک مفروضہ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ ایم نہوم سیکالو اس اعلان کے بارے میں اپنی کتاب ''ہسٹری آف زیونزم'' (تاریخ صیہونیت) میں لکھتا ہے۔''ہر وہ تصور جو لندن میں جنم لیتا صیہونی تنظیمیں امریکہ میں اسے ٹیسٹ کرتیں اور امریکہ میں جو تجویز بنتی لندن میں اس پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔'' لیونرڈ ڈسٹن اس اعلان کے متعلق اپنی تصنیف ''زیونزم'' (''صیہونیت'' میں لکھتا ہے: ''اسے ایک پالیسی بیان کے طور پر کافی غوروخوض کے بعد جاری کیا گیا تھا۔'' اسٹیفن وائز، ایک امریکی صیہونی لیڈر لکھتا ہے ''بالفور ڈیکلریشن تقریباً دو سال سے تشکیل کے مرحلوں سے گزر رہا تھا۔''(۲۲)

اس اعلان کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں بڑا ابہام پایا جاتا ہے۔ اس اعلان میں جسے بڑی باریک بینی کے ساتھ دو سال کے عرصے میں تیار کیا گیا تھا، اس میں مختصراً یہ تو بتایا جانا چاہئے تھا کہ ''غیر یہودی باشندوں کے شہری اور مذہبی حقوق سے کیا مراد تھی'' اور ان کے ساتھ ''تعصب'' کیسے نہیں برتا جا رہا تھا۔ حکومت برطانیہ نے جو کمیشن بھیجے ان میں سے ایک شا کمیشن تھا جو ۱۹۳۰ء میں فلسطین بھیجا گیا تھا، تاکہ وہ اس بات کی تفتیش کر سکے کہ وہاں نسلی بے چینی اور اضطراب میں کیوں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، کمیشن نے یہ شکایت کی کہ اس اعلان کی ''بہت سی تاویلات نکلتی تھیں۔'' اور یہ سفارش بھی کی کہ فلسطین سے متعلق حکومت کو اپنی پالیسی کا جلد اعلان کرنا چاہئے۔ (۲۳) ان ہی خطوط پر فلسطین میں بسنے والے غیر یہودیوں کا حوالہ ہماری توجہ چاہتا ہے اس لئے کہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جب یہ اعلان جاری ہوا اس وقت

Marfat.com

فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت وہاں کی آبادی کا ۹۱ فیصد عربوں پر مشتمل تھا اور صرف ۹ فیصد یہودی تھے۔ (۲۴) یہ بات بھی غور طلب ہے کہ عربوں کی تعداد کو جان بوجھ کر نہیں دکھایا گیا تھا کیونکہ شروع ہی سے صیہونیوں کی یہ پالیسی تھی کہ فلسطین کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے اور یہی پالیسی آج بھی جاری ہے۔ (۲۵)

اس دستاویز کا ابہام، صیہونی لیڈروں کے بیان کے مطابق اس لئے سامنے نہیں لایا گیا تھا کیونکہ اس کا مسودہ بہت جلدی میں بلا سوچے سمجھے تیار کیا گیا تھا۔ جیفریز کے دستاویزات کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ اس صیہونی منصوبے کو دھندلا دیا جائے جس کے مطابق پورے فلسطین کو ایک یہودی ریاست میں بدل ڈالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اور برطانوی حکومت کی اس پروگرام کو اس وقت تک آشیر باد حاصل تھی جب تک یہ اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ گیا، اس دوران بالفور ڈیکلریشن کو صیہونی نصب العین کی جانب سے صرف ایک درمیانی اقدام کے طور پر دیکھا گیا تھا۔ (۲۶)

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر فلسطینی عربوں کو میکموہن حسین معاہدے میں کئے گئے وعدے کے مطابق سیاسی آزادی کی توقع تھی۔ مگر آنے والے برسوں میں انہوں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ برطانیہ اپنا وعدہ پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ برطانوی فرمان کے مطابق یورپی یہودیوں کو وسیع پیمانے پر نقل مکانی کے ذریعے ان پر زبردستی ٹھونسا جا رہا تھا۔

۱۹۱۴ء تک فلسطین کی آبادی کا ۹ فیصد یہودیوں پر مشتمل تھا جبکہ باقی ماندہ عرب تھے۔ ۱۹۲۲ء میں یہودی آبادی بڑھ کر گیارہ فیصد ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں یہ ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی اور ۱۹۴۷ء میں فلسطین کی آبادی کا ۳۱ فیصد یہودیوں پر مشتمل تھا۔ (۲۷) اس سرزمین کے قدرتی وسائل پر صیہونی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی۔ ان زمینداروں کی عدم موجودگی میں زرعی زمین خریدنے کیلئے صیہونی فرموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یا ''ان عرب پھیری والوں سے جو اس قدر غریب تھے کہ کوئی اور وسیلہ نہ ہونے کی وجہ سے زمینیں بیچنے پر مجبور تھے تا کہ ٹیکس ادا کر سکیں اور جنگ کے زمانے کے قرضے ادا کر سکیں'' (۲۸)۔ عربوں پر جو اقتصادی

Marfat.com

اثر پڑا وہ بڑا تباہ کن تھا۔ بیروزگاری بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور زمین سے محروم غریب لوگوں کا ایک طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ فلسطینیوں کے غم و غصے میں اضافہ ہو چکا تھا، بالکل اس طرح جیسے ان امریکی شہریوں کے غصے میں اضافہ ہوتا جنہیں یہ پتہ چلتا کہ امریکہ اپنی نہایت قیمتی سرزمین کے حصے غیر ملکیوں کے ہاتھ بیچ رہا ہے اور انہیں اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ یہاں نوآبادیاں قائم کر کے آزاد ریاست قائم کر لیں۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں کے دوران ایک بدنظمی کی لہر مسلسل دوڑتی رہی جس میں عرب وفود اپنا مقدمہ پیش کرنے لندن آتے رہے لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے بدلے میں فلسطین میں ان وفود کے کمیشنوں کی آمد برابر جاری رہی، جن کے پیچھے پیچھے حکومت برطانیہ کے جاری کردہ قرطاس ابیض آتے رہے جو ان کمیشنوں کے حاصل کردہ نتائج سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء کے کرین گنگ کمیشن، ۱۹۲۱ء کے ہیکرافٹ کمیشن، ۱۹۳۰ء کے شا کمیشن، ۱۹۳۰ء ہی کے ہوپ سیمپسن کمیشن اور ۳۲-۱۹۳۱ء کے فرنچ کمیشنوں نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ دیا کہ عرب فلسطینیوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو رہی تھی، اور یہ کہ ترک وطن اور ہجرت کو یا تو بہت حد تک کم کر دیا جائے یا غیر معینہ مدت تک کیلئے معطل کر دیا جائے، اور اکثریتی آبادی کی نمائندہ حکومت قائم کر دی جائے (۲۹) فلسطین سے متعلق برطانیہ کے منشور کا ریکارڈ ۳۱ برسوں کے معاہدوں کی خلاف ورزیوں، عالمی قوانین کی خلاف ورزی، کھلی غداری، بے اصولی و رسوائی اور دھوکہ و فریب پر مشتمل تھا۔ اسرائیلی ریاست کے قیام پر بھی یہی کچھ اس سے بھی بڑے پیمانے پر جاری رہنا تھا۔

اب تک جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ اس مسئلے میں کچھ عام نوعیت کے امریکی شک و شبہات کو رفع کیا جائے۔ ایک عام امریکی یہ سمجھتا ہے کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد نازیوں کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہونے والے یہودیوں نے فلسطین کے زیادہ غیر آباد حصے کی طرف ہجرت کرنی شروع کر دی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں کی محدود سی آبادی کے قریب امن و امان سے زندگی گزار سکیں گے اور پھر مختصر عرصے کے بعد نسلی

Marfat.com

فسادات شروع ہوجانے پر اقوام متحدہ فلسطین کا بٹوارہ کر کے یہودی سیکٹر الگ کر دے گی، جسے بہت جلد اسرائیلی ریاست کی شکل اختیار کرنی تھی اور دوسرا حصہ عرب سیکٹر بن جانا تھا۔ اس لئے اسرائیل کے حق میں پیش کئے جانے والے اسباب میں نازی تباہی اور یہودی کے لئے فلسطینی عربوں کی نفرت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا، دوسری جنگ عظیم سے بہت پہلے پورے فلسطین کو ایک یہودی ریاست میں بدل دینے کے صیہونی ایجنڈے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ فلسطین ۱۹۱۴ء میں غیر آباد نہیں تھا اور نہ ہی اسرائیل کے سابق وزیراعظم شمعون پیریز کے الفاظ میں ''بے آباد صحرا'' تھا۔ یہ ایک گنجان آباد وطن تھا جو اپنی زرخیزی اور ایک معاصر معاشرے کی خوبصورتی کے لئے مشہور تھا۔ (۳۰) فلسطینیوں میں جو اشتعال پھیلا اس کا سبب کوئی تعصب نہ تھا بلکہ یہ نتیجہ تھا اس وعدہ خلافی اور فریب دہی کا جس میں انہیں آزادی دے دینے کا وعدہ کیا گیا اور بعد ازاں انہیں ان کی سرزمین سے نکال کر بے گھر کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کا منصوبہ فلسطین میں بے مثال سول نافرمانی پر اقوام متحدہ کے ردعمل کے نتیجے میں نہیں بنا تھا۔ اس لئے کہ اس کی تجویز سب سے پہلے پیل کمیشن نے ۱۹۳۷ء میں دی تھی۔ ارباب حل وعقد اس بات پر متفق ہیں کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات، آباد ہونے کے لئے آنے والے یورپی صیہونیوں کی آمد سے پہلے اچھے تھے۔ صیہونی حملے کے بعد جلد ہی عربوں اور یہودیوں کے درمیان تصادم بڑھ گیا تھا، یہ سلسلہ ماضی میں ۱۹۲۰ء کے یروشلم کے فسادات تک جا پہنچتا ہے۔ (۳۱)

تقسیم کے وقت فلسطین کی کل آبادی میں یہودیوں کی تعداد ۳۲.۵ فیصد تھی اور ان کے پاس کل فلسطین کا ۵.۷۷ فیصد حصہ آ چکا تھا۔

تقسیم کے وقت اقوام متحدہ نے کل زمین کے ۵۶ فیصد حصے پر یہودیوں کی بالادستی قائم کر دی تھی اور یہ اضافہ اس زمین کے مقابلے میں جس کے وہ دراصل مالک تھے، دس گنا زیادہ تھا۔ (۳۲) یہودی سیکٹر میں تقسیم کے بعد عرب باشندوں کی تعداد ۴۵ فیصد تھی، جن میں سے اکثریت صیہونی خوف و دہشت اور آئندہ مہینوں میں متوقع ظلم وتشدد کے ذریعے وہاں سے

Marfat.com

نکالے جارہے تھے۔ جوزف ڈبلیو، بطور ایڈمنسٹریٹر، یہودی نوآبادی کے انتظامات کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا، اس نے ۱۹۴۰ء کی آخری کامیابی کے بارے میں صاف صاف لکھا:

''ہمارے درمیان یہ بات بالکل واضح ہوجانی چاہئے کہ اس ملک میں دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں...... اس کا ایک ہی حل ہے کہ فلسطین میں کوئی عرب نہ رہے اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ عربوں کو یہاں سے نکال کر پڑوسی ملکوں میں منتقل کردیا جائے اور اس انتقال آبادی میں تمام عربوں کو نکلنا ہوگا۔ کوئی ایک گاؤں، ایک قبیلہ بھی باقی نہیں بچنا چاہئے۔'' (۳۳) دیر یلیین، عین الزیتون، لیڈا، صفصف، صالحہ اور دوائمہ میں سینکڑوں نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا۔ (۳۴) ایک اسرائیلی سپاہی نے دوائمہ میں ہونیوالی خونریزی کے بارے میں لرزاں کردینے والی خبر یوں سنائی: ''انہوں نے اسّی سے سو تک عرب عورتوں اور بچوں کو قتل کیا تھا۔ ان کے بچوں کو قتل کرنے کے لئے ان کی کھوپڑیوں کو ڈنڈوں سے کچل دیا گیا تھا۔ (۳۵) ایک اور انتہائی مؤثر چال صیہونیوں نے یہ چلی تھی کہ عربی زبان میں نشریات کے ذریعے خوف و ہراس پھیلاتے تھے اور فلسطینیوں کو گھر چھوڑ کر جانیں بچانے کی ترغیب دیتے تھے۔ (۳۶)

وطن بدر کرنے کی اس کوشش میں یہودیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یکم اپریل ۱۹۴۸ء اور ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کے درمیان چار لاکھ مسلمان اور عیسائی فلسطینی یہودی سیکٹر سے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اپنی تاریخ میں پہلی بار یہ لوگ مہاجر بنے تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء آج کی ''اسرائیلی ریاست'' کے وجود میں آنے کے یوم کے طور پر منایا گیا تھا جس کے بعد صیہونی ہتھکنڈوں میں زیادہ واضح ظلم وستم شامل ہوگیا تھا۔ برطانوی ملٹری مورخ ایڈگر او بیلنس لکھتا ہے:

Marfat.com

''کوئی معقول ترغیب'' دیئے بغیر عرب باشندوں کونہایت ناشائستگی کے ساتھ ترک وطن پر مجبور کیا جارہا تھا تا کہ وہ بھاگ کر عرب علاقے میں چلے جائیں جیسے رملہ، لیڈا اور دوسرے مقامات۔ اسرائیلی دستوں نے جس طرف بھی پیش قدمی کی عرب آبادی کو پیس کر رکھ دیا گیا۔ (۳۷)

جس لڑائی کا آغاز ہوا اسے جنگ ۱۹۴۸ء کا نام دیا گیا تھا۔اس میں فلسطینی مہاجرین کی اضافی تعداد چارلاکھ ہوگئی تھی اور یہودی ریاست میں صرف ایک لاکھ ساٹھ ہزار عربوں کو باقی رہنے دیا گیا تھا۔ اور دسمبر تک یہودیوں کے پاس ملک کے کل رقبے کا ۷۸ فیصد آ چکا تھا۔ پھر چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں ۵ جون ۱۹۶۷ء کو ان فلسطینیوں کی تعداد جنہیں بے گھر کردیا گیا تھا ۱.۵ ملین تک پہنچ چکی تھی۔ حکومت اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قرارداد ۱۹۴ کی سیکشن II کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں واپس لوٹنے اور اپنی زمینوں اور جائیدادوں کو سنبھالنے سے روک دیا تھا۔

اپنے وجود میں آنے کے بعد اسرائیل عربوں کے ساتھ پانچ بڑی جنگیں لڑ چکا ہے اور مزید کئی اشتعال انگیز تصادم ایسے رونما ہوئے جن میں اسرائیل ملوث تھا۔ مثلاً لبنان پر ۱۹۷۸ء کا حملہ اور وہ جنگیں جو ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۲ء میں ہوئیں۔ اسرائیل نے پروپیگنڈہ یہ کیا کہ ان ساری جنگوں کا آغاز عربوں نے کیا تھا لیکن اسرائیل کے سیاسی اور فوجی لیڈروں کے وہ بیانات جو ضبط تحریر میں آ چکے ہیں، بتاتے ہیں کہ سوائے ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بقیہ تمام جنگوں میں اسرائیل کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا اور اسرائیل ہی صریحاً جارحیت کرنے والا تھا۔ (۳۸) ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے پورے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی کو مقبوضہ علاقے قرار دیا جاتا ہے جو ایک جابرانہ فوجی راج کے تحت ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں فلسطین میں کم وبیش دو ملین فلسطینی بستے تھے، ان میں سے نصف اسرائیل کے اندر اور بقیہ مقبوضہ علاقوں میں رہتے تھے اسی سال تقریباً ۲.۵ ملین سے زائد فلسطینی ایسے تھے جو فلسطین سے باہر زندگی بسر کر رہے تھے۔ (۳۹) اسرائیلی یہودی شہریوں کو مقبوضہ علاقوں میں بسانے کی اسرائیلی پالیسی اب تک جاری ہے اور اس کے زور میں کوئی کمی نہیں آ رہی۔ حالانکہ یہ

Marfat.com

بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے اور امریکی حکومت بھی رسمی طور پر کئی بار احتجاج کر چکی ہے۔ عالمی تنظیمیں مثلاً یونیسکو، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ریڈ کراس (ہلال احمر) برسوں سے انسانی حقوق کی پامالی سے متعلق معلومات کی نشرواشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ مثلاً فلسطینیوں کے گھروں کو مسمار کرنا، عرب زمینوں پر قبضہ، فلسطینی کارکنوں کے ساتھ بدسلوکی اور انہیں اذیت دینا اور عرب قیدیوں کو غیر قانونی طور پر نظر بند رکھنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۴۰)

فلسطینی المیے کی جانب مسلمانوں نے کس طرح توجہ دی اس کے ذکر سے پہلے میں روئے سخن اس عام رائے کی طرف کرنا چاہوں گا کہ فلسطین پر یہودیوں کا اخلاقی و مذہبی حق ملکیت کیسے بنتا ہے۔ بے شک ماضی میں یہودی بہت خوفناک سزاؤں کے شکار رہے ہیں، خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران مگر صرف یہودی ہی تو وہ لوگ نہیں جن پر دوسرے ظلم وستم ڈھاتے رہے اور پھر ماضی میں جو تکلیفیں انہوں نے جھیلیں وہ انہیں ایک دوسری قوم کی سرزمین کے مالک بن جانے کا حق بھی تو نہیں دے دیتیں۔ فلسطین پر غاصبانہ قبضہ اور فلسطینیوں کے بنیادی انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی سے نازی تباہی کے شکار لوگوں کے دکھ درد کا مداوا تو نہیں ہو جائے گا۔ اس سے دراصل ان بڑی قربانیوں کی رسوائی ہوتی ہے جو ماضی میں پیش کی گئیں اور جو درس عبرت حاصل ہونا چاہئے تھا یہ اس سے آنکھیں پھیر لینے کے مترادف ہے۔ ان دنوں صیہونیوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ جو سزائیں وہ فلسطینیوں کو دے رہے ہیں ان کا موازنہ نازی تباہی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اصل انسانی مصائب کے نقطہ نظر سے یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تو جو ناانصافی فلسطینیوں کے ساتھ کی گئی ہے اس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں نکلتا، جس کے مرتکب وہ لوگ ہوئے ہیں جنہیں فوری طور پر ان کی اذیت پر اظہار ہمدردی کرنا چاہئے تھا۔ جہاں تک اس نام نہاد مذہبی یا بائبلی جواز کا تعلق ہے اور جس میں پہلے ہی پوری ہو جانے والی پیش گوئیوں کو دوبارہ کرنے کا عمل شامل ہے، اسے اپنی مرضی کے معانی پہنائے جاتے ہیں۔ یہ تو اور زیادہ گھٹیا اور قابل نفرت حرکت ہے اس لئے کہ اس سے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ خدا

Marfat.com

نسلی امتیازات اور ناانصافیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تا کہ اس کی مرضی ومنشا پوری ہو سکے۔ اس استدلال سے نہ صرف عدل وانصاف اور اخلاقیات کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کا پہلو نکلتا ہے بلکہ مذہب پر بھی حرف آتا ہے۔(۴۱)

ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے اور فلسطینی المیے پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا ردعمل ٹھوس شکل میں یکساں اس یقین کامل کی شکل میں سامنے آیا ہے کہ اسرائیل اور اس کے حواری اسلام اور اس کے ماننے والوں کے پکے دشمن ہیں۔ کوئی بھی اور مسئلہ ایسا نہیں جو فلسطین کی حالت زار سے زیادہ مسلمانوں کے عتاب کو ابھارتا ہو۔ صرف اپنے مسلمان فلسطینی بھائیوں کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھنے سے ہی تو اس ناراضگی کا اظہار نہیں ہو جائے گا۔ حال ہی میں خلیجی بحران نے ثابت کردیا ہے کہ اس اخوت و بھائی چارے کے یہ رشتے کس قدر نازک ہیں۔ بلکہ چاہئے تو یہ کہ اس ناراضگی اور نفرت کا اظہار ذاتی سطح پر اور براہ راست کیا جائے۔ مسلمانوں کے لئے اسرائیلی ریاست ان کی سبکی اور بے قدری کا آخری زندہ نشان ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکش و مغرور استعماری قوتوں نے کس قدر انسانی بے قدری کا مظاہرہ کیا، یہ مغربی استعماریت کی طرف سے ان کی استحصالی چالوں اور سازشوں کی ایک مستقل یاد دہانی تھی، ان کیلئے یہ سرزمین مقدس بھی تھی اور متبرک بھی جس کی زیارت کے لئے جانے سے انہیں روک دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ یورپی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے اسلام کے لئے نفرت کی سب سے بڑی مثال ہے۔ بہت سے دوسروں کے لئے یہ محاذ جنگ عین مشیت ایزدی کے مطابق ہے جو موجودہ صورتحال کے خاتمے کے دنوں کی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔

ہزاروں امریکی مسجدوں میں جمعتہ المبارک کے خطبوں میں ان موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے اور انہیں بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہر نئی صبح مسلمانوں کے غم و غصے کی آگ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے جور وستم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مسلمانوں کا غیض وغضب تیزی کے ساتھ نہایت بھیانک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہودیوں کو اس گروہ میں شامل کرلیا گیا ہے جس پر اللہ کا قہر نازل ہونے والا ہو اور جن سے خدا

Marfat.com

ناراض ہو چکا ہو۔ جو بنی نوع انسان کے تمام گناہوں کی ابتداء کرنے والے ہوں اور جو مسلمانوں کے بے رحم ازلی دشمن ہوں۔ (۴۲) قدیم تباہ کن اور مہلک مشرقی یورپی پروپیگنڈہ، یہودیوں کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے مثلاً وہ جو جعل سازی اور نقل کے ذریعے ''دی پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زیون'' کا بعض اوقات حوالہ دیا جاتا ہے اور ان کی توثیق کی جاتی ہے مجھے حال ہی میں ایک عوامی لیکچر سننے کا اتفاق ہوا جس میں ایک مسلمان مقرر امریکیوں کو ایک عالمی سازش کے بارے میں یقین دلا رہا تھا اور استدلال یہ پیش کر رہا تھا کہ ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے وہ اپنی تقریر کے دوران اپنے مؤقف کی حمایت میں سٹیون سپلبرگ، وڈی ایلن، میل بروکس اور ٹیڈ کوپل کا حوالہ ثبوت کے طور پر دے رہا تھا۔ وہ اس بات سے شاید بے خبر تھا کہ اس طرح کے انداز نظر سے تو اس نصب العین کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے جسے یہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اولین بات جس پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ تمام یہودی، صیہونی نہیں ہیں اور نہ ہی تمام صیہونی، یہودی ہیں۔ صیہونیت کے خلاف نہایت مؤثر ترجمان تو ابتدائی ایام سے آج تک خود یہودی ہیں۔ جیفریز اپنی کتاب میں اس بات کی تصدیق کے کافی ثبوت پیش کرتا ہے۔ (۴۳) سکے کا دوسرا رخ بھی ہے: نام نہاد عیسائی صیہونی۔ ایسے لوگوں میں مثال کے طور پر جیری فال ویل اور پیٹ رابرٹسن کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اس قسم کے بیانات جیسے ''ذرائع ابلاغ کو یہودی کنٹرول کرتے ہیں'' مبالغہ آمیز اور تعصب انگیز ہیں۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ تمام امریکی یہودی بڑے پیمانے پر غیر قانونی صحافتی سرگرمیوں کی سازباز میں شریک ہیں۔ کانگریس کے سابقہ افراد میں سے پیٹ میک کلسکی اور پال فنڈلے اسرائیل کی حمایتی تنظیموں اور امریکہ میں ان حمایتی گروہوں کی تصدیق کرتے ہیں جو مواصلات کی صنعت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زیادہ تر یہ بھی موجودہ امریکی قوانین کے اندر رہ کر کام کرتے ہیں۔ (۴۴) بہتر یہ ہوگا کہ اسرائیلی حمایت میں اخباری ذرائع ابلاغ اور امریکی خارجہ پالیسی جو

Marfat.com

تعصّبانہ اور جانبدارانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے اسے بے نقاب کیا جائے۔ (۴۵) کیونکہ صیہونی کامیابی کا دارومدار ہمیشہ مغربی دنیا میں ایک جھوٹی حقیقت کو پھیلانے پر رہا ہے تاکہ مغربی دنیا کے عوام کو غلط اطلاعات بہم پہنچائی جائیں۔ ایک بار اس بات کی تصدیق ہو جائے تو پھر مسلمان کا کام واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ امریکہ میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر اپنے آپ کو منظم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام انہیں فوری طور پر شروع کر دینا چاہیے خواہ فی الحال مقامی سطح پر ہی سہی تاکہ فلسطین کے بارے میں سچائی اور حقائق پر مبنی صورتحال سے اپنے امریکہ میں بسنے والے بھائیوں کو آگاہ کر سکیں۔ ہمیں وسوسوں پر مبنی مبالغہ آمیزی سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف حقائق کو ایک مستقل ناانصافی کے خلاف گونجدار آواز کے ساتھ سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خلیج کے بحران کے نتیجے کے طور پر فلسطینیوں کے حمایتیوں کے دلوں میں امید کی کرن مدھم پڑ گئی ہے۔ ہمیں مایوس کن اعتراضات سننے کو اکثر ملتے ہیں اور صیہونیوں کا دعویٰ ہے کہ جلد مسلسل نو آبادکاری اور جبر سے عربوں کو مقبوضہ علاقوں سے نکال باہر کیا جائے گا اور عالمی برادری یہ تسلیم کر لے گی کہ پورا فلسطین، اسرائیلی ریاست بن چکا ہے۔ لیکن اگر فلسطینیوں کے خلاف انصاف کے حصول کی کوئی موہوم سی امید بھی ہو سکتی ہے تو پھر امریکہ میں بسنے والے ان لوگوں کو جو ان کی حمایت کرتے ہیں مایوسی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ وہ تمام اعلیٰ مقاصد جو امریکہ کے مسلمانوں کو عزیز ہیں، ان میں سے یہ ایک ایسا نصب العین ہے جس پر سب سے زیادہ اثر پڑ سکتا ہے۔ میں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتا کہ وقت صیہونیوں کے ساتھ ہے۔ یہ پیش گوئیاں کی جارہی ہیں کہ سن دو ہزار تک امریکی شہریوں کی اکثریت سفید فام نسل نہیں ہوگی اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی کہ یہ شہری اپنی پہچان اور شناخت عرب فلسطینیوں کے ذریعے کرائیں گے بجائے اس کے کہ اپنے اوپر ظلم وستم ڈھانے والوں کے ذریعے کرائیں۔ مزید براں مغربی دنیا میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب اسلام ہے اور اگلی صدی تک یہ امریکا کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔ اس آواز کو تو اب سننا

Marfat.com

ہی پڑے گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ امریکی عوام کی اسرائیل کے لئے ہمدردیاں ختم ہوتی جارہی ہیں اور جوں جوں امریکیوں کو اس بات کا علم ہوتا جاتا ہے کہ ان کے ادا کردہ ٹیکس ڈالروں کو انسانیت کے خلاف جرم عظیم کی کامیاب پیروی پر خرچ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، میرے خیال میں اتنی ہی تیزی کے ساتھ عوامی رائے میں تبدیلی آئے گی۔ (۴۶) حتمی بات یہ ہے کہ امریکی طاقت خواہ وہ فوجی ہو یا اقتصادی دائمی اور لازوال تو نہیں۔ آثار بتا رہے ہیں کہ اس کا زوال شروع ہو چکا ہے اور اس کی مدمقابل مسلم اقوام زیادہ طاقتور ہوتی جارہی ہیں۔ بالآخر اسلامی حکومتیں جمہوریت کو قبول کرلیں گی اور عوام الناس کی مرضی کو زیادہ اہمیت دی جائیگی جو مسئلہ فلسطین سے اپنے موجودہ حکمرانوں کی نسبت زیادہ وابستگی رکھتی ہے۔

آج کل فلسطینی دو ریاستوں کا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اس کے مطابق مقبوضہ علاقوں میں سے ایک آزاد فلسطینی ریاست کا قیام ضروری ہے۔ تاہم کئی طرح سے یہ بات منصفانہ لگتی ہے کیونکہ فلسطینیوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ تو اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اور جو ان کا حق ملکیت بنتا ہے۔ لیکن اس سے فلسطینیوں کی ضرورت ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں اس معاملے میں ان کی مکمل حمایت کرنی چاہئے۔ امید کی جاتی ہے کہ اسرائیل اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کرے گا، قبل اس کے کہ سیاسی پنڈولم مخالف سمت میں جھک جائے اور پرامن تصفیے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

عزیز و اقارب کے بندھن

مجھے یاد نہیں رہا کہ مسجد کے امام صاحب اپنی وین میں ہمیں کہاں لے جارہے تھے مگر چند سیکنڈوں کی آپس کی گفتگو مجھے آج تک یاد ہے۔ میں اور میرا پیارا دوست حامد میرے والدین کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میرے والدین بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ تو کٹر عیسائی ہیں تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ آخری فیصلہ خدا نے کرنا ہے، منصف تو اسی کی ذات ہے اور اس کی رحمت کائنات کی ہر شے پر

Marfat.com

محیط ہے۔ میں نے حامد کی دلچسپی اور علمیت کی تعریف کی۔

اس نے امام صاحب سے سوال پوچھا: ''آخرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا، علماء حضرات اس بارے میں کیا رائے دیتے ہیں؟۔ امام صاحب نے بڑے اطمینان سے سڑک پر نظریں گاڑتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا: ''ان میں سے جو حضرت محمد ﷺ کے دور رسالت کے بعد مرے ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔''

مجھے بے حد رنج ہوا اور میں اس سفر کے دوران پھر خاموش بیٹھا رہا۔ اس لئے نہیں کہ امام صاحب کے بیان پر مجھے یقین تھا بلکہ اس لئے کہ اس میں سے لاتعلقی اور حاکمیت کی بو آتی تھی۔ یہ بالکل وہی ذہنیت تھی جس نے عیسائیت میں رہ کر بھی مجھے بیس سال تک مذہب سے دور رکھا تھا۔

میں عہد جوانی میں جہاں کہیں بھی گیا ایک صلیب میرے بہت قریب قریب رہی۔ ہمارے گھر کے ہر کمرے میں، ہمارے اس پڑوسی کی کار کے شیشے کے ساتھ لٹکی ہوئی، جو ہمیں اسکول چھوڑنے جاتا تھا، کمرہ جماعت میں، تختہ سیاہ کے اوپر، لوگوں کے گلے میں لٹکی ہوئی، اور چرچ کے اندر قربان گاہ کے اوپر۔ یہ ایک ایسے غمزدہ اور ہر جگہ موجود انسان کی تصویر تھی جو ابھی ابھی چل بسا ہو، جس نے چند سیکنڈ پہلے خود کو سزا دینے والوں کیلئے معافی کی درخواست کی ہو اور اس کے اطمینان وسکون میں ہمیں معافی اور محبت کی یقین دہانی ملی ہو۔ ہمارے لئے تو یہ ایک پراسرار نشان تھا جس تک رسائی ممکن نہ تھی اور جس کے اندر ہمارے وجود، ہمارے مصائب اور ہمارے گناہوں کا راز مضمر تھا۔ کیتھولک اسکولوں میں چرچ کے مذہبی اصولوں اور نظریات پر عملاً کبھی بحث نہیں کی جاتی تھی اور بچوں کیلئے تو انہیں تشریح کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ صلیب پر بنی ہوئی تصویر میں ہم نے خدا اور انسانیت کو تمام تر محبت وشفقت، مبتلائے مصائب اور پوری دلکشی کے ساتھ اکٹھا آتے دیکھا تھا جو اس صلیب کے نشان میں مجتمع تھے اور ہمارے لئے یہ دردناک موت ہماری نجات کی لازوال علامت تھی۔

Marfat.com

جب میں ملحد ہوا تو میں نے صلیب کو مسترد کر دیا تھا۔ مگر ایسا کرنے پر مجھے کسی ذاتی نقصان کا احساس نہ ہوا، اس لئے کہ ہمارے اشارات و علامات کا ہم پر اس قدر تسلط ہوتا ہے کہ جب ہم انہیں کھو بیٹھتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری اپنی ذات میں سے کوئی ایسی شے گم گئی ہے جس کا نعم البدل نہ مل سکتا ہو۔ دس سال تک ملحد رہنے کے بعد میں صلیب کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، اور جب مجھے اسلام میں کاملیت مل گئی تو میں نے دیکھا کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں کہ جس سے میں دوبارہ صلیب میں یقین رکھنا شروع کر دوں۔ یہ ایک بالکل ہی متضاد اور برعکس معاملہ تھا، غالباً یہاں ان نو مسلموں کو زیادہ مشکل پیش آتی ہوگی جو براہ راست عیسائیت سے اسلام کی طرف آتے ہیں۔ قرآن حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے سے انکار پر مبنی عدم بشریت کے نظریے کے بارے میں جو تشریحات و تصریحات پیش کرتا ہے وہ ملحدانہ اور زندیقانہ مسیحی ذرائع سے اسلام میں داخل ہوئی ہیں اور غالباً پہلے پہل عیسائی بننے والوں کو ان کو روکنے میں کافی مشکل پیش آتی ہوگی۔ میں آج بے شک صلیب کے نشان سے کوئی وابستگی نہیں رکھتا اور ان آراء کو سختی کے ساتھ جھٹک دیتا ہوں خواہ وہ کسی بھی خوف سے آئیں، زیادہ تر لوگ اپنے ایمان یا کفر پر مبنی اعتقادات کے ساتھ آسانی سے یا پاگلوں کی طرح نہیں چمٹے رہتے۔ یہ کوئی اتنی آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ایسا شعور سے عاری ہونے کے سبب اور مایوسی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کرتے ہیں۔ عقیدے سے متعلق معاملات میں اگر ہم ایک دوسرے کو انکساری اور ہمدردی کے ساتھ نہیں ملتے تو بہتر ہوگا کہ یہ کام دوسروں کیلئے چھوڑ دیا جائے۔

یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو نیا مذہب اختیار کرنے پر اپنے خاندانوں کے مقدر کے بارے میں اپنے علماء کی رائے تسلیم کر لیتے ہیں۔ قرآن کئی باتوں میں اہل کتاب پر تنقید کر کے ان کی اصلاح کرتا ہے لیکن ان کی تقدیر کو واضح طور پر اللہ کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں قرآن بہت سے مسلمانوں کے برعکس یہ جانتا ہے کہ ان کے درمیان خدائے واحد کو ماننے والے موجود ہیں اور یہ انہیں تنبیہہ کرتا ہے کہ

ان کے کچھ مذہبی اصول گمراہ کن اور ضرر رساں ہیں۔ یقیناً قرآن کی رو سے کچھ یہودی اور عیسائی کفار ہیں (رد کرنے والے یا انکار کرنے والے) اور ان کے کچھ اعتقادات غلط ہیں لیکن اس بات پر زور دیا جانا چاہیے کہ قرآن اس سرزنش میں مسلسل ''من اہل الکتاب'' (اہل کتاب کے اندر، درمیان) پر زور دیتا ہے۔ اس بات کو سختی کے ساتھ رد کرنے کی ضرورت ہے یا سچائی کی مخالفت کرنے سے باز رہنا چاہیے لیکن یہ بات بالکل اس کے برعکس ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں اور اس کی بنیاد کسی شخص کے ذہنی اور ثقافتی نقطہ ہائے نظر ہوں اور وہ ایسا کرنے کی مخلصانہ کوشش کر چکا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بے شک میں اسلام کے ساتھ خلوص نیت کے ساتھ وابستہ ہوں مگر جس طرح زیادہ تر مسلمان اپنے عقائد کو پیش کرتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ میرا زاویہ نگاہ ان کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ اللہ کی دانائی کے مقابلے میں ہمارا علم کوئی وقعت نہیں رکھتا اور ہمارے مقدر کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ ہم اپنے محدود علم کے ساتھ کس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے ایک مسلمان بھائی نے ایک بار یہ احتجاج کیا تھا کہ اگر وہ میرا نقطہ نظر مان لے تو پھر تو اسے عیسائی ہو جانا چاہیے تا کہ اسے نہ نمازیں پڑھنی پڑیں نہ روزے رکھنے کی پابندی ہو۔

> ''تم اصل بات کو نظر انداز کر رہے ہو'' میں نے اسے بتایا۔ ''ایسا اس لئے ہے کہ تم چونکہ اسلام پر سچے دل سے ایمان لے آئے ہو اس لئے تمہیں تسلیم و رضا کی خو ڈالنی چاہیے۔ بصورت دیگر اپنا مذہب چھوڑتے وقت تم جس بات کو حق و سچ سمجھتے ہو تم اس کی طرف سے پیٹھ پھیر رہے ہو گے۔''

صورتحال جو بھی ہو قرآن اس بات کو تقریباً ایک جیسی تین آیات میں بالکل واضح کرتا

Marfat.com

ہے۔(۲: ۶۲، ۵: ۶۹، ۲۲: ۱۷) یہ تینوں آیات مختلف موقعوں پر نازل ہوئیں اور ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم خود بخود نیک عمل کی جزا سے محروم نہیں ہو جاتے۔ مسلم مفسرین ایک ممکنہ تصادم کو سمجھ گئے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا کہ جن یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ضرور وہ ہوں گے جو حضرت محمد ﷺ کے دور رسالت سے پہلے زندہ تھے۔ تاہم نہ قرآن اور نہ ہی مستند احادیث نبویؐ اس تشریح کو قطعی اور یقینی قرار دیتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں یہ بات نہیں ملتی کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے (۳: ۱۹، ۳: ۸۵) (یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے) لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ نزول قرآن کے وقت عربی کا لفظ ''اسلام'' ابھی قوانین اور مذہبی اصولوں کے بالتفصیل بیان کئے گئے نظام کا نام نہیں تھا۔ عربوں کے لئے اسلام کا مطلب تھا کہ مکمل اطاعت و بندگی یا تسلیم و رضا اور قرآنی سیاق و سباق کے حوالے سے یہ اللہ کے سامنے خلوص نیت کے ساتھ اور برضا و رغبت جھک جانے کے اور اس مالک و خالق کی غلامی اختیار کر لینے کے معنوں میں آتا ہے اور یہی ایک خدا کی اطاعت و بندگی کا نچوڑ ہے۔ ہم اس بات کا تعین کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کسی شخص کے عقیدہ و ایمان کی بنیاد کہاں تک اس خواہش پر ہے ان معاملات میں ہمیں اللہ کی لامحدود دانائی اور رحم و کرم کے ساتھ ارشاد باری تعالیٰ ہی کو حرف آخر سمجھنا ہوگا :

> ''یقین جانو کہ نبی ﷺ عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔'' (۲: ۶۲)

Marfat.com

جُدائی کے وقت کے خیالات

گرانٹ مشن ضلع کے مضافات میں رہتا تھا۔ یہ سان فرانسسکو کے بہت غریب سیکٹروں میں سے ایک تھا۔ یہاں اس نے ایک پرانے دومنزلہ مکان کا سب سے نچلا حصہ کرایے پر لے رکھا تھا۔ وہ اس گھر میں پچھلے دس برس سے مقیم تھا اور رینٹ کنٹرول کی مہربانی تھی کہ اب تک کرایے میں اضافہ نہیں ہوا تھا حالانکہ پڑوس میں صورتحال رفتہ رفتہ بدتر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے فلیٹ سے اور سڑک پر کھڑی رکاوٹ سے ایک بلاک دور سان فرانسسکو اسلامک سینٹر تھا جو زیادہ اچھے وقتوں میں غالباً گودام تھا۔ اس کے بغلی دروازے پر لگا ہوا ایک چھوٹا سا بورڈ اگر نظر نہ آجاتا تو یہ آج بھی غلطی سے باآسانی گودام ہی سمجھا جاتا تھا۔ گرانٹ بس سٹاپ پر جاتے ہوئے تقریباً ہرروز اس اسلامی مرکز کے پاس سے گزرتا تھا، اس لئے اس کے علم میں تھا کہ اس عمارت میں کیا ہے اور مشرق وسطیٰ اور ہندوپاک کے مرد اپنے روایتی لباس پہنے یہاں اکثر کیوں آیا کرتے تھے۔ مذاہب میں اس کیلئے بڑی دلآویزی اور کشش تھی جو اسے پہلی بار اس مرکز میں لے گئی اور پھر یہی اس کے مسلمان ہوجانے کا سبب بنی۔ جب تک وہ کسی مذہب میں داخل ہوکر اصل تجربے سے نہ گزر لیتا وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ ہمیشہ کی طرح بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا، وہ کئی بار اسلامی مرکز گیا تب جاکر کلمہ شہادت پڑھا۔ مرکز والوں نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا: ''فیصلہ کرنے سے پہلے خوب سوچ لو کیونکہ اسلام میں داخل ہوکر پھر اسے چھوڑنے کی سزا موت ہے۔''

گرانٹ کے مسلمان ہونے کے ایک ہفتے بعد میں اس سے ملا، یعنی میرے اسلام لانے کے تین ہفتے بعد، اس وقت تک وہ دوسرا سفید فام امریکی تھا جسے میں نے دیکھا تھا۔ چھ ماہ بعد اس نے اسلام چھوڑ دیا تھا، پھر ایک سال بعد واپس لوٹ آیا تھا۔ پھر اسلام چھوڑ کر محدود سی مدت کیلئے سکھ ہوگیا تھا۔ پھر بدھ مت میں چلا گیا تھا۔ اسلام لانے سے قبل بھی وہ کئی مذاہب آزما چکا تھا۔ کیتھولک مذہب، روسی دقیانوسی نظریات اور یہودیت ان میں شامل تھے۔ اب وہ

Marfat.com

ایک بار پھر برزخ میں تھا۔

''میں اتنے موزے تبدیل نہیں کرتا جتنے مذہب تبدیل کرتا ہوں'' وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ لیکن گرانٹ یہ بات ازراہ تمسخر نہیں کہتا تھا۔ یہ تو ایک کے بعد دوسری ناکامی کا اعتراف تھا جو اسے اللہ کی محبت کی پیاس بجھانے میں ہوئی تھیں۔ ''اسلام بہترین مذہب ہے مگر اس کے ماننے والے بدترین لوگ ہیں۔'' وہ ایک مشہور مسلم ادیب کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ میں اس سے کلی طور پر متفق نہ تھا لیکن میں نے بنی نوع انسان کے ساتھ کبھی زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی تھیں۔ گرانٹ کے لئے مذہبی برادری کم از کم اتنی ہی اہم تھی جتنی کسی مذہب کی آئیڈیالوجی یا نظریہ۔ اس کے ساتھ بار ہا اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر ہماری دوستی بدستور قائم رہی۔ اکثر ہم رات کا کھانا اکٹھے کھاتے، میری شادی سے پہلے اور بعد میں بھی ہمارا یہی معمول رہا۔ ہماری بات چیت زیادہ تر مذہب کے بارے میں ہوتی تھی۔ ہماری دوستی پکی تھی، اس دوران اس نے اسلام کو رد بھی کیا اور وہ مذہب کے معاملے میں کوئی حتمی فیصلہ بھی نہ کر پاتا تھا، جس سے میں اپنے آپ سے سوال کیا کرتا تھا اور اسلام سے اپنی وابستگی کو ایک تسلسل کے ساتھ بہت قریب سے پرکھا کرتا تھا۔ میرے لئے تو گرانٹ ایک روحانی رہنما بن گیا تھا، وہ مجھ سے ایسے سوالات پوچھا کرتا تھا جن کے بارے میں، میں کبھی نہیں سوچتا تھا لیکن مجھے ان کی ضرورت تھی۔ پھر بلا ارادہ میں اپنی ذات کی گہرائیوں میں، نیچے ہی نیچے سفر کرتا گیا۔ وہ میرا روحانی خضر تھا، میرا منظورِ نظر، ہوشیار، ذہین اور نکتہ سنج۔ وہ بہت سارے تضادات اور ضدین کا مجموعہ تھا جنہیں وہ بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ میں نے سوچا اس کے بغیر مجھے کیسا لگے گا، میں یہ سب کچھ اس وقت سوچ رہا تھا جب میں باہر جانے والے اس راستے کی جانب مڑا جو سیدھا اس کے گھر تک لے جاتا تھا۔

''اللہ کی غلامی حد درجہ مشکل کام ہے۔ اس کی سچی اطاعت و بندگی!'' میرا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے ساتھ متفق ہوں اس لئے کہ اطاعت خداوندی یا غلامی اور بندگی اور ہمارے درمیان بہت باریک حد فاصل پائی جاتی ہے۔

Marfat.com

''گرانٹ! ہوسکتا ہے ہم اس خالق کائنات کی نسبت تقاضا زیادہ کا کر رہے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا ہم سے صرف اس بات کا مطالبہ کرتا ہو کہ ہم کوشش کئے جائیں۔'' میں نے گرانٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

رات کی تاریکی وظلمت اضطراب و بے چینی کو لے بھاگتی ہے، یہ حساس بنا دیتی ہے۔ اس وقت رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں بستر میں تھا، میں دائیں طرف کروٹ لئے لیٹا ہوا تھا۔ جس تکیے پر میرا سر تھا اس تکیے کے نیچے میں نے اپنا ہاتھ اڑس رکھا تھا۔ اور خدائی عدل و انصاف پر ایک نکتہ چیں سوال مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ ایک بھیانک اور پراسرار احساس نے اچانک میری سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔ خیال گزرا کہ معاملہ تو کچھ مختلف تھا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا اور ذرا سی آہٹ بھی مجھے چونکا دینے کیلئے کافی تھی۔ رات کی سرسراہٹ دبے پاؤں گزر چکی تھی اور اس کی جگہ ایک سناٹے اور سکوت نے لے لی تھی۔ ایک عجیب سنسنی سی میرے وجود میں پھیل رہی تھی۔ پہلے مدھم مدھم سی۔ پھر پوری چمک دمک کے ساتھ۔ کوئی صاف اور واضح تغیر بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بخارات بن کر چھوٹے چھوٹے ذروں کی لامحدود شکل اختیار کرتا جا رہا ہوں۔ ان ذروں کو ایک غالب آ جانے والی شفقت ومحبت یکجا رکھے ہوئے ہے۔ میں نے انتظار کیا تا کہ اس کی طغیانی اتر جائے لیکن اس میں تو پہلے سے بڑھ کر شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اور بالآخر یہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں مجھے ایسا لگا جیسے یہی میرا انجام ہو۔

میں کسی ہیبت، جلال و دبدبے اور اشتیاق سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میرا پورا جسم یخ بستہ ہو گیا تھا۔ جو کسی توقع یا آس میں مقفل ہو گیا ہو مجھے اپنے پیچھے اور کندھوں پر کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے آہستہ آہستہ، ڈرتے ہوئے یہاں سے نکلنے کی کوشش میں اپنا بایاں ہاتھ تاریکی میں لہرایا، مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ تکیے پر سے سر اٹھا کر پیچھے مڑ کر دیکھ سکوں۔ طاقت کی ایک لہر کے ساتھ ہی میں شفقت ومحبت میں غرق تھا۔ لطف وکرم سے مغلوب، اس کے اندر پگھل کر تحلیل ہو رہا تھا۔ میں آزاد ہو چکا تھا، مزاحمت غائب ہو چکی تھی، مجھے اپنے اہل

Marfat.com

خانہ کا خیال آیا۔ ''مہربانی سے میری اہلیہ اور میری بچیوں کا خیال رکھیں!'' میں بڑبڑایا۔ پھر میں مکمل سکوت و خاموشی میں بدل گیا تھا۔ میں اپنے سونے کے کمرے کی کھڑکی کے باہر جھینگروں کی آواز سن سکتا تھا اور باہر سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹر کار کی خاموش آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ جو کچھ ابھی ابھی مجھے پیش آیا تھا میں نے اس کی تشریح و تصریح کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے آپ کو محفوظ اور کسی ان دیکھے پرورش کرنے والے ہاتھوں میں پایا۔ ایک آرزو پیدا ہوئی۔ پھر اپنے آپ میں ایک مایوسی کی کیفیت محسوس کی۔ آج تک مجھے وہ سوال یاد نہیں آسکا، میں جسے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں بھی اللہ سے محبت کرتا ہوں، جیف''

''گرانٹ، میں جانتا ہوں کہ تم بھی کرتے ہو۔ مگر مجھے کبھی بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو تمہارے جیسے عشق کے ساتھ اس کی تلاش و جستجو میں ہو۔''

دائیں طرف اسلامی مرکز ہمارے پیچھے رہ گیا تھا اور ہم دائیں ہاتھ مڑ کر آ گڈن سٹریٹ پر چلے گئے تھے۔ میں نے گاڑی گرانٹ کے اپارٹمنٹ کے سامنے روکی، ٹائروں کو حد بندی کے اندر موڑ دیا۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو بلا کسی شعوری کوشش کے بڑی آسانی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے ہیں۔ وہ ایک ہی سانس میں فتح کر لینے، تحکمانہ انداز اختیار کرنے، تجزیہ کرنے اور کسی بات کی تشریح کر کے اپنے جذبات کے اظہار کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے الوداعی الفاظ پر پہلے سے کوئی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو میں غالباً گرانٹ کو بتا سکتا تھا کہ میں اس بات پر کس قدر خوش تھا کہ میں اسے جانتا تھا، اس کی دوستی سے مجھے کیا کچھ حاصل ہوا تھا۔ اور اب میرے سامنے کینساس تھا۔ ایک نئی جگہ، ایک اجنبی ماحول جہاں ترقی کرنے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا، یہ تو مقدر کی بات تھی۔ لیکن میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ میں گرانٹ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ جس خواب کا ذکر میں نے پہلے باب میں کیا تھا وہ اسلام لانے کے بعد کے سارے ہنگاموں اور ایک طویل بے چینی و بے کلی اور مسلمان ہو جانے کے نتیجے میں حاصل شدہ تذبذب اور عدم یقین کے دوران

Marfat.com

میرے ساتھ ساتھ رہا اور اس نے مجھے سہارا دیا۔ میں اس خواب کی کہانی خود کو اور دوسروں کو سنایا کرتا تھا۔ میں نے اسے لکھ لیا تھا۔ تا کہ میں اسے کبھی بھی بھلا نہ سکوں تا کہ میں ہمیشہ مدد اور حمایت کے لئے اس پر بھروسہ کرسکوں۔ کبھی کبھی تو میں اس کے ہاتھوں پسپا ہوکر بلا ناغہ اس تلاوت قرآن پاک سے بھی محروم رہ جاتا تھا جسے میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی مسحور کن اور دلنواز آواز جنت سے آ رہی ہو۔ دونوں ہی اب تک میرے لئے بہت اہم ہیں لیکن دوران نماز اللہ کی محبت اور خشوع وخضوع سے اب یہ دونوں ماند پڑ جاتے ہیں۔ اور میں آج بھی اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں سے پہلے سے بھی بڑھ کر آگاہ ہوں۔ مجھے اس بات کا خوب علم ہے کہ اب اگر میں نے اللہ کو دوبارہ کھو دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے یقیناً اسے بالکل کھو دیا ہے اور میں رابعہ العدویہ کے ساتھ مل کر یہ دلیل وحجت پیش کرتا ہوں:

''اے میرے خدا! کیا تو واقعی اس دل کو آگ میں ڈال کر جلا دے گا جو اس قدر تیری محبت سے سرشار ہے؟'' اور جو جواب مجھے ملتا ہے اس میں میرے لئے تسلی وتشفی کا پیام ہوتا ہے۔

گرانٹ کے اپارٹمنٹ تک میں زینے کے راستے چل کر جا رہا تھا، وہ میرے ساتھ ساتھ تھا ہم نے ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت جب مصافحہ کیا تو میں نے اس سے مخاطب ہوکر کہا ''اپنا خیال رکھنا اور رابطہ قائم رکھنا۔'' لیکن اسی لمحے نہ جانے کس شے نے مجھے بتایا، اور میرے خیال میں گرانٹ کو بھی کہ ہم آئندہ زندگی میں نہ تو کبھی مل سکیں گے نہ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ سننے کو ملے گا۔ کئی برس تک میں اسے بلاتا رہا اور خطوط بھی لکھے۔ خلیج کے علاقے میں میرے کئی دوست رہتے تھے ان سے کہا کہ گرانٹ کو تلاش کریں اور مجھے اس کا اتہ پتہ دیں۔ مگر بے سود۔ مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

''السلام علیکم، جیف'' اس نے پورے یقین اور صدق دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' تم پر ہمیشہ اللہ کا فضل وکرم ہو۔

Marfat.com

حواشی

(۱) ابراہم آئی کے، جوڈیزم ان اسلام (نیویارک، سیا۔ ہرمن پریس ۱۹۸۰ء)

(۲) گب، ودھر اسلام، (۳۷۶۔۳۷۹) ڈبلیو منٹگمری واٹ، اسلامک ریولیشن ان دی ماڈرن ورلڈ (ایڈنبرگ: ۱۹۶۹ء)(۱۲۶۔۱۲۹)

(۳) فائرسٹون، جارنیز ان دی ہولی لینڈ۔

(۴) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلداول، ص (۱۳۷)

(۵) مے اینڈ میزگر، دی نیو آکسفورڈ اینوٹیٹڈ بائبل، متی (۲۳:۱۵)

(۶) اسد، دی میسج، جمیلہ ویسٹرن سولائزیشن کنڈیمنڈ بائی اٹ سیلف۔

(۷) بی لا کیف کی ترکیب کے لغوی معنٰی ہیں ''پوچھے بغیر کہ کیسے۔'' اس نظریے کے مطابق اگرچہ خدا کیلئے بشری پیکر کے قرآنی حوالے سچائی ظاہر کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کے لغوی معانی لئے جائیں۔ یوں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ایک مسلمان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس قسم کے بیان کی سچائی کو یہ پوچھے بغیر تسلیم کرلے کہ ایسا کیوں ہے۔ واٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے بیانات کچھ سچائیوں کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے واٹ، اسلامک ریولیشن ان دی ماڈرن ورلڈ، ص ۸۰۔۹۰

(۸) لیوز، دی جیوز آف اسلام۔

(۹) ایضاً ۲۷

(۱۰) ایضاً ۳۵

(۱۱) ایضاً ۶۲

(۱۲) ایضاً ۶۲

(۱۳) ولیم ڈبلیو بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن (ڈیفنڈرز پبلیکیشنز ۱۹۸۲ء) بیٹرس ارسکن، پیلسٹائن آف دی عربیز (ویسٹ پورٹ، سی ہاپیرین پریس ۱۹۷۶ء)، جے ایم این جفریز، پیلیسٹائن: دی ریلیٹی (ویسٹ پورٹ سی ٹی ہاپیرین پریس ۱۹۷۶) ایڈیٹر ڈبلیو سعید، دی کویشن آف پیلسٹائن (نیویارک: ٹائمز بکس، ۱۹۷۹ء) فرینک سی ایس، پیلستان: سٹل اے ڈکما (پینسلوانیا: وائٹ مور پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء) کلفرڈ اے رائٹ، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ (لندن، کے پال انٹرنیشنل، ۱۹۸۹ء)

(۱۴) جیفریز، پیلیسٹائن: دی ریلیٹی، ۶: بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن ۵۔۶

(۱۵) جیفریز، پیلیسٹائن: دی ریلیٹی، ۸

Marfat.com

(۱۶) بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن، ۷

(۱۷) بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن، ۹

(۱۸) ایضاً، ۹

(۱۹) جیفر یز، پیلیسٹائن: دی ریلیٹی، ۶۴۔۸۷

(۲۰) ایضاً ۲۳۸۔۲۴۰

(۲۱) ایضاً ۱۷۰۔۱۷۱

(۲۲) جیفر یز، پیلسٹائن: دی ریلیٹی، ۱۷۲

(۲۳) ایضاً ۶۱۳

(۲۴) ایضاً ۱۷۷

(۲۵) رائٹ، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ، ۲۔۵، ایڈورڈ ڈبلیو سعید، اے پروفائل آف دی پیلسٹینین پیپل (پیلیسٹینین ہیومن رائٹس کمپین ۱۹۸۳ء) ۳۔۴

(۲۶) جیفر یز، پیلسٹائن: دی ریلیٹی، ۱۴۲۔۱۷۵

(۲۷) رائٹ، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ، ۴

(۲۸) جیفر یز پیلسٹائن: دی ریلیٹی، ۴۲۹۔۴۵۵، ۷۰۴۔۷۰۵

(۲۹) جیفر یز، پیلسٹائن: دی ریلیٹی ۲۷۲۔۲۹۵، ۴۲۰۔۴۲۵، ۶۰۴۔۶۲۹، ۶۳۷۔۶۵۱

(۳۰) ایڈورڈ ڈبلیو سعید، اے پروفائل آف دی پیلیسٹینین پیپل ۲۔۴

(۳۱) جیفر یز، پیلسٹائن: دی ریلیٹی، ۳۲۹۔۳۳۵، ۶۶۱۔۶۶۹

(۳۲) بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن، ۱۵۔۱۶

(۳۳) رائٹ، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ، ۱۶۔۱۷

(۳۴) ایضاً ۲۰۔۲۱

(۳۵) ایضاً ۲۱

(۳۶) ایضاً ۱۸۔۱۹

(۳۷) ایڈگر اوبیلنس، دی عرب اسرائیلی وار (نیو یارک: پریجر ۱۹۴۸ء۔ ۱۹۵۷ء) ۱۷۱۔۱۷۲

(۳۸) رائٹ، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ، ۱۲۱۔۱۳۸

(۳۹) ایڈورڈ ڈبلیو سعید، اے پروفائل آف پیلیسٹینین پیپل، ۱۴

(۴۰) ایڈورڈ ڈبلیو سعید، دی کویشن آف پیلیسٹائن، ۴۷۔۴۸

(۴۱) بیکر، تھیفٹ آف اے نیشن، ۵۸۔۱۰۵، فیکٹس اینڈ فیبلز: دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ ۱۶۴۔۱۶۹

(۴۲) لیوز، دی جیوز آف اسلام، ۱۸۵۔۱۸۹

Marfat.com

(۴۳) جیفریز، پیلسٹائن: دی ریلیٹی، ۱۲۲۔۱۲۳

(۴۴) پال فنڈلے، دے رڈیر ٹو سپیک آوٹ (ایل ہل بکس، ۱۹۸۹ء)

(۴۵) ایڈورڈ سعید، دی کولیشن آف پیلسٹائن

(۴۶) امریکی حکومت کی فنڈز کے ذریعے بھیانک جارحیت کی مثالیں ممکن بنادی گئی ہیں۔اس کا ایک بھیانک مظاہرہ ستمبر۱۹۸۳ء میں لبنان میں ہوا۔بیروت میں واقع صابرہ شطیلہ مہاجر کیمپ سے پی ایل او کی واپسی کے بعد اسرائیلی فوج نے جو ان کیمپوں کو گھیرے ہوئی تھی لبنانی مسیحی فاشسٹ پارٹی کے دستے اندر بھیج دیئے تھے جنھوں نے ایک ہزار فلسطینی مردوں، عورتوں اور بچوں کا سفاکانہ قتل کیا۔اسرائیلیوں نے دیکھا کہ یہ قتل و غارت بلا مزاحمت چھتیس گھنٹے تک جاری رہی۔

Marfat.com

قبولِ اسلام کی انوکھی داستان

امریکی نومسلم پروفیسر جیفرے لینگ کی قبولِ اسلام کی کہانی

سرِ تسلیم خم ہے

جفرے لینگ

مترجم

مُصدق حسین

Marfat.com